لکھنؤ کی شاعری

از

محمد باقر شمس

مقدمہ

ڈاکٹر احسن فاروقی۔

کراچی

سلسلہ دار التصنیف رجسٹرڈ کی گیارھویں کتاب

لکھنؤ کی شاعری

اس کا اسلوب اس کے اصناف اور منتخب کلام

محمد باقر شمس

مقدمہ

ڈاکٹر احسن فاروقی

مطبوعہ

باب الاسلام پریس

ملنے کا پتہ

دار التصنیف ۳۰-سی رضویہ کالونی کراچی ۱۸/

ہمارے مطبوعات

ہمارا ادارہ صرف مولانا محمد باقر شمس کی تصنیفیں شایع کرتا ہے اور اس وقت تک جتنی کتابیں شایع ہوئیں سب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔

ناظرین ہماری کتابوں کی فہرست طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر کتاب میں دوسری کتابوں کی فہرست ہونا چاہیے مگر یہاں اسٹاک میں کتابیں ہی نہیں ہوتیں تو فہرست سے فائدہ کیا اس وقت ہمارے پاس صرف دو کتابیں موجود ہیں۔

(۱)

شعر و شاعری

اس میں مشہور شعرا کے کلام کی فنی غلطیاں بتا کے ان کی اصلاح کی گئی ہے

قیمت چھ ۶ روپے

(۲)

لکھنؤ کی تہذیب

اس میں لکھنؤ کی تہذیب کی ایک ایک چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو لکھنؤ کی تہذیب کا دلکش مرقع ہے اس پر تبصرہ میں جناب بیخود دہلوی نے لکھا ہے کہ میں نے اب تک ایسی کتاب نہیں دیکھی۔ قیمت بارہ ۱۲ روپے۔

ملنے کا پتہ

دارالتصنیف ۲۰۔ سی رضویہ سوسائٹی کراچی نمبر ۱۸

انتساب

ذوقِ سلیم کا مظہر شرافت انسانی کا جوہر تہذیب و شائستگی کا پیکر

ادب نواز۔ ادیب ساز انشا پرداز

پروفیسر مسعود حسن ادیب

کے نام

ذرہ ناچیز

شمس

مقدمہ

لکھنؤ کا مدرسہ شاعری

ڈاکٹر احسن فاروقی

ڈین آف فیکلٹی آف آرٹ بلوچستان یونیورسٹی

جناب شمس کی زیر نظر کتاب اس وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کر رہی ہے لکھنؤ کے مدرسہ شاعری کو حالی اور شبلی نے یورپ کی رومانی تحریک کے مبہم اثر سے کافی حد تک گرایا بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ دہلی کی شاعری کو صحیح شاعری مانا جانے لگا اور لکھنؤ کی شاعری کو غیر شاعری یا بناوٹی کہا جانے لگا۔ یہ میتھو آرنلڈ کی تنقید کا اثر تھا جو انیسویں صدی کے آخر تک اہم رہی مگر پہلی عالمی جنگ کے بعد سے ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری اور تنقید کو عروج ہوا اور اس کا خاص نتیجہ یہ نکلا کہ رومانی شاعری کے ذوق کو غیر پختہ ذوق کہا جانے لگا اور خاص اہمیت کلاسیکی شاعری کو دی گئی جیسے رومانیوں نے انگلستان میں ورڈسورتھ کی شاعری کو اہمیت دی تھی اور پوپ کی شاعری کی بابت یہ رائے دی تھی کہ یہ شاعری ہی نہیں ہے۔ یہ رائے دی ویسے ہی ہمارے یہاں دہلی کے مدرسہ شاعری کو اصل شاعری مانا گیا اور لکھنؤ کی شاعری کو اصول شاعری سے الگ ہٹا ہوا کہا گیا۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے پانسا پلٹ دیا اور پوپ کو سب سے زیادہ نمائندہ شاعر مانا اور تمام رومانی شاعروں کو بالکل رد کر دیا۔ معاملہ اب بھی زیر بحث ہے مگر اس کلیہ سے یہ ضرور سامنے آتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کو بھی رومانی شاعری کے برابر اہمیت دینا چاہیئے ہمارے یہاں دہلی

اور لکھنؤ کے علاقے سے بالکل الگ الگ نہیں ہوئے کیونکہ دہلی کے مدرسہ کی خصوصیات لکھنؤ کے اہم شاعر آتش میں اور لکھنؤ کے مدرسہ کی خصوصیات دہلی کے اہم شاعر ذوق میں نظر آتی ہیں مگر رومانی شاعری کی طرفداری میں یہ حد پہونچی کہ شبلی کا موازنہ انیس و دبیر وجود میں آیا جس سے میر انیس کے ایسے دہلوی اسکول والے شاعروں کو شاعر اور مرزا دبیر ایسے لکھنؤی اسکول والے شاعروں کو غیر شاعر کہنے کی رسم پڑ گئی جناب شمس کی کتاب اسی غلط رسم کے خلاف ایک جید اور عالمانہ قدم ہے۔

رومانی اور کلاسیکی شاعری کا اہم فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ اول الذکر داخلی ہوتی ہے اور آخر الذکر خارجی رنگ کو اہمیت دیتی ہے اس معنی میں لکھنؤ کی شاعری کلاسیکی ہے اور اس کے سب سے اہم نمائندہ شیخ ناسخ ہیں۔ کلاسیکی شاعری کی تمام خصوصیات ان کے یہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں پھر ان کے اثر سے لکھنؤ میں ایک گروہ شاعروں کا پیدا ہوا اور ہوتا رہا انکی بابتہ شمسی صاحب نے مفصل طور پر لکھا ہے اور ضرورت بھر اہم مثالیں دی ہیں۔ خارجیت کے ساتھ ان شاعروں میں طرز اور ترنم کی وہ خوبیاں بھی ہیں جن کو انفرادی طرز کے خلاف سماجی طرز کا لازمی حصہ قرار دیا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے شاعری محض ذاتی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ ایک معاشرہ کی جذباتی زندگی کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ زبان اور بیان کے وہ اسالیب سامنے آتے ہیں جو فرد کی زندگی کے بجائے ایک پورے معاشرہ کی زندگی کے لئے اہم ہیں۔ یہ شاعری بھی جذباتی اور مبہم نہیں رہ جاتی بلکہ واضح بیانی اور عروضی اصولوں کی صاف صاف پابندی نظر آتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اپنی تنقیدوں میں ٹکنیک کا لفظ خاص طور پر استعمال کرتا ہے اور

لکھنؤ کی شاعری خاص طور پر اہم ٹکنیکی جدتوں سے معمور ہے اور ان کی کمال کے ساتھ وضاحت شمس صاحب نے زیر نظر کتاب میں کر دی ہے۔

ایک نئی بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ لکھنؤ رومانی طرز کا بھی اکول ہے جس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بھی اہم ٹکنیکی جدتوں سے معمور ہے لہٰذا یہ کہنا کہ لکھنؤ کی شاعری رومانی نہیں غلط ہے اس کو انہوں نے دلیلوں اور مثالوں سے ثابت کیا ہے۔

یورپ کے ہر ملک میں جدیدیت کی تحریک کا اہم رجحان یہ ہے کہ وہ رومانی طرز کو چھوڑ کر کلاسیکی طرز کی طرف آتی ہے۔ ہمارے یہاں جدیدیت کی تحریک تو شروع ہو چکی ہے مگر ہمارے شاعروں کو یہ نہیں معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی روایت سے تعلق کس طرح پیدا کریں اور اس لئے جدید شاعری بے بنیاد ہی رہی جا رہی ہے شمس صاحب کی زیر نظر کتاب کی جدید دور میں سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس اہم راہ کے نشانات واضح طور پر بتاتی ہے جن پر چل کر جدید شعراء اپنا مقصد مستحکم طریقہ پر حاصل کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کتاب عام صاحبان ذوق کے لئے بصیرت افروز ہے اور ذوق ادب کے اسی توازن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اہم قدم ہے جو حالی اور شبلی نے اپنی کم علمی کی وجہ سے اور جدت کے غلط جوش میں بگاڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ کتاب دو اہم باتوں میں تمام تنقیدوں سے زیادہ کارآمد ثابت ہو گی اول یہ کہ اس کے ذریعہ ہماری اردو روایت میں جدید ترین راہوں کا پتہ لگے گا اور شاعروں کو صحیح راہ پر چلنے کی توفیق ہو گی دوسرے یہ کہ تمام قاری کے سامنے سے طرفداری کا دھواں چھٹ کر وہ صاف

فضا دکھائی دیگی جو جدید ترین شاعری کی اہم بنیاد ہو سکتی ہے اور جو متوازن ذوق ادب کی ضمانت ہے۔

اس میں بہت سی نئی باتیں بھی ہیں جو اب تک کسی کے علم میں نہ تھیں مثلاً اہل لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ کی ادبی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور ٹکسالی زبان کے معنی وغیرہ۔

مولانا کی یہ بڑی خصوصیت کہ ان کے مطالب اور تخیل، ترتیب دلنشیں تحریر شگفتہ زبان مستند اور معیاری ہوتی ہے وہ ایک منفرد مفکر اور صاحب طرز انشاپرداز ہیں علمی و ادبی حیثیت سے ان سے استفادہ کرنے والوں میں اپنا شمار کر کے فخر محسوس کرتا ہوں۔

احسن فاروقی

۳ر جنوری ۱۹۷۸ء

فہرست مضامین

معذرت

یہ کتاب جن حالات میں چھپی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں جگہ جگہ کمی اور نقائص رہ جائیں۔

مولانا علی حیدر نظم طباطبائیؒ اور نوبت رائے نظرؔ کے اشعار بہت کم ہیں۔ ہمارے کئی دوستوں نے مہیّا کرنے کا وعدہ کیا مگر وفا نہ ہوا اس کے علاوہ اغلاط کی تصحیح بھی صحیح معنوں میں نہ ہوسکی بہت باتیں کہنے کے قابل رہ گئیں اور یہ سب مجبوری سے ہوا انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہوجائیں گی۔ فقط

والسلام

محمد باقر شمس

دیباچہ

یہ کتاب مدّت سے ناتمام پڑی تھی اور میرے خیال میں چھپنے کے قابل نہ تھی کیونکہ ہر باب ناقص تھا۔ ایک دن مکرمی جناب ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب سے ذکر آیا انھوں نے کتاب دیکھنے کے لیے لے لی دوسرے دن فرمایا کہ لکھنؤ کی شاعری پر بحث مکمل ہے باقی فروعات ہیں جن کے بغیر کتاب ناقص نہیں کہی جا سکتی اس کو چھپ جانا چاہیے اس میں بہت سی نئی باتیں ہیں جو اب تک نہیں کہی گئیں ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور اس کی اشاعت پر اصرار کیا میں نے کتاب پریس میں بھیجدی جن شعراء کا کلام نہ مل سکا اس کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہو رہی ہے مثلاً سید مرزا انسؔ شاگرد ناسخؔ بحیر علی محمد عارفؔ مرزا کاظم حسین محشرؔ فرزند حسین ذاخرؔ مجاور حسین تمناؔ اولاد حسین شاعرؔ مہدی حسین ناصری حکیم اشفتہؔ۔ سراج منظر حکیم ناطق انند نرائن ملاان سب کا کلام نہ مل سکا اور یہ بہت بڑی کمی ہے۔

ایک ناہمواری اس کتاب میں اور نظر آئے گی کہ شعراء میں کسی کے حالات سرے سے ہیں ہی نہیں کسی کا ذکر دو تین سطروں میں ہے اور کسی کا صفحوں میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے

کہ ہمارا موضوع لکھنؤ کی شاعری ہے شعرائے لکھنؤ نہیں وہ معروف شعراء جن کا ذکر تذکروں میں تفصیل سے موجود ہے ان کا تعارف مختصر لفظوں میں ہے۔ جن کا حال تذکروں میں مختصر ہے یا بالکل نہیں ہے ان کے حالات جس حد تک معلوم ہوتے سب لکھ دیئے۔ ناسخ و آتش کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے جس کی اس میں گنجائش نہیں اس کو مستقل طور سے لکھنے کے لئے چھوڑ دیا۔

مرثیہ پر گفتگو بہت طولانی ہو گئی ہر عہد کے مرثیہ گویوں کا ذکر اور ان کے کلام سے مثالیں مستقل کتاب چاہتی ہے اس لئے اس کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے اسی طرح مثنوی اور دل سوختہ کا ذکر بھی رہ گیا۔ فقط

والسلام

ذرہ ناچیز

محمد باقر شمس

۲۸ جنوری ۱۹۷۸ء

مقدمہ

غزل اور اس کا موضوع

ہر صنف سخن کی کچھ لفظی و معنوی خصوصیتیں ہیں لکھنؤ کی شاعری میں بھی ہر صنف کی خصوصیتیں الگ الگ ہیں۔

لکھنؤ کی شاعری کی عام خصوصیت لیکن ایک عام بات جو تمام اصناف سخن میں مشترک ہے وہ زبان کی شستگی روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی کہیں صنائع و بدائع کہیں سادگی کہیں دونوں کا حسین امتزاج طرز ادا میں کہیں جدت مگر ہر صورت میں دل میں اتر جانے والی معنوی وضاحت ہے

جو سمجھ ہی میں نہ آئے وہ کہا جاتا نہیں — جاوید

اب تک جن لوگوں نے لکھنؤ کی شاعری پر لکھا ہے ان میں اکثر نے صرف غزل کو سامنے رکھا ہے۔ شاعری تمام اصناف پر حاوی ہے میں سب پر گفتگو کروں گا مگر غزل کو میں نے مقدم رکھا ہے۔

غزل زندہ صنف سخن ہے کیونکہ وہ زندہ ہے اور بہت دنوں تک زندہ رہے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت مختصر اور مختصرات کا مجموعہ ہے اس میں الفاظ کا استعمال اس سلیقہ سے ہوتا ہے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا ہو جاتا ہے اور ہر شعر ایک مکمل داستان بن جاتا ہے کبھی لمبے لمبے فقرے اس طرح حذف ہوتے ہیں کہ وہ سمجھے جاتے ہیں کبھی تاریخی واقعات سیاسی حالات فلسفیانہ مضامین ہمارے تجربے اور مشاہدے کے تحت الشعور میں دبے ہوئے نقوش، تمثیل و کنایہ کے پردہ پر ابھرتے ہیں اور زمانہ کی گردش دوستوں کی بے وفائی، دنیا کی ناپائیداری

توکل، قناعت اور حیات و کائنات کے بہت سے مسائل نہایت موثر طریقہ سے ادا ہو جاتے ہیں جو ہمارے حالات کا آئینہ ہمارے نفسیات کی عکاسی اور ہمارے تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں۔

غزل کی مقبولیت کے اسباب

مولانا حالی کے بقول :-
"محفل عشرت کی گرمی اور بزم معرفت کا ہنگامہ بھی اسی پر منحصر ہے"

بہت سے شعر حکیمانہ قول اور کہاوت کی طرح زبان کا جزو بن گئے ہیں جو اٹھتے بیٹھتے بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے	مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں	ناسخ
تمام عمر یونہیں ہو گئی بسر اپنی	شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا	"
صحرا کو کبھی نہ خالی رشکِ قیس سے پایا	کیا کیا جلا ہے سایہ کو ڈھونڈا جو دھوپ میں	"
خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی	گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے	آتش
سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا	کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا	"
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال	ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا	"
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا	جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا	"
کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے	سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے	"
تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی	قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے	"
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے	ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے	"
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں	تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل	رند
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے	گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے	مونس
قسمت کی نارسائی سے ٹوٹی کہاں کمند	دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گئے	شوق

کبھی ایک ہی مصرع یہ کام دے جاتا ہے ؎

اجل سر پر کھڑی ہے خواب غفلت میں زمانہ ہے	ناسخ	کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے	نسیم
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے۔	،،	اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر	وزیر
اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں	،،	لے کے نہ اٹھتے ہیں جبتک لگ نہ جائے بات	اختر
شیر قالین اور ہے شیر نیستاں اور ہے	،،	معلوم ہوگا حشر میں بیعانہ آپ کا	،،
ہے اگر وہم تو علاج نہیں	،،	اور حرم کا دیا جلا دئے جاتے	رند
کہیئے کیسا مزاج عالی ہے	،،	بات بنتی نہیں کبھی التجا کرکے۔	،،
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے	،،	مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی۔	عشقی و
نہ جانے خدا کیا کیا چاہتا ہے	،،	پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر	مجبور
یہ بزم خیر ہے لا خیر کا مقام نہیں	آتش	جب پڑے رنج بتوں سے تو خدا یاد آیا	قلق
بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے	،،	خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے	امیر
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے	،،	ملک الموت نے گھر دیکھ لیا	جاوید
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا		تلوار کاٹتی ہے سپاہی کا نام ہے	ماہر
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔	بادشاہ نصیر الدین حیدر	رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی	آل جعفر
جس سے ہوتی ہے امید اسی سے گلہ ہوتا ہے	برق	دو ہرن زخمی گئے صیاد نے اک تیر سے	رشید
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں	صبا	بعد اپنے حسن و عشق کا قصہ تمام ہے	ماہر

غزل کا اصلی موضوع

غزل کی دلکشی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کا اصل موضوع صنف نازک سے مرد کا جنسی میلان ہے اس کی صورت حسن، چال ڈھال، زیور بناؤ سنگار پر مرد کی فریفتگی اس سے ملنے کی آرزو، اس سے وصل کی تمنا۔ اس کی لذتیں۔ ہجر کی اذیتیں۔ یہ عورت سے کسی اور طرح کی محبت سے انکار کرتی ہیں۔

مرد عورت پر اسی وجہ سے فریفتہ ہے کہ وہ اس سے جنسی خواہش پوری کرنے کا مشتاق ہے حسن محض عشق کا سبب نہیں ایک حسینہ کسی کی بیٹی اور بہن بھی ہے مگر اس کا حسن و جمال اس کے باپ اور بھائی کے لیے غزل کا موضوع نہیں اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے درمیان جنسی خواہش کا دخل نہیں مگر وہی حسینہ اپنے محبوب کے لیے قیامت ہے اور غزل میں اس کی ہر چیز اور ہر ادا کے بلائے جان ہونے کی عجیب عجیب تشبیہیں اور استعارے ہیں۔ دنیا کی جتنی چیزیں انسان کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر سکتی ہیں وہ عورت کے کسی وصف ذاتی یا اضافی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

غزل کی تشبیہیں اور استعارے

زلفیں، کمند، افشاں کہکشاں، پیشانی چاند، ابرو کمان، نگاہ تیر، مژگاں نشتر، آنکھیں جادو، رخسار پھول، ہونٹ پنکھڑی، دہن غنچہ، دانت موتی، ٹھوڑی سیب، چہرہ چاند، پستان انار، انگلیاں شمع کافوری، پنڈلیاں بلوری، جسم چاندی کا، قد سرو کا، چال چکور کی۔

لباس میں:- دوپٹہ، محرم، نقاب، انگیا، کرتی، چولی ان سب کا رنگ، کھچتی انگڑائی میں ان کا مسکنا اور عاشق کی طبیعت کا کھسکنا۔

سامان آرائش میں:- کنگھی افشاں۔ سرمہ مسی۔ غازہ۔ مہندی۔ آرسی۔ آئینہ سب اس کے دل کو تہ و بالا کرنے کے سامان ہیں۔

زیور میں:- بجلیاں۔ بالیاں۔ بندے۔ طوق۔ گلوبند۔ بازوبند۔ تعویذ۔ چوڑیاں۔ پازیب خلخال اور اس کی جھنکار اس کے دل کو تڑپا دیتی ہے۔

اداؤں میں تبسم بجلی گراتا ہے انگڑائی دل کی رگیں توڑ دیتی ہے

شرم وحیا قہر ڈھاتی ہے اس کے علاوہ ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

اور ہر شیوہ جان لیوا

وہ پردہ نشین ہے باحیا ہے باعزت ہے چلمن کی آڑ سے کہیں نگاہ پڑ گئی بس دل ہاتھ سے جاتا رہا راز عشق چھپانا اس کو رسوائی سے بچانا اس کا نام زبان پر نہ آنا محبت کا تقاضا ہے۔ بہت بے چینی میں اشاروں کنایوں اور رمز کے ضمیروں' میں کچھ دل کی حالت زبان پر آجاتی ہے اس پر دل و دین نثار' اس کے دید کی تمنا' اس سے وصل کی آرزو اس کے ہجر میں آہ وزاری' اس کے انتظار میں بیقراری اس کے نہ آنے پر یہ خیال کہ وہ وعدہ فراموش ہے' ظالم ہے' سنگدل ہے' آہ وزاری کا اس پر اثر نہیں ہوتا یہاں اختر شماری ہے وہاں مانگ میں افشاں بھری جارہی ہے تڑپانے میں اس کو مزہ اور دل جلانے میں لطف آتا ہے' اس کی گلی کا چکر ہے' اس کے ہجر میں وحشت ہے صحرا نوردی ہے گریبان چاک ہے اس کے فراق میں مرمر کے جینا اور راتوں کو اٹھ اٹھ کے رونا ہے بہتا ہوا دریا بھی کبھی تھم جاتا ہے مگر دل ہے کہ کسی وقت نہیں تھمتا باغ بے اس کے ویرانہ اور بہار خزاں ہے محبت زندگی اور اس میں مبتلا رہنا حاصل زندگی ہے' واعظ وناصح کا سمجھانا گراں ہے چارہ گر کی تدبیریں ناگوار ہیں' ان پر پھبتی کستا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے ہر شخص رقیب ہے مگر سب بوالہوس خود سچا عاشق ہے اسی کو نامہ شوق لکھتا ہے پیام محبت بھیجتا ہے آدمی' کبوتر' باد صبا اس کے قاصد ہیں بے خودی طاری کرنے کیلئے' شراب ہے ساقی ہے۔

اُدھر معشوق شانہ کشی و زلف آرائی میں مشغول نہیں بلکہ حیا مانع ہے، شرم دامن پکڑے ہے گھر والوں کا خیال ہے خاندان کی عزت کا پاس ہے راز عشق کھل جانے میں رُسوائی کا ڈر ہے چپکے چپکے آنسو بہانا اور دل مسوس کے رہ جانا اس کی زندگی ہے وہ بھی اس احتیاط سے کہ گھر والے حالت میں کوئی تغیر محسوس نہ کریں۔

یہ مضامین غزل کی جان اور ایشیائی تمدن کے تقدس کا نشان ہیں ان بندشوں سے آزاد ملکوں میں تمدن کی یہ شرافت کہاں۔ گل و بلبل شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں کی محبت کس شاعری کو نصیب ہے۔

ان سب کی ایک زبان ہے ایک لہجہ جو تمام اصناف سخن سے مختلف ہے خاص طور پر حسن و عشق کے نازک جذبات عاشق کی نیازمندی عاجزی معشوق کی بے نیازی غرور حسن ناز و ادا کے لئے لہجہ بہت نرم اور لوچ دار ہوتا ہے جب شاعر ان مضامین کو مناسب زبان اور لہجہ میں ادا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو شعر حسن و عشق کی بولتی ہوئی تصویر بن جاتا ہے ؎

یوں کوئی زلف بناتا ہے سنورنے والے — جو نہ ہوتا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے
ہائے وہ زلف کو بکھرائے کسی کا کہنا — جس کو ہوتا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے

والد مرحوم

غزل پر اعتراض

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ غزل گو کے اعصاب پر عورت سوار ہے گل و بلبل، چاند سورج تارے شراب و کباب ساقی و میخانہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں وہ نیا مضمون پیدا اور حیات و کائنات کے مسائل بیان کرنے سے قاصر ہے۔

یہ اعتراض اب سے پچاس برس پہلے نہیں کئے گئے۔ مغربی شاعری سے نیم آشنا اور مشرقی شاعری سے ناآشنا یہ باتیں کہتے ہیں۔

عورت ہمیشہ سے مرد کی محبت کا محور ہے دنیا میں اس سے زیادہ دلکش مرد کے لئے کوئی چیز نہیں حیات و کائنات میں اس کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں جب تک دنیا اور یہ نظام فطرت قائم ہے اس وقت تک عورت مرد کی محبت کا مرکز رہے گی۔ اس کو جانے دیجئے کہ نظام فطرت میں اس کو کتنا دخل ہے۔ اس کی تفصیل غزل کا موضوع نہیں غزل کا تعلق اس سے ہے کہ انسان مال دولت عزت آبرو ہوش حواس سب اس کے پیچھے کھو بیٹھتا ہے فطرت اس کی طرف مائل ہے اس سے بے نیازی اسی کے لئے ممکن ہے جس کی فطرت میں بگاڑ ہے (عنین یا خنثیٰ) انبیاء بھی اس سے دامن نہ بچا سکے۔ یہ بلا ہمیشہ انسان پر مسلط رہی اس کی ہر ادا مرد کے لئے حیات و کائنات کا اہم مسئلہ اور آفاقی کلچر ہے ؎

فتنہ در سر بتاں مست خرام — ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں میر
چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی
جادو بھرا تھا سرمۂ دنبالہ دار میں — ملتے ہی آنکھ دل نہ رہا اختیار میں
راضی ہوں میں وہ جو ستم ناروا کرے — بس میں کسی کے دل نہ کسی کا خدا کرے

ہر قوم کی زبان و شاعری اس کے تمدن کی عکاس ہوتی ہے خاص طور پر غزل جو سوائے اردو فارسی کے اور کسی زبان میں نہیں اس کی ایک مخصوص فضا ہے ایک خاص آہنگ ہے اس کی تشبیہوں استعاروں کی ایک الگ دنیا ہے اس کی ایک مخصوص زبان ہے اور اس میں ایک خاص لوچ۔ لچک اور ہلکا پھلکا پن ہے معترض اس کے لطف سے محروم ہیں اس کی ٹیکنک سے ناواقف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل و دماغ پر جو عریاں شاعری چھائی ہوئی ہے اور جس تمدن کی برتری کے وہ قائل ہیں

وہاں ہر وقت اور ہر جگہ عشق آساں اور " ولے افتاد مشکلہا کا کوئی خطرہ نہیں۔ بازار، سنیما، کلب، پارک، اسکول، کالج پیانگ کر اپنے گھر پہ والدین کے علم میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اس سے پردہ اور پردہ نشین نقاب۔ چلمن۔ رازِ عشق۔ پردہ داریِ محبت۔ اشتیاقِ دید۔ شرم و حیا ہجر و فراق کے بہت سے مضمون جو ہماری غزل کی جان ہیں ان کے لئے فرضی دور از قیاس اور غیر فطری ہیں ان کے یہاں عورت کی حیثیت غالب کے جام سفال سے زیادہ نہیں ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اکبر الٰہ آبادی نے اس معاشرے کی کتنی اچھی اور سچی عکاسی کی ہے ؎

ان سے رخصت ہوا ہی اے اکبر　　وصل کے بعد تھینکیو کہہ کے

ایشیا کا معشوق اتنا سہل نہیں اس کا عاشق کے اعصاب پر سوار رہنا یہاں کے تمدن کے موافق ہے اگر کسی کو عورت سے نفرت اور اُردو شاعری سے رغبت ہے تو اور اصناف موجود ہیں۔ ایک صنفِ سخن جس کی ساری دلکشی اسی میں ہے کہ اس کا موضوع عورت ہے اس سے اس کو خارج کرنے اور فرضی غیر فطری پاک محبت داخل کرنے کی خواہش سے زیادہ بدذوقی کیا ہو سکتی ہے۔

یہ شکایت بھی صحیح نہیں کہ گل و بلبل کے علاوہ کچھ نہیں۔

گل و بلبل۔ چاند۔ سورج اور تاروں سے زیادہ حسین شراب سے زیادہ پرکیف تیر نشتر سے زیادہ چبھنے والی کوئی چیز نہیں جب تک دُنیا قائم ہے ان سے زیادہ بہتر چیزیں نہیں مل سکتیں یہ مضامین نہیں نام میں۔ اور معشوق کے وصف ذاتی یا اضافی کے استعارے ہیں ان کا

استعمال اسوقت تک موقوف نہیں ہوسکتا جب تک ان سے بہتر اور موزوں تر چیزیں وجود میں نہ آجائیں اگر یہ چیزیں پرانی ہیں تو محبوب کے چشم و ابرو غیرہ کی جگہ اور حسن بھی تو خلقت آدم سے اسوقت تک نئی ہی

اس صورت میں محبوب کے چہرہ کے لئے چاند سورج پھول تبسم اور انگڑائی کے لئے بجلی نگاہ کے لئے تیر و نشتر سے بہتر استعارہ کیا ہوسکتا ہے ان کی دلکشی کبھی ختم نہیں ہوسکتی انھیں فرسودہ کہنے والا ذوق سلیم سے محروم ہے۔

جس طرح ہر نئی چیز پرانی چیزوں سے ایجاد ہوتی ہے اسی طرح دنیائے شاعری کے ان موجودات سے شاعر نیا مضمون پیدا کرتا ہے۔

معشوق کی انگڑائی بڑی دلکش ہوتی ہے۔ وہ اس حالت میں زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے فرسودہ مضمون ہے عزیز لکھنوی کا شعر ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

انگڑائی سے حسن کے بڑھ جانے کی یہ تعبیر کہ پر لگ گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اڑا جاتا ہے نئی بات ہے اور اپنے مرکز نے تو قیامت ڈھا دی۔ جسم میں جو حسن کے مرکز ہیں انگڑائی میں حسن ان مرکزوں کی طرف مائل پرواز تھا یعنی ان میں حسن بڑھ رہا تھا اس سے پہلے کس نے یہ بات کہی؟ اسی انگڑائی کو مانی جائسی نے ایک اور طرح کہا ہے ؎

حسن قامت کی جو حد رکھی تھی رعنائی نے
اس کو وہ ہاتھ بڑھا یار تری انگڑائی نے

ہم پرانے عاشق ہیں پرانا مضمون ہے تعشق نے اسے نیا کر دیا ہے ؎

شعلۂ حسن سے تھا دود دل اپنا اول
آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

اسی کو جاوید نے ایک نئی طرح کہا ہے ؎

آج کے دن کی خبر دل کی دھڑک نے دی تھی
بچپنے میں کبھی سنتے تھے جو افسانۂ عشق

عزیز مرحوم کہتے ہیں ؎

سوزشِ عشق رہی بعد فنا بھی دل میں — حصہ عمر مرے عشق کو کافی نہ ہوا

دل نہ ہوتا جب بھی تیرا عشق ہوتا روح کو — اس گرہ نے اور اس رشتہ کو محکم کر دیا

کیا یہ نئی باتیں نہیں ہیں، جو چیز پرانی ہے وہ مضمون نہیں، نام ہیں یا استعارے ہیں اور وہ کبھی نئے نہیں ہو سکتے۔

ہر بڑا شاعر نئے مضمون پیدا کرتا ہے۔ پپیہے کی پر درد آواز کی ہزاروں تشبیہیں دی گئی ہیں مولانا صفی لکھنوی نے بالکل نئی بات کہی ہے ؎

تو بھی مایوس تمنا مرے انداز میں ہے — جب تو یہ درد پپیہے تری آواز میں ہے

عاشق مرنے کے بعد بھی سوزِ عشق میں مبتلا رہتا ہے بلکہ اس کی خاک کا ذرہ ذرہ اسی طرح گرفتہ اذیت میں رہتا ہے جس طرح زندگی میں تھا۔ والد مرحوم نے جس اہتمام سے اس مضمون کو باندھا ہے اردو میں اس کی نظیر نہیں ملتی ؎

دل تھام لیا اپنا صحرا میں بگولوں نے — اف کہہ کے جو گرد اٹھی بیٹھی ہوئی تربت کی

غزل کا یہ موضوع، یہ سب تشبیہیں اور استعارے ایران میں پیدا ہوئے، اردو میں جب شاعری شروع ہوئی تو اسی کی تقلید کی گئی اس میں اجتہاد یہ ہوا کہ فارسی میں مذکر اور مؤنث کی ضمیریں ایک ہی ہیں مگر اردو عورت آئی مردانی کی متحمل نہیں لیکن غزل میں معشوق کو رسوائی سے بچانے کے لئے مذکر ضمیروں سے ابہام پیدا کیا گیا جرأت کا شعر ہے؎

قصیدہ اور غزل میں صفا تیرا نام گر لایا — تو اے پیارے زباں پر نام میرا پھر نہ تو لانا

اس فرق کے علاوہ غزل اب تک وہی ہے جو فارسی میں ہے۔

غزل کی یہی خوبیاں اور دلفریبیاں دنیا میں ہر جگہ سے زیادہ شاعری کو اردو فارسی میں زندہ کیے ہوئے ہیں اور جب دنیا کے تمام ملکوں میں شاعری ختم ہو جائیگی جب بھی وہاں شعر بہت دنوں تک زندہ رہیگا جہاں غزل کہی جاتی ہے اس وجہ سے میں نے بھی غزل کو سب سے مقدم کہا ہے اور اب جہاں شاعری کی لفظ آئے گی وہاں مراد غزل ہو گی۔

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری پر تبصرہ

لکھنؤ کی شاعری پر جن لوگوں نے بحث کی ہے انھوں نے پہلے دہلی کی شاعری کو پیش کیا ہے کیونکہ لکھنؤ کی شاعری اس سے الگ کوئی چیز نہیں اس سے خودبخود دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا موازنہ ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنا ممکن بھی نہیں۔

اس میں عام طور پر لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں پہلے ان پر گفتگو ضروری ہے۔

مولانا امداد امام اثر نے لکھا ہے کہ

دہلی کی شاعری میں داخلیت اور لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت ہے

مولانا عبدالسلام ندوی اور دوسرے نقادوں کی رائے ہے کہ

دہلی کی شاعری میں یاس و حسرت اور لکھنؤ کی شاعری میں عیش و عشرت ہے۔ دہلی کی شاعری میں صوفیت اور لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت ہے۔ دہلی کی شاعری میں سادگی لکھنؤ کی شاعری میں تصنع ہے۔

فراق گورکھپوری کی رائے ہے کہ

دہلی کی شاعری میں امارد سے جنسی تجربے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں عورت سے۔

نیاز فتحپوری کہتے ہیں۔

دہلی کا شاعر خراب الفت ہونے کے بعد ایک دنیا اپنی علیحدہ قائم کر لیتا ہے جہاں وہ کائنات سے بے نیاز ہو کے شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے جذبات کی ایک حزیں راگنی میں گنگنایا کرتا ہے

اور لکھنؤ کا شاعر طالع ناساز کی تمام پاس افزینیاں دیکھنے کے بعد بھی کوچہ محبوب کو نہیں چھوڑتا۔

محفل یار میں غیروں سے انکا التفات دیکھ دیکھ کے جل رہا ہے مر رہا ہے لیکن ایک سرکش گدا کی طرح وہاں سے نہیں ٹلتا ایڑیاں تک کہ وہیں دم دیتا ہے۔ ذبح ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی نہیں بلکہ موت کا بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا محبوب بھی باز لف پریشان اس کے جنازے کے ساتھ ہے لکھنؤ میں تاثرات محبت کی یہ فضا پیدا ہو جاتا جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے نزع۔ جان کنی۔ واویلا بین۔ شیون۔ جنازے کے مناظر ـــــــ درد ناک تو ہے لیکن خودداری اور وقار کی بلندی نہیں رکھتا

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا رُخ وہ ہے جس کا تعلق صرف محفل طرازیوں سے ہے اور جہاں عامتہ الورود جذبات اُلفت سے بحث کی جاتی ہے اس رنگ میں لکھنؤ کا شاعر ہر چند اہل نظر کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتا لیکن ایک بوالہوس کی جس پرستیاں بھی ہمیشہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوتیں ــــــــ

لکھنؤی شاعری کا یہ رُخ ضرور قابل لحاظ ہے اور ایک رند شاہد باز کی زندگی کے بہت سے نکتے اس میں تلاش سے مل جاتے ہیں ــــــــ

کی روانی زبان کی پاکیزگی الفاظ کی شائستگی لکھنؤ کی شاعری میں اپنی جگہ خاص چیز ہے اگر کوئی اسے تکمیل کے ساتھ ادا کر سکے

محاورات، شگفتگی جو اہلِ لکھنؤ کا حصہ تھی"۔ انتقادیات حصہ دوم ص ۵۰ تا ۵۱

مولانا امداد امام اثر کی رائے صحیح نہیں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی شاعری میں داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی میر و ناسخ کی ہم طرح غزلیں دیکھیے

میر

وہ ظالم بھی تو سمجھے کہہ رکھا ہے ہم نے یاروں کو
کہ گورستان میں گاڑیں جدا ہم اہلِ ہجراں کو

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیر بیاباں کو
نکالا سر سے میرے جائے مو خارِ مغیلاں کو

جلے ہیں کب سے مژگاں آنسوؤں کی گرم جوشی سے
اس آبِ چشم کی جوشش نے آتش دی گلستاں کو

ہے ناواقف شادی اگر ہم بزم عشرت میں
وہاں زخمِ دل سمجھے جو دیکھا روئے خنداں کو

نہیں ریگِ رواں مجنوں کے دل کی بیقراری ہے
کیا ہے مضطرب ہر ذرہ رنگ بیاباں کو

ہوا ابرِ سیہ کچھ کم نہیں جو تو نہ ہو ساقی
دمِ افسردہ کر دے منجمد وحشت سے یاراں کو

ناسخ

درازی یاد دلواتی ہے اس زلفِ پریشاں کو
عزیز اس واسطے لکھتا ہوں میں شب ہائے ہجراں کو

ہزاروں صدمۂ جانکاہ میں پر میں نہیں مرتا
کہوں اب آبِ حیواں ظلمتِ شب ہائے ہجراں کو

حنا خالق نے پیدا کی جو تیرے پاؤں کی خاطر
بنایا میرے تلووں کے لیے خارِ مغیلاں کو

نہ دیکھا ساتھ جب گلشن میں اس سرو چراغاں کو
کیا سرو چراغاں نے سپرد گلستاں کو

ہم اے جراح برسوں رو چکے ہیں دو دن تو دے
نہ سی بہرِ خدا ظالم وہاں زخمِ خنداں کو

جنوں نے جگہ دی روزِ ازل ترغیبِ عریانی
گریباں صبح کو تحفتاً دیا دامن بیاباں کو

نہ کیونکر چشمِ مستِ یار خوش آئے مجھے
کہ ناسخ دوست رکھتا ہے ہر اک میخواروں کو

یاس و حسرت عیش و عشرت بھی دونوں جگہ کی شاعری میں موجود ہے۔

لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت کا خیال بھی غلط ہے بلکہ اس کا الٹا ہے دہلی کی شاعری میں سوقیت ہے لکھنؤ کی شاعری مہذب اور سنجیدہ ہے اور یہی اس کا امتیاز ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ دہلی کی شاعری میں امارد سے جنسی تجربے اور صوفیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

امرد پرستی نہ ہونے پر تو کسی کو اعتراض نہیں بلکہ بعض لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے ان میں پنڈت دتاتریہ کیفی بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ غزل لکھنؤ جا کے فطرت کے موافق بن گئی یعنی امرد کی جگہ عورت اس کا موضوع بن گئی۔ ہاں تصوف کی شکایت ہے۔

غزل اور تصوف | میرے خیال میں غزل کو تصوف سے کوئی ربط نہیں۔ ایسی ذات جو فہم و ادراک سے بلند اندازہ و قیاس سے باہر حاسے محسوس کرنے سے قاصر نہ کوئی چیز نہ کسی چیز کی طرح اس کے عشق میں بیقراری اس کے ہجر میں گریہ وزاری اس سے وصل کے لئے اضطراب کتنی غیر شاعرانہ بات ہے۔ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر نے اس کو بہت عمدہ طریقہ سے کہا ہے ؎

پردہ نشیں سمائے دل ناشناس میں ! آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں

نیاز فتحپوری نے سچ کہا ہے کہ عشق اس دنیا میں اسی گوشت و پوست کے پتلے سے ہو سکتا ہے اس کے علاوہ اگر کوئی روحانی عشق ہے تو وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں نہ غزل سے اس کا کوئی تعلق ہے"۔

خود تصوف کے مضامین ایسے خشک اور بے کیف ہیں جو غزل

کا موضوع نہیں بن سکتے۔

ہر شاعر کا کلام اس کے ذوق اور معتقدات کا آئینہ ہوتا ہے صوفی شعراء نے غزل میں اپنے مزعومات اور معتقدات اشاروں اور اصطلاحوں میں بیان کئے ہیں شاعری میں اصطلاحات کی گنجائش نہیں اس کا تعلق عام زبان سے نہیں ہوتا صوفیا اپنی بات کہہ کے دل ہی دل میں مزے لیتے ہوں گے ان کی نقالی اوروں نے بھی کی ہے جیسے ؎ غالب

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
میں ہوں خود دریا ولے کوتہ نظر کے سامنے — ظرف موج و قطرہ میرے رخ اک پردا ہو سودا
پردہ کو تعین کے در دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

غیب و شہود غزل میں بے معنی لفظیں ہیں ان اشعار کو وہی سمجھ سکتا ہے جو وحدت وجود حجاب و تعینات وغیرہ مصطلحات صوفیہ سے واقف ہو یہ نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کے مضامین ہیں۔

غزل میں مصطلحات و مفروضات شعراء کے علاوہ کسی معنی بند لفظ کی گنجائش نہیں۔

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں کیف ہے ؎

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی — کتنے ہیں بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

نہ کیوں وہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے
نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے

ان اشعار میں جمال دلفروز نگاہ ناز و شرم۔ ادائے ناز۔ آنکھوں آنکھوں میں دل کی بات کہہ دینا ایسی باتیں ہیں جن سے لطف پیدا ہوا ہے۔ یہ جنس لطیف کی دلکش خصوصیتیں ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مجاز آ خدا کے لیئے بھی یہ سب کہا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے تمام اشعار میں صنعت ایہام یا توجیہہ ہوتی ہے اور اس میں جو دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ تصوف کے عنصر سے نہیں بلکہ ایہام و توجیہہ کے اس پردے سے جس کے پیچھے سے ہمیں صنف نازک کی جھلک نظر آتی ہے۔

اسی طرح توکل صبر و قناعت رضا بالقضا توبہ و انابت بے ثباتی دنیا۔ ترک دنیا وغیرہ کے مضامین میں جب ہی لطف پیدا ہوتا ہے جب وہ غزل کی زبان میں کہے جائیں جیسے میرؔ کا یہ شعر ہے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

ایسے اشعار اساتذہ لکھنؤ کے یہاں بھی ہیں ؎

نہ کوئی اُن کے سوا اور جہاں دیکھا
وہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا

کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا
نئے لباس میں دیکھا تجھے جہاں دیکھا

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ ہے جسے اہلِ لکھنؤ عارفانہ کہتے ہیں اس میں مصنوع سے صانع کی معرفت کا مضمون ہوتا ہے یہ اہلِ لکھنؤ کا خاص موضوع ہے اور اس میں نہایت عمدہ شعر کہے گئے ہیں ؎

ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں
اِک مشت خاک کو مہِ انور بنا دیا رشک

لکھنؤ کی شاعری میں سادگی لکھنؤ کی شاعری میں سادگی نہ ہونے کا خیال بھی درست نہیں ہر بات تصنع اور تکلف ہی سے نہیں کہی جاتی کبھی سامنے کی بات برجستہ اور سادگی سے ادا ہو جاتی ہے ناسخ جو تکلف میں مشہور ہیں ان کی سادگی دیکھیے ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی — عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
بہار آتے ہی ہر سمت پھول پھولے ہیں — ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی
صحرا کو بھی نہ پایا رشک و حسد سے خالی — کیا کیا جلا ہے ساکھو جو ڈھاک بن میں لالا
آتی جاتی ہے جابجا بدلی — ساقیا جلد آ ہوا بدلی
زندگی زندہ دلی کا نام ہے — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
فراق یار میں فصلِ بہار آئی ہے — الٰہی آتشِ گل سے تمام باغ جلے
گھر مرا فرقت میں سونا ہو گیا — کنجِ مرقد کا نمونہ ہو گیا

لکھنؤ کی شاعری میں تصنع لکھنؤ کی شاعری میں تصنع کی شکایت بھی کی جاتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صنائع و بدائع کا استعمال بہت ہے یہ بات صحیح ہے مگر قابلِ مذمت نہیں اس سے زبان کو بہت فائدہ پہنچا ایہام گوئی تو پہلے ہی سے تھی اب صنائع و بدائع سے بے لطف سادگی دور ہو گئی جس کی مثال ماہر القادری کا یہ نعتیہ شعر ہے ؎

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا دُنیا ان سے عقبیٰ ان سے
دونوں جگ ہیں ان کی بدولت صلی اللہ علیہ وسلم

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا بات صرف اتنی ہی ہے اسی کو ان الفاظ میں دھرایا ہے دنیا اُن سے عقبیٰ اُن سے اسی کو دوسرے مصرعے میں یوں کہا ہے دونوں جگ ہیں ان کی بدولت شعر حسنِ معنی اور حسنِ بیان دونوں سے عاری ہے۔ میں نے اس پھیکے شعر میں یوں لطف پیدا کر دیا ہے ؎

مزرعۂ دنیا گلشن عقبیٰ دونوں شاداب ان کے قدم سے
تابش قدرت بارش رحمت صلی اللہ علیہ وسلم!

ہمارے عزیزوں میں حکیم سید علی صاحب آشفتہ بڑے باکمال شاعر تھے انھوں نے ایک رباعی کہی جس کے آخری دو مصرعے یہ تھے۔

اے مالک کائنات جلوے برسیں — اس بزم کو بزم نور کرنا ہے مجھے

والد مرحوم کو جب یہ رباعی سنائی تو فرمایا تیسرا مصرع یوں بنا دو ؎

اے ابر کرم فلک سے جلوے برسیں

اب مصرع آسمان پر پہنچ گیا یہی صنعتوں کا مقصد اور اہل لکھنؤ کا خاص ذوق ہے وہ اسے محاسن شعر یہ کہتے ہیں مگر آج کل جان بوجھ کے لوگ اس سے بچتے ہیں اگر کوئی صنعت آجاتی ہے تو کہتے ہیں اس میں کیا دھرا ہے ایک صنعت پر شعر کی بنیاد ہے یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی نہ ہوتی تو کون سی خوبی پیدا ہو جاتی اساتذہ دہلی و لکھنؤ نے ہر زمانہ میں صنعتوں سے شعر میں خوبی پیدا کی ہے مومن کا مشہور شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کہتے ہیں ؎

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا — تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

ان اشعار میں سارا لطف صنعت سے ہے

اکبر الہ آبادی کا کلام اس قدر مقبول ہے ان کے ہر شعر کی بنیاد کسی صنعت پر ہے۔ صنعتوں کے مخالفین ان کے بھونڈے استعمال سے بے مزہ ہو کے صنعتوں ہی کی مخالفت کرتے ہیں بے ڈھنگا استعمال سب کی طبیعت پر بار ہوتا ہے اسی طرح بے لطف سادگی بھی ناگوار ہوتی ہے اس وجہ سے صنعتوں یا

یا سادگی کا سرے سے مخالف ہو جانا صحیح نہیں پرہیز کے قابل وہ بات ہے جس سے لُطفِ سخن جاتا رہے خواہ بے مزہ سادگی ہو یا صناعی
نیاز صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے اس سے بھی مجھے اختلاف ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کی شاعری کے بارے میں جو کہا ہے وہی سب مومن کی شاعری کے متعلق بھی کہا ہے اگر ابتدا، میں جراءت و رنگین اور آخر میں داغ کو بھی شریک کر لیا جائے تو تہذیب سنجیدگی لُطفِ زبان و حُسنِ بیان میں لکھنؤ کی برتری کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور یہی حقیقت ہے۔
مولانا عبدالحلیم شرر نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

اب اکثر شعرار اپنے اشعار میں بازاری عورتوں کی ان اداؤں اور حرکتوں بلکہ اب کپڑوں اور ان اعضاء کا ذکر بار بار کرتے ہیں جس سے شعر مبتذل ہی نہیں فحش ہو جاتا ہے اور ملک میں چونکہ بدتہذیبی اور شہوت پرستی کو ترقی ہو رہی ہے اس لئے ہر طرف سے اس پر صدائے تحسین و مرحبا بلند ہوتی جاتی ہے۔

دہلی والے اس کا الزام زیادہ تر شعرائے لکھنؤ کو دیتے ہیں اور چونکہ یہ اعتراض کسی حد تک صحیح بھی ہے اس لئے کہ لکھنؤ کی شاعری نے ایسے بازاری مذاق کے شاعر واقعی زیادہ پیدا کئے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری دور کا بگڑا ہوا مذاق تھا جس میں لکھنؤ اور دہلی کی کوئی تخصیص نہیں سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کے

بعض شعراء میں اس مذاق کا زور و شور جب تھا اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ داغ کی معرفت اس فخر کو دہلی نے لکھنؤ سے چھین لیا اور جس حد تک داغ کی شاعری عروج پاتی جاتی ہے اسی حد تک یہ مذاق بھی روز بروز ملک میں زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔ رسالہ معیار ۱۳۲۶ھ جلد ۱

مولانا کی رائے صحیح نہیں عورتوں کی اداؤں، لباس اور اعضاء کا ذکر میر و سودا کے یہاں بھی ہے اور غزل کا موضوع ہے اس میں ابتذال اور بازاریت زبان طرزِ ادا اور لہجہ سے پیدا ہوتی ہے اگر اس کو مہذب اور سنجیدہ طریقہ سے کہا جائے تو یہ غزل کی جان ہیں (تفصیلی بحث آگے آئے گی)

اس میں بازاریت کی ابتداء جرأت و رنگین سے ہوئی اور داغ تک وہ رنگ باقی رہا اسے لکھنؤ کے سر تھوپنا درست نہیں اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے غلط طور پر کچھ شاعروں کو لکھنوی اور کچھ کو دہلوی قرار دے کے ان کے مخصوص طرز کو دہلی اور لکھنؤ کا طرز قرار دیا ہے یعنی جب وہ دہلی کی شاعری کی خصوصیت بیان کرتے ہیں تو میر و سودا درد اور مصحفی کا کلام پیش کرتے ہیں اور آگے بڑھ کے غالب کو بھی ملا لیتے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں جرأت رنگین اور انشاء کا کلام پیش کرتے ہیں اس طرح وہ میر و سودا اور درد کو دہلوی اور جرأت و رنگین و انشاء کو لکھنوی فرض کرتے ہیں۔

میر نے نوے برس کی عمر پائی آگرے میں پیدا ہوئے ابتدائی زندگی وہیں گزاری جوانی میں دہلی اور بڑھاپے میں لکھنؤ آئے ان کی عمر برابر کے تین حصوں میں منقسم

آگرے میں پیدا ہونا جوانی تک وہیں رہنا ایسی بات ہے جس سے انھیں آگرے کا تسلیم کرنا چاہیے مگر ہم ان کو دہلوی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بحیثیت شاعر کے زیر بحث آئے ہیں اور ذوق شعری ان کا دہلی میں پروان چڑھا اسی وجہ سے وہ اپنے کو دہلوی کہتے اور سب انھیں دہلوی سمجھتے ہیں۔ اسی اصول پر ہم جرات رنگین۔ انشاء اور مصحفی کو بھی دہلوی سمجھتے ہیں۔

انشاء نے لکھنؤ میں جو ہنگامے کیے وہ سب اس سے پہلے دہلی میں کر چکے تھے لکھنؤ آنے اور وہاں کی فضا سے متاثر ہونے کی وجہ سے اگر جرات و رنگین و انشاء کو لکھنوی کہا جاتا ہے تو یہی وجہ میر و سودا کو بھی لکھنوی سمجھنے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

جرات اور میر میں تو کوئی فرق ہی نہیں دونوں ایک ہی زمانہ میں لکھنؤ آئے اور ایک ہی سال دونوں کا انتقال ہوا اگر جرات کی شاعری لکھنوی ہے تو میر کی شاعری دہلوی کیوں؟

اور ستم ظریفی دیکھیے میر تیس برس سودا بارہ برس مصحفی بیالیس برس لکھنؤ میں رہے اور لکھنوی نہیں کہے جاتے اور رنگین نو برس لکھنؤ میں رہنے سے لکھنوی ہو گئے۔

اس سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ جب دہلویت کا ذکر آتا ہے تو میر و سودا درد و غالب کا کلام پیش کیا جاتا ہے یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا خاص اسلوب اور انفرادیت ہے اگر یہ دہلویت ہے تو دہلی کے ہر شاعر کا کلام ویسا ہی ہونا چاہیے کیا وجہ ہے کہ میر۔ درد۔ سودا۔ شاہ نصیر۔ ذوق غالب مومن اور داغ سب کا رنگ الگ الگ ہے دہلویت وہی ہو سکتی ہے جو سب میں

مشترک ہو یہ اشتراک اگرچہ ہے تو بعض الفاظ و محاورات تذکیر و تانیث فارسی ترکیبوں کی افراط اور بھونڈے پن میں۔

سب سے پُر لطف بات یہ ہے کہ دہلویت کے اظہار میں میر و درد کا بہترین کلام اور لکھنویت کے اظہار میں جس کا کلام پیش کیا جاتا ہے وہ اس کا بدترین کلام ہوتا ہے۔

اگر انشاء کا طریقہ خیر راسخ اور جرأت کی چوما چاٹی لکھنو کی فضا کا اثر ہے تو میر و سودا کے یہاں بھی وہی ہونا چاہیئے اور ناسخ و آتش کو تو او کھیل کھیلنا چاہیئے تھا۔

شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ گرد و پیش کے حالات ہی کا اثر نہیں ہوتا اس کی ذاتی افتاد طبیعت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔

جرأت و رنگین اور انشا کی بیہودگیاں لکھنو کی تہذیب کے بالکل خلاف ہیں اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کا رنگ کسی نے اختیار نہیں کیا بلکہ اس کو مردود قرار دیا۔

سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ آتش کا اسلوب دہلوی کہا جاتا ہے یہ خیال نہیں رہتا کہ آتش کا کلام دہلوی طرز کا تسلیم کر لینے کے بعد دہلی کا وہ مخصوص رنگ کہاں رہ گیا جو لکھنو میں نہیں پایا جاتا۔

اصل یہ ہے کہ ولی سے مصحفی تک دہلی کی شاعری کا دور تھا سارے ہندوستان میں اسی کی تقلید کی جاتی تھی۔ ناسخ سے لکھنو کی شاعری کی ابتدا ہوئی تو ہر جگہ اس کی تقلید کی گئی جو آج تک باقی ہے انھیں دونوں کا فرق لکھنو اور دہلی کی شاعری کا فرق ہے جو دونوں جگہ کی تہذیب و تمدن میں نظر آئے گا۔

تمدن کی تعریف | تمدن شہری زندگی کو کہتے ہیں جس میں لباس خوراک رہنے سہنے کے طریقے رسم و رواج علوم و فنون سب داخل ہیں اور ان سب باتوں میں دیہاتیوں کی بہ نسبت شہریوں میں زیادہ سلیقہ اور نفاست ہوتی ہے۔

تمدن پر سیاسی حالات کا بڑا اثر ہوتا ہے امن و امان خوشحالی اور

فارغ البالی کا تمدن اور ہوتا ہے قتل و غارت اور افلاس و پریشانی کا اور۔ اس لئے پہلے دونوں جگہ کے سیاسی حالات کا بیان ضروری ہے مگر وہی حالات جن سے تہذیب و تمدن کو سمجھنے میں مدد ملے اور ہم یہی کوشش کریں گے۔

دہلی کا تمدّن

اُردو شاعری کی ابتداء اورنگ زیب کے آخری عہد میں اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے بیٹوں میں تلوار چلی۔ بڑا بیٹا

بہادر شاہ اوّل محمد معظم کابل کا صوبہ دار تجربہ کار اور ہوشیار آدمی تھا اس نے ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۶ء میں حکومت پر قبضہ کر کے بہادر شاہ لقب اختیار کیا۔ بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالا مگر پانچ برس کے اندر مر گیا اور اس کے بیٹے نبرد آزما ہوئے۔

جہاندار شاہ دوسرا بیٹا معز الدین جہاندار شاہ ذوالفقار خاں کی مدد سے ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں تخت پر بیٹھا یہ ایک طوائف لال کنور (شعری لقب آرام جاں) پر فریفتہ تھا وہ بہت پست فطرت تھی ہندوستان کی ملکہ بننے کے بعد بھی اس کی بازاریت نہیں گئی رتھ میں بادشاہ کو بٹھا کے چیزیں خریدتے بازار لے جاتی تھی اس کی دو سہیلیاں ایک سبزی بیچتی تھی دوسری کی شراب کی بھٹی تھی وہ ان دونوں سے ملنے بادشاہ کو لے کے جاتی تھی ان کو بڑی بڑی جاگیریں اپنے بھائیوں کو اعلیٰ مناصب اور خطاب دلوائے تھے۔ ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے سواری کے آگے نوبت نقارا بجتا تھا امیروں کی محل سرائیں ضبط کر کے انھیں دیدی گئیں تھیں۔ حقیقت میں بادشاہ خود سفلہ مزاج تھا جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ شہر میں ایک ڈھلوان چٹان تھی جس پر بازاری لڑکے پھسل پٹی کھیلا کرتے تھے ادھر سے ان کا بھی گزر رہا۔ نہیں معلوم لال کنور نے فرمائش کی یا خود جی چاہ گیا اکبر اعظم کا یہ جانشین سواری سے اتر آیا اور چٹان کو سر کر دیا۔

اس وقت اس پیر نابالغ کی عمر پچاس سال سے بھی بارہ برس زیادہ تھی اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ اس کی تخلیہ کی صحبتوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا۔

ذوالفقار خاں ذوالفقار خاں دبنگ آدمی تھا دوسروں کو دست اندازی کی ہمت نہ ہوتی تھی وہ بادشاہ اور لال کنور کے بہت سے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تھا اور حکومت کو سنبھالے ہوئے تھا اس پر بھی چاروں طرف سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔

فرخ سیر بہادر شاہ کا لڑکا عظیم الشان بنگال کا گورنر جہاں دار شاہ کا یہ بھائی جسے قتل کر کے ذوالفقار خاں نے جہاں دار شاہ کو تخت پر بٹھایا تھا اس کے بیٹے فرخ سیر نے اندر ہی اندر تیاریاں کیں اور بارہہ کے سردار عبداللہ خاں صوبہ دار الہ آباد سے مدد چاہی پہلے تو اس نے انکار کیا مگر جب یہ ماں بیٹے اس کا دامن تھام کے روئے اور سیادت کا واسطہ دیا تو سید کا دل پگھل گیا اور حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۳ء میں بھائی کی جہاندار شاہ معہ لال کنور کے گرفتار اور چند روز کی قید کے بعد قتل ہوا۔

فرخ سیر بادشاہ اور عبداللہ خاں وزیر اعظم ہوا دربار ڈوم ڈھاڑیوں سے تو صاف ہو گیا مگر پرانے امرا جوڑ توڑ میں لگ گئے ملک کا انتظام نہ ہو سکا چاروں طرف لوٹ مار اور بدامنی اسی طرح رہی جودھ پور کا راجہ باغی ہو گیا فرخ سیر نے مختلف مقامات پر مہمیں بھیجیں سکھوں کی گوشمالی اور راجہ جودھ پور سے مصالحت ہوئی اس کی لڑکی سے فرخ سیر نے شادی کر لی جاٹوں کو بھی سزا ملی لیکن خزانہ خالی تھا۔ فوج کو تنخواہ نہیں ملتی تھی پایہ تخت میں ہنگامہ برپا تھا۔

عبداللہ خاں امراء عبداللہ خاں کا زور توڑنا چاہتے تھے فرخ سیر

شانتی کمار (گیتی آرا بیگم) یہ دیوانہ اور معاملات سلطنت سے بیگانہ تھا۔ اس پر اپنے محسن سیدوں کے قتل کا درپے ہو گیا تین دفعہ قاتلانہ حملہ کرایا ہر دفعہ وہ بچ گئے اور سازش کھل گئی جب سیدوں کے لئے کوئی چارہ نہ رہا تو اسے قید کر دیا جس میں اس نے خودکشی کر لی۔ حالانکہ سے باخبر شاعر نے تاریخ کہی

سادات دواش آنچہ باید کردند ۔ عظمت اللہ

رفیع الدرجات | ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء میں سید برادران نے رفیع الدرجات (ابن رفیع الشان ابن شاہ عالم) کو تخت پر بٹھایا۔ یہ مدقوق تھا جب مرنے کے قریب ہوا تو اس کی خواہش پر اس کے چھوٹے بھائی

شاہجہان ثانی | رفیع الدولہ کو شاہجہان ثانی کا خطاب دے کے تخت نشین کیا اس کو عیاشی کے سوا کسی چیز سے کام نہ تھا چند ماہ میں وہ بھی مر گیا۔

تخت و تاج کے لئے یہ خلفشار دہلی کے واسطے نیا نہ تھا جب ایک بادشاہ مرا تو یہی کچھ ہوا ان ہنگاموں سے بھی دہلی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہاں کی آبادی مضطرب نہیں ہوئی ہاں سفلہ مزاج فقیر شاہوں کے تخت پر بیٹھ جانے سے ڈوم ڈھاری بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر حکومت کا ساز بھی بجانے لگے۔ علماء اور اہلِ کمال بے قدر ہو گئے مگر لُٹی تھی لاکھ لیے کا پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی دہلی سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی اس وجہ سے اہلِ دہلی کے پاؤں وہاں سے نہیں اکھڑے۔

محمد شاہ | سید برادران نے ۱۱۳۲ھ میں شاہزادہ عالی گوہر کو قید سے نکال کے تخت پر بٹھایا اور محمد شاہ لقب اختیار کیا۔ یہ عیاشی اور ناچ رنگ میں اپنے پیش روؤں سے کم نہ تھے مگر اقبال ساتھ لائے تھے اتفاق سے سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک ایسا آدمی انھیں مل گیا

جس نے سید برادران کو قتل کر کے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اطمینان سے رنگ رلیاں منانے لگے۔ ساز و آہنگ کا دریا بہنے اور حسن و جمال در و دیوار سے برسنے لگا امرا اپنے اپنے صوبے چھوڑ گئے داد عیش دینے کے لیے آگئے مصاحب مرقع دہلی جو آصف جاہ کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھانے دہلی آئے تھے ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیروں کے گھروں سے لے کے بازاروں کا کونا کونا

؎ دامان باغبان و کف گلفروش تھا!

اس زمانہ میں (سنہ ۱۱۳۳ھ) ولی کا دیوان آیا جو پہلے کی بہ نسبت بہت صاف زبان میں تھا اس نے قبول عام حاصل کیا۔

سلطنت اودھ کا قیام | سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک سنہ ۱۱۳۶ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے جہاں انھوں نے اتنی مضبوط حکومت قائم کی جو مغل شاہنشاہی سے بھی قوت و طاقت میں بڑھ گئی۔

دہلی پر پہلا حملہ | مرہٹے سکھ جاٹ ہر طرف لوٹ مچائے تھے سنہ ۱۱۴۷ھ میں بالاجی بشوا ناتھ راؤ پیشوا کا لڑکا اسی ہزار فوج سے دہلی پر حملہ آور ہوا کالکا کے میلے کو لوٹ کر شہر میں داخل ہوا اور اپنی تمام خواہشیں بادشاہ سے منظور کرا کے واپس ہوا برہان الملک کو اس کی خبر ہوئی وہ ایک جرار لشکر لے کے آندھی کی طرح اڑا دو منزلہ کو سہ منزلہ اور سہ منزلہ کو چو منزلہ کرتا ساٹھ کوس کی مسافت ایک دن میں طے کر کے مرہٹوں کے سر پر پہنچ گیا ان کے حواس جاتے رہے برہان الملک کا ارادہ تھا کہ ان کو قید کر کے مع مال و متاع بادشاہ کی خدمت میں حاضر کریں امرائے دربار نے حسد سے بادشاہ کو بھڑکایا کہ شاہی حکم کے بغیر مرہٹوں پر حملہ کرنا جبکہ بادشاہ ان سے معاہدہ کر چکے تھے وقار شاہی کے خلاف ہے۔ فوراً واپسی کا حکم بھجوایا برہان الملک

نے اس حکم کو مخفی رکھا اور مرہٹوں کی اس شرط پر جان بخشی کی کہ وہ کبھی اودھ کا رُخ نہ کریں گے۔

اس کا اثر بڑا گہرا اور دور رس ہوا جب سارا ہندوستان لوٹ مار کی آگ میں جل رہا تھا اودھ میں مکمل امن تھا۔ دہلی کا اس وقتی ہلچل کے بعد پھر وہی رنگ ہو گیا، دارنگ، سدا رنگ، سب رنگ، سارنگ وغیرہ ناچنے گانے والوں کو خطاب دیئے گئے جس سے محمد شاہ رنگیلے مشہور ہوئے۔ سارنگ دیو نے سارنگی ایجاد کی۔

اہلِ دہلی کا زنانہ پن یہ رنگینی اس حد پر پہنچ گئی کہ مردوں میں زنانہ پن پیدا ہو گیا۔ آنکھوں میں کاجل۔ دانتوں میں مسی، ہاتھ پاؤں میں مہندی کان میں بالے اور کپڑوں میں گوٹا لچکا ٹانکا جانے لگا۔

انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ سادات بارہہ دہلی والوں کو نامرد و زنانہ کہتے ہیں۔ لباس میں لچکا گوٹا ٹانکنا اور ان کی صحبت میں رہنا عار سمجھتے ہیں۔ جانسٹھ و بڈھانہ ککرولی وغیرہ میں اپنی جاگیروں پر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعض امراء کی توجہ سے رسد بھی قائم ہوئی اور زیچ محمد شاہی مرتب ہوئی۔ فضلی نے روضۃ الشہدا کا اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام دہ مجلس رکھا۔

دہلی کی امرد پرستی اس زمانے میں دہلی میں امرد پرستی کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ ترکوں کا خاص ذوق تھا اس کی تاریخ مولانا شبلی کی زبانی سنیئے:

امرد پرستی کی تاریخ "ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ عرب مطلقاً امرد پرستی سے ناواقف تھے لیکن جب پہلی صدی میں فتوحات کا سیلاب خراسان

تک آیا اور اہل فوج مدت تک وطن اور اہل وعیال سے دور رہے اس کے ساتھ لڑائیوں میں سادہ رو نوجوان گرفتار ہو کے آئے اور غلام بن کر خلوت وجلوت میں ساتھ رہنے لگے تو امرد پرستی اور شاہد بازی کا عام مذاق پیدا ہوا۔

معتصم باللہ نے عرب کو فوج سے نکال کے ترک بھر دیئے تھے ـــــ ہر جگہ فوجی صیغوں میں ترک ہی نظر آتے تھے۔ یہ نوجوان سپاہی۔ حسین اور خوشرو ہوتے تھے اس لیئے ان کی چال ڈھال رفتار گفتار بات چیت ایک ایک ادا طنازی اور شوخی کے لباس میں جلوہ گر ہوتی تھی چنانچہ اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سپاہی بچے مکتب عشق کے معلّم تھے ـــــ ایاز کا نام تم نے محمود کے معشوق ہونے کی حیثیت سے سنا ہوگا ـــــ ترکوں کی معشوقی نے یہاں تک وسعت حاصل کی کہ ترک کے معنی معشوق کے ہو گئے ؏

جملہ ترکان جہاں ہندوے تو

یہ مذاق اس قدر عام ہوا کہ سلاطین و رؤسا تک علانیہ امرد پرستی کرتے تھے اور دربار میں ان کے معشوق نظر فروزی کا کام دیتے تھے شعراء سے ان معشوقوں کی تعریف و توصیف میں سر دربار اشعار لکھوائے جاتے تھے اور شعراء ممدوح کی عشق پرستی کا علانیہ ذکر کرتے تھے ـــــ جب یہ نوخط میدان میں آئے تو گھر گھر آگ

لگ گئی بڑے مقدس درویش اور ارباب حال مکتبوں میں بچوں کو گھورنے جاتے تھے ____ استاد شاگرد پیر و مرید ایسے نازک اور قابل ادب تعلقات بھی عشق پرستی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ اس حالت نے ملک اور قوم کی اخلاقی حالت پر جو اثر کیا اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مٹھی بھر تاتاریوں نے خراسان سے لے کر بغداد تک خاک اڑادی" (شعرالعجم ح ۴ ص ۱۹۰ تا ۱۹۵)

اس قتل و غارت کا نتیجہ مولانا نے یہ بیان کیا ہے:-

"تاتاریوں کے ہنگامے نے جو اسی زمانے میں شروع ہوا تمام اسلامی دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی مشرق و مغرب تک سناٹا ہو گیا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی پر ہے یہ سب کو آنکھوں سے نظر آگئی ____ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کثرت سے صوفی شعراء اس زمانے میں پیدا ہوئے کسی زمانے میں نہیں پیدا ہوئے" (شعرالعجم ح ۵ ص ۱۰)

صوفیت کی ترقی کا نتیجہ امرد پرستی کی فضا میں جو ہوا اس کی کیفیت مولانا شبلی نے یہ بیان کی ہے۔

"اس زمانے میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا صوفیہ اور اہل نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولین قرار دیتے تھے اور ارباب ذوق کے لئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ شیخ (سعدی) چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا۔ اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا۔ اس لئے اس نے سختی سے اس کی برائیاں کی ہیں۔"

سراز مغز دو از درم کن تہی ــــ چو خاطر بفرزند مردم نہی
مکن بد بفرزند مردم نگاه ــــ کہ فرزند خویشت بر آید تباہ

صوفیہ کا پردہ اس طرح کھولتے ہیں ؎

گروہے نشینند با خوش پسر ــــ کہ ما پاکبازیم و اہلِ نظر

صوفیوں کے اس دعوے کو کہ جمال سے ہم کو صنعتِ ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے اس طرح رد کرتے ہیں ؎

چرا طفلِ یک روزہ ہوشش نبرد ــــ کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد
محقق ہماں بیند اندر ابل ــــ کہ در خوبرویانِ چین و چگل

یعنی صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے۔ خوشجمال اور پری جمال کی کیا تخصیص ہے۔ ایک باریک بیں کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں جو چین و چگل کے معشوقوں میں ہیں ——— ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ جو ہمہ تن ریاکار ہے ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کرسکتا۔ شیخ (سعدی) اس راز سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اس نے نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے ؎

برون نمی رود از خانقہ یکے ہشیار ــــ کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند
محتسب در قفائے رنداں است ــــ غافل از صوفیانِ شاہد باز

اس طرح تصوف کے ساتھ امرد پرستی بھی پھیلتی رہی یہاں تک کہ ھو

حکومت قائم ہوئی انھوں نے شعراء کو مدحِ اہلِ بیت میں قصیدے اور مصائب میں مرثیے کہنے کی ہدایت کی علماء نے حدیث و تفسیر میں کتابیں لکھیں۔ علومِ اہلِ بیت کی اشاعت ہوئی۔ پیری مریدی کا خاتمہ ہوا۔ خانقاہیں ویران صوفیہ منتشر اور امرد پرستی ختم ہوئی۔ مگر مغبچہ۔ ترسابچہ۔ ترک بچہ۔ سبزہ خط وغیرہ مضامین یادگار چھوڑ گئے۔

ترکی ذوق ترکستان میں یہ ذوق ترقی کرتا رہا۔ ہندوستان میں انھیں ترکوں کے ساتھ آیا علاء الدین خلجی اور ملک کافور قطب الدین مبارک شاہ اور نومسلم لڑکے خسرو گجراتی کا عشق تاریخ میں موجود ہے۔ بابر نے تزک میں اپنے اُستاد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ امرد پرست تھا۔ سمرقند کے بارے میں لکھتا ہے کہ سر بازار امارد کے ہاتھ میں ہاتھ دیے لوگ گھومتے تھے کوئی بغیر امرد کے نظر نہیں آتا تھا۔

اپنی پہلی بیوی سے ناچاقی کا سبب یہ لکھا ہے کہ میں اس زمانہ میں ایک لڑکے بابری پہ دیوانہ تھا۔ جہانگیر نے تزک میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں سرمد اور ابھے رام کا عشق مشہور ہوا۔

جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کے ایک لڑکے کو بھی اسی کا شکار بتایا ہے اور بہادر شاہ کے زمانہ میں اس کی عمومیت پر ایک گاف مردا نامہ لکھا ہے۔ (میں نے گاف لکھا ہے انھوں نے صاف لکھا ہے) یہ گاف مردا نامہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجیے ؎

پان کھا کر گاف مردا کھیلیے	باغ جا کر گاف مردا کھیلیے
بادشاہی ہے بہادر شاہ کی	بن بنا کر گاف مردا کھیلیے
وقت آں آمد کہ در ہر جھاڑ	گھس گھسا کر گاف مردا کھیلیے
عطر مل کے جو تنڑوں کے بیچ میں	مل ملا کر گاف مردا کھیلیے

عطر ملنا بتاتا ہے کہ طبقہ امراء میں یہ ذوق پھیل گیا تھا۔

دہلی کے مشہور امرد پرست | محمد شاہ کے زمانے میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ جس طرح دوسرے شہروں میں امراء رنڈی بازی میں شہرت رکھتے تھے اسی طرح دہلی کے امراء امرد پرستی میں مشہور تھے خان اعظم کے متعلق صاحب مرقع دہلی لکھتے ہیں:-

"بمقتضائے رنگینی مزاج اور بہار راگ ہندوستان کے مطربوں میں ممدوح ہیں۔ ان کی طبیعت امادر پسند ہے سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار ہیں اپنی جاگیروں کی ساری آمدنی ان پر صرف کرتے ہیں۔ جہاں کسی امرد رنگین کی خبر پاتے ہیں اس کی حسب خواہ رعایت کر کے رفاقت کی کمند میں پھانس لاتے ہیں۔ اس گروہ کی ایک جماعت ان کی حسن سعی سے مناسب مناصب پر فائز ہو کر ان کی انیس بساط ہے اور ایک جماعت مراعات خانگی پر اکتفا کر کے محفل نشاط کو رنگین بنائے ہوئے ہے سواری کے ساتھ بڑی شان و شکوہ سے گھوڑوں پر سوار ہو کے چلتے ہیں۔ غرض جہاں کوئی سبزہ رنگ نظر آتا ہے خان اعظم سے منسوب ہے اور ہر نوخط اس عظیم الشان سے وابستہ ہے۔" ص ۲۷

ایک دوسرے رئیس مرزا منو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مرزا منو جو امیرزادہائے زمانہ میں ہیں اس فن کی جادوکاری میں یگانہ ہیں۔ امیرزادے اس فن کی گھاتیں ان سے سیکھتے ہیں اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں وہ اس محفل کے صدر ہیں ان کی بزم غلماں صورت کے منتظم ہیں ان کا

گھر شداد کی بہشت اور پریزادوں کا آشیانہ ہے جو نوخط رنگین اس محفل سے ربط نہیں رکھتا وہ فرد باطل ہے اور جو نمکین اس مجمع میں شریک نہیں بے اعتبار ہے ان کی محفل شاہدوں کا دارالعیار ہے۔ صـ ۲۷

میرن صاحب کا حال سنئے :۔

"میرن صاحب وزیر الممالک کے یہاں معزز و محترم ہیں تلاش مردم حسین میں طرفہ مہارت رکھتے ہیں۔ ہر روز ایک نیا لڑکا پھانس لاتے ہیں۔ صـ ۳۳

دہلی میں امارد کے اڈے | رنڈیوں کے اڈوں کی طرح دہلی میں لڑکوں کے اڈے تھے قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں :۔

شام کے وقت حسین و خوبرو اور ملیح لڑکے ان (تاباںؔ) کے مکان پر جمع ہوتے تھے ان کو زیورات سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا تھا اس کے بعد امرائے قزلباش کے طلب کرنے پر محافوں میں بٹھا کے اغلام کرانے کے لئے مہمان جاتے تھے صـ ۱۶۷

دہلی کے مشہور امرد | دوسرے شہروں کی رنڈیوں کی طرح دہلی کے امارد مشہور تھے۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے :۔

اللہ بندے سبزہ آغاز متناسب الاعضا لوگوں کا منظور نظر اور مقصود خاطر ہے۔ رجب امرد سیہ فام ہے :۔

ہنگامہ پیرامیاں ہنگا کسی کے یہاں نہیں جاتا۔ اس کا شیفتہ خود اس کے گھر جاتا ہے سلطانہ سبزہ رنگ دس بارہ سال کا سن ایک عالم کو مفتون اور ایک

خلقت کو مجنون بنائے ہوئے ہے۔ سرس روپ کے
ماتھے کی چمک نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ بڑی مشکل
سے ہاتھ آتا ہے (مرقع دہلی ص۴۱)

حد یہ ہے کہ علماء، فقہاء اور صوفیا بھی اس میں مبتلا تھے۔ مرزا
مظہر جانجاناں کے متعلق صاحب تذکرۂ علماء ہند لکھتے ہیں۔

"دانشمند متبحر جامع فضائل صوری و معنوی بود اکتساب
علوم از علمائے وقت نمودہ و حدیث از حاجی محمد افضل
سیالکوٹی اخذ کردہ و شرف ارادت و خلافت از حضرت
سید محمد نور بدایونی مرید و خلیفہ شیخ سیف الدین مرید و (۱)
.... مرید و خلیفہ شیخ محمد معصوم عروۃ الوثقیٰ
مرید و خلیفہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی یافتہ ص۲۲۷

یہ فضائل صوری و معنوی سے آراستہ اور خرقۂ خلافت سے پیراستہ بزرگ
امرد پرست تھے۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم میں لکھا ہے:۔

"حسن پرستی سے دلبستگی تمام رکھتے تھے اور عشق حقیقی و
مجازی سے کام انعام اللہ خاں صاحب یقین اور فقیہ صاحب
درد مند ان کے شاگرد ان رشید سے کہاتے ہیں اور
میر عبد الحی تاباں علیٰ ہذا القیاس اسی طرح گنے جاتے ہیں ص۲۱۶۔

انعام اللہ خاں یقین کے حالات میں بھی اس کا ذکر ہے۔

منظور نظر مرزائے مذکور ص۳۶

محمد فقیہ درد مند کے حالات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

"نظر کردۂ مرزا مظہر جانجاناں

عبدالحیٔ تاباں کے ذکر میں بھی ان کے اس تعلق کا ذکر ہے۔
"ان کا عشق مظہر کے دل میں گھر کر گیا تھا"
تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں مرزا صاحب کے متعلق لکھا ہے۔
"میر عبدالحیٔ تاباں کی محبت میں زار و نزار تھا۔
شیفتہ نے مرزا صاحب کے اس ذوق کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔
"برعنا جوانان نظرش بود۔
تذکرۂ گلزار ابراہیم میں عبدالحیٔ تاباں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے:۔

"تاباں تخلص میر عبدالحیٔ نام۔ شاہجہاں آبادی نہایت عزیز و خوبصورت اور صاحب جمال تھا۔ دلی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان سے دین و دل نثار کرتے تھے اور پرے کے پرے عاشق جانباز کے یاد میں اس لب جاں بخش مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دلربائی پر خود بدولت بھی دل کھو بیٹھے تھے ـــــــ اس لیلیٰ صفتی پر مانند مجنوں ہمیشہ سرگرم فریاد و آہ رہتے تھے یعنی سلیمان نامی ایک لڑکے کو چاہتے تھے اور اس کی محبت میں باوجود وصل کے آٹھ پہر کراہتے تھے"۔

مرزا سودا کو بھی ان کے عاشقوں کی فہرست میں لکھا ہے۔
"بلکہ مرزا رفیع سودا بنا بر یک نظر توجہ اکثر اشعار کو ان کے اصلاح کرتے تھے۔
میر احمد یار بھی اسی طرح کے معشوقوں میں تھے۔ تذکرہ میر حسن میں ان کے متعلق یہ لکھا ہے:۔

"جوانے بود باکمال وجاہت کہ یوسف ثانی تواں گفت و ران زمان عالم عالم فریفتہ رخ نیکو و شیفتہ زلف از بود در وقت احمد شاہ ہنگامہ حسن او گرم بود ایں ہمہ شعرائے متاخریں مانند پروانہ دل خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند و نیز با ایشاں صحبت می داشت ــــ میر ضیا سلمہ نظر الفت داشتند چنانچہ تا حال ہر وقت کہ یاد او می کنند می گریند۔

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ان کا ذکر انھیں اوصاف کے ساتھ ہے

"احمد یار جوانے نہایت زیبا شاگرد میر تقی میر و محبوب میر ضیا در زمان احمد شاہ جمیع شعرائے تعلقے بوے داشتہ اند"۔

میر حسن کے تذکرے میں ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر ہے۔

"جعفر علی خاں ذکی":۔ سوائی رام راجہ بود بر و تعشق داشت"

محمد افضل افضل "بر کدام ہندو بچہ گوپال نامی بود کہ عاشق شد"

نور اللہ:۔ "بر یک فرنگی بچہ تعشق بہم رسانیدہ"

میر رضا علی رضا:۔ بر شخصے دہب علی عاشق است

محمد عظیم عظیم:۔ بر سادہ عذاراں شیدا"

میر ہنگا:۔ بر شخصے تعشق داشت۔

صلاح الدین پاکباز:۔ "بر سوہنا و کھن کہ قوال بچہ بود نظر الفتے می داشت"

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ایسے بہت سے پاکبازوں کا ذکر موجود ہے۔

مہتاب رائے زنتوا:۔ "بر منوں (جوہری بچہ) نامی عاشق شدہ"

محمد چاند درخشاں:۔ "بر زعفران نامی عاشق شدہ"۔

مصحفی نے اپنے تذکرے میں فدوی کے متعلق لکھا ہے:۔

"قدم در راہ امرد پرستی گزاشت چند جا خانہ جنگی ہم کردہ
بکو دکانِ حسین تعشق درزیدہ"

"میر تقی میر نے ذکرِ میر میں ابدالی کے حملہ سے دہلی کی تباہی پر تاسف کے ساتھ اس پر بھی افسوس کیا ہے کہ بازاروں میں وہ حسین لڑکے اب دکھائی نہیں دیتے اس کے معنی یہ ہیں کہ دہلی میں اس طرح کے لڑکے بازاروں میں عام طور پر گھوما کرتے تھے۔ چوک سعد اللہ خاں اس کا بڑا اڈہ تھا۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے کہ:۔

رقص امارد خوش رو سے قیامت آباد ہے اطراف و
اکناف نو خط لڑکوں سے بھرے پڑے ہیں

شاعر کہتا ہے لڑکے جہاں آباد کے اک شہر بپا کرتے ہیں ناز کو آجاتے ہیں بغل میں اشارہ کیا جہاں

میر کو طفلانِ تہ[1] بازاری ... دیکھیو شاید وہیں وہ گلفروش
گر بکھرے فلک آگے انھوں کے تو عجب ہے ... پھرتے ہیں پڑے دلی کے لونڈے جو پری سے
لڑکے دلی کے ترے ہاتھ میں کب آئے میر ... پیچھے اک ایک کے سو سو کی لگے ڈاگ پھرے

میر غفر غینی کی وہ مشہور گفتگو جس میں انھوں نے شعراء پر تنقید کی ہے اس میں انشاء کو یہی طعنہ دیا ہے۔

"آگے تیغی زاد (پری زاد) تھے ہم بھی گھوغنے (گھومنے)
جاتے تھے اب شائع (شاعر) بن گئے ہیں (دریائے لطافت)

---

[1] تہ بازار۔ بازار میں تجارت کے لیے بیٹھنے والے۔ اسی سے تہ بازاری ہے
یعنی وہ محصول جو تہ بازاروں سے وصول کیا جائے۔

اخلاقی لپستی کی حد یہ ہے کہ انشاء کو طعنہ تو دے رہے ہیں لیکن اپنی دلبستگی کا کس بلند آواز سے اظہار ہے اور طرہ یہ کہ ابھی کچھ ناقل خود میاں انشاء

ملّا دو پیازہ | احمد شاہ کے دور میں ملّا عبدالمومن دہلوی جو ملّا دو پیازہ کے نام سے مشہور ہیں جیّد عالم تھے اور بہت ظریف الطبع تھے انھوں نے ایک فرہنگ لکھ کے اسوقت کی سیاسی اقتصادی تمدنی اور معاشرتی حالات کی تاریخ مرتب کر دی ہے چند لفظیں ملاحظہ کیجئے :۔

البادشاہ	کاہی زبان	الوزیر ۔	ہمہ تن آہ بیچارگاں
النواب ۔	مجموعہ تغافل	الامیرزادہ ۔	کون دہندہ وبوس
الغلام ۔	مشتاق طعام	الامرد ۔	رہنمائے شہوت
النیزدو ۔	نوکر ماہیانہ ناشخص	البیوقوف ۔	کرسی دیانت داہد

الامیرزادہ کے جو معنی لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں دہلی کے امیرزادوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کی تائید میر تقی میرؔ کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے   میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

مولانا شبلی نے سچ کہا ہے کہ "جب کوئی عیب سوسائٹی میں عام ہو جاتا ہے تو وہ عیب نہیں رہتا" اس زمانے میں امرد پرستی اتنی عام ہو گئی تھی کہ اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شعراء بڑی بیباکی سے اس کا اظہار کرتے تھے ؎

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا ؛ جہاں جاویں وہاں ایک آدھ کو ہم تاک رکھتے ہیں

ہر ایک سبزہ ہے ہندوستاں کا معشوق   بجا ہے نام جو بالم رکھا ہے کھیروں کا

جو لونڈا نام سن امرد پرستی کا چڑھے چونکے / میں اس کو بیچ دے باتوں میں جا لگتا ہوں جو لاسا ہے ״

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بہلا / چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا ״

دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے / کام عشاق کا تمام کیا — پیام

دل لیکے لونڈے دلّی کے کب کا پچا گئے / اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو — میر

کیا لڑکے دلّی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ / دل لیتے ہیں یوں کہ ہرگز نہیں ہوتی آہٹ ״

کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر / اطفال شہر لائے ہیں آفت جہان پر ״

کیا میر تو روتا ہے پامالی دل ہی پر / ان لونڈوں نے تو دلّی سب سر پہ اٹھا لی ہے ״

شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے / ظلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر ״

تھے زمانے میں جن کے خرچے روپے / ٹھانسا کرتے تھے ان کو آنوں پر ״

فراق گورکھپوری نے سچ کہا ہے:-

"دہلی میں عشق کو صرف تنہائی ملتی ہے اور زیادہ تر امرد پرستانہ جذبات کے تجربے"۔ رسالہ نگار، ریاض ۶۳

بے حیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک رنڈی اُدھیگم بیجامہ نہیں پہنتی تھی نچلے حصہ پر نقش و نگار بنا کے برہنگی کی کراہت کم کرتی تھی اس کو قبول عام حاصل تھا اور ہر محفل میں اسی کی جگہ تھی۔ اس فضا میں کوئی بات سنجیدہ اور مہذب کس طرح رہ سکتی تھی۔ اس دور کا کلام اس وقت کے معیار تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔

ان لوگوں نے اپنے آخری زمانے میں اصلاح زبان کی طرف توجہ کی بہت سی ناگوار لفظیں۔ ستی۔ سیتی سین ترک کردیں الفاظ کی صحت ضروری قرار دی جیسے تسبی سے تسبیح۔ صحی سے صحیح اس پر بھی بقول مصنف شعراالہند۔ "ان کی زبان مبتذل اور مکروہ الفاظ کا مجموعہ ہے"۔

دہلی پر دوسرا حملہ | دہلی میں اس جنگ و آہنگ کے دور (۱۱۵۲ھ ۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوا محمد شاہ نے دو لاکھ فوج سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ تین دن تک دلی میں قتل عام رہا ستر کروڑ کا سامان اور تخت طاؤس لے کے واپس ہوا شہر اس طرح برباد ہوا کہ مدتوں آباد ہونے کی امید نہ رہی ٹیک چند بہار جس نے اپنی آنکھوں سے دہلی کو لٹتے دیکھا تھا بیان کرتا ہے۔

"دریں ایام کہ در نہایت کیفیت و لطافت ہر کوچہ چوں لف
بنفشہ بویان دل آویز و ہر محلہ اش برنگ لفس بلبلاں شور انگیز
معمور گردیدہ از بوقلمونی ہائے تقدیر ایں گونہ چشم زخمے رسیدہ
اگر بمانند زلف بتاں عمر طویلے باید کہ دار العشق بحالت اصلی آید"

اسی ہنگامے میں اودھ کے صوبیدار برہان الملک نے دہلی میں انتقال کیا اور ان کے داماد مرزا مقیم صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ ملا۔

دہلی پر تیسرا حملہ | اس حملہ سے دہلی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی ہر طرف بدامنی اور غارتگری کا دور دورہ تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء میں حملہ کیا مرزا مقیم صفدر جنگ شہزادہ احمد کولے کے مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ سرہند کے مقام پر معرکہ کارزار گرم ہوا سترہ دن کی سخت جنگ کے بعد ابدالی کو شکست دی۔ شہزادہ احمد کامیاب واپس ہوا پانی پت کرنال میں محمد شاہ کے مرنے کی خبر ملی صفدر جنگ نے بانس کی کھپچیوں کا تاج بنا کے موتیوں کی جھالر لگائی اور شہزادہ احمد کے سر پہ رکھ کر ان کی شاہی کا اعلان کیا احمد شاہ نے ان کو وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا اور دہلی روانہ ہوئے۔

غازی الدین خاں | اب امراء اور صفدر جنگ میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کی نظریں بھی ان سے پھر گئیں اور وہ

اپنے صوبہ پر واپس چلے آئے۔ غازی الدین خاں نے میدان صاف کے بادشاہ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی انھوں نے پھر صفدر جنگ کو بلوایا مگر وہ بیماری کی وجہ سے نہ جا سکے۔ غازی الدین خاں نے ناکارے اور بے دست و پا بادشاہ کو قید کر کے آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔

عالمگیر ثانی ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھا کے سیاہ و سفید مالک بن گیا اسی سال صفدر جنگ کا انتقال ہوا اور شجاع الدولہ جانشین ہوئے۔

غازی الدین خاں بادشاہ کو لے کے پنجاب گیا اور ابدالی کے صوبیدار موسیٰ خاں کی ناکتخدا بہن سے نکاح کیا اور اس کی ماں سے زبردستی تیس لاکھ روپے وصول کر کے پنجاب کی صوبیداری ادینہ بیگ کو دے کے واپس ہوا۔

دہلی پر چوتھا حملہ ابدالی کو خبر ہوئی تو وہ ہندوستان آیا اور دہلی کو دو مہینے تک لوٹتا رہا اس طرح کہ:۔

"شہر را آتش نمودہ خانہا سوختند ـــــ بقتل و غارت پرداختند دروازہا شکستند اکثرے را سوختند و سر بریدند عالمے را بخون و خاک کشیدند تا سہ شبانہ روز دست ستم بر نہ داشتند از خوردنی و پوشیدنی ہیچ نگذاشتند سقفہا شگافتند دیوارہا شکستند جگرہا سوختند وحشت سیر تاں بردر و بام اکابران بے سیرتی تمام شیخان شہر را بحال خراب بزرگان محتاج دم آب گوشہ نشینان بے جا شدند اعیان ہمہ گدا شدند وضیع و شریف عریان کدخدایان بے خانما اکثر بہ بلا گرفتار سوائے کوچہ و بازار ...... ہفت ہشت روز ایں ہنگامہ گرم بود من کہ فقیر بودم فقیر تر شدم عالم از بے اسبابی و تہیدستی ابتر شد (ذکر میر)

ابدالی نے محمد شاہ کی بیٹی سے شادی کی غازی الدین خاں کو وزارت سے معزول کر کے روہیلہ سردار نجیب اللہ خاں کو وزیر اعظم بنا کے واپس ہوا اس کے جاتے ہی غازی الدین خاں نے مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر چڑھائی کی نجیب الدولہ بھاگ کے اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ شاہزادہ عالی گوہر بنگال کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے مرہٹوں کی خوشامد سے اپنی شاہی برقرار رکھی اب پھر غازی الدین نے مرہٹوں کو لے کے پنجاب کو لوٹا اور وہاں مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا اسی طرح ہندوستان کے اکثر صوبے مرہٹوں کے قبضے میں آ گئے۔

دہلی پر پانچواں حملہ | روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں نے ساری لیڈر داد احمد شاہ کو لکھی اور اسے ہندوستان کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی اس نے حملہ کیا غازی الدین خاں سمجھا کہ عالمگیر ثانی نے مرہٹوں کے خلاف ابدالی کو بلایا ہے اس نے بادشاہ کو قتل کر کے لاش جنگل میں پھینک دی اور خود روپوش ہو گیا۔ اور ابدالی سے پانی پت کے میدان میں وہ تاریخی مقابلہ ہوا جس میں مرہٹوں کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا بے شمار مرہٹے مارے گئے۔

ابدالی دہلی کا تخت خالی چھوڑ کے واپس ہوا اب دہلی سکھوں، مرہٹوں، روہیلوں۔ جاٹوں اور پنڈاریوں کی لوٹ مار کا مرکز بن گئی یہ لوگ سمجھتے تھے کہ دلی والوں کے گھر دولت سے بھرے ہیں ان پر اتنی سختیاں کیں کہ آسمان کانپ گیا۔ مرہٹوں نے دیوان عام کی سونے کی چھت اکھاڑ لی۔

شاہ عالم | بادشاہ کے قتل کی خبر سن کے اس کے بیٹے عالی گوہر نے ۲۳ دسمبر ۱۷۵۹ء ۱۱۷۳ھ میں اپنی شاہی کا اعلان اور شاہ عالم لقب اختیار کیا ہے۔ اس وقت وہ بہار کے ایک موضع کھٹولی میں خیمہ زن تھا۔

بکسر کی جنگ | انگریزوں کا اقتدار بنگال میں قائم ہو چکا تھا بہار میں

پٹنہ تک ان کا قبضہ تھا۔ میر قاسم کو وہ بنگال سے نکال چکے تھے وہ شجاع الدولہ کے پاس مدد مانگنے آئے تھے۔

شاہ عالم نے پٹنہ سے انگریزوں کو نکال کے اس پر قبضہ کر لیا مگر انگریزی فوجوں نے آ کے ان کو شکست دے دی۔ شجاع الدولہ میر قاسم کو لے کے شاہ عالم کے پاس پہنچے اور بکسر کے مقام پر ۱۱۷۸ھ ۱۷۶۴ء میں معرکہ ہوا جس میں شکست کھائی۔ شاہ عالم انگریزوں کے کیمپ میں چلے گئے اور ان سے معاہدہ کر کے بنگال و بہار اڑیسہ کی دیوانی اور بنارس و غازی پور تک ایک تہائی حکومت کی سند ان کو دے دی اور خود الہ آباد میں آ کے مقیم ہو گئے۔

شجاع الدولہ مرہٹوں کو لے کے پھر انگریزوں کے مقابلہ پر آئے جس میں صلح ہوئی انگریزوں نے ان کا ملک چھوڑ دیا اور انھوں نے فیض آباد میں قیام کر کے اپنے کو ایسا مضبوط کیا کہ جو امن و امان اور خوشحالی یہاں تھی وہ ہندوستان میں کہیں نہ تھی۔

دہلی سے پنجاب تک مرہٹے چھائے اور لوٹ مار مچائے تھے۔ ہر طرف سے لوگ فیض آباد کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے اور شجاع الدولہ انھیں آباد کرنے کا فخر اور مسرت محسوس کر رہے تھے۔

نجف خاں | ۱۷۷۱ء میں نجف خاں ایک ایرانی امیر بادشاہ کا وزیر اعظم ہوا۔ اس نے حالات کی درستی کی بہت کوشش کی بادشاہ کو دہلی لایا اہل دہلی جو اس وقت تک بے بادشاہ کے ہر قوم کی لوٹ مار کا نشانہ بنے ہوئے تھے ان کی جان میں جان آ گئی۔

نجف خاں نے جاٹوں سکھوں اور روہیلوں کو زیر کیا اور مرہٹوں

اور انگریزوں سے تعلقات بڑھائے شہر میں امن قائم ہوا لیکن ۱۱۹۶ھ میں وہ آپ ہی مرگیا۔

پیشوا اور سندھیا | اب پیشوا وزیر اعظم اور سندھیا نائب وزیر بنا یا دشاہ کے خرچ کے لئے پینسٹھ ہزار ماہوار مقرر کر دیا وہ مرہٹوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔

دہلی پر چھٹا حملہ | روہیلوں کو مرہٹوں کا یہ اقتدار کب گوارا ہو سکتا تھا غلام قادر خاں نے دہلی پر حملہ کیا شاہی فوج مرہٹوں سے ناراض تھی وہ روہیلوں کے ساتھ ہو گئی اور قلعہ پہ قبضہ ہو گیا غلام قادر نے چاہا کہ متھرا پر فوج کشی کر کے مرہٹوں کی طاقت کا خاتمہ کر دے سیتل داس خزانچی نے خزانہ خالی بتایا غلام قادر نے شاہ عالم پر سختی کی کہ روپیہ قبولیں مگر وہاں روپیہ کہاں تھا پہلے اس نے قید کیا پھر لاتوں گھونسوں سے مارا جب کسی طرح نہ قبولے تو سینے پر چڑھ کے آنکھیں نکال لیں بیگموں کو طمانچے مار مار کے لہولہان کر دیا۔ شہزادوں اور امیروں کو الٹا کر کے ٹنگوا دیا اور پشتوں کی گڑی ہوئی دولت قبولوا کے تہ خانے اور چھتیں کھدوا کے نکال لی۔

دہلی پر ساتواں حملہ | شاہ عالم نے انگریزوں مرہٹوں اور آصف الدولہ کو امداد کے لئے لکھا آصف الدولہ نے ایک فوج اور کچھ رقم بھیجی ادھر سے سندھیا فوج لے کے آیا غلام قادر خاں بھاگ گیا مگر گرفتار ہوا پہلے اس کو گدھے پر سوار کر کے ایک ایک کوڑی بھیک منگوائی اس کے بعد زبان کٹوائی پھر آنکھیں نکالیں پھر ناک کان کٹوائے آخر میں ہاتھ پاؤں کٹوا کے لوتھڑا بادشاہ کے پاس بھیجا مگر وہ راستے ہی میں مرگیا لاش دہلی پہنچی جو گھورے پر پھنکوا دی گئی۔

ان ہنگاموں میں دہلی بار بار لٹتی رہی اور اہل دہلی پر وہاں کی زمین تنگ ہو گئی پوتڑوں کے رئیس روٹیوں کو محتاج ہو گئے انشاء کا بیان ہے کہ دہلی

میں کم تر لوگوں کو نان شبینہ میسر ہوتی ہے۔ مثل مشہور تھی۔

شاہ عالم ثانی نہ چولھے پہ توا نہ گھڑے میں پانی

ادھر لکھنؤ میں تین برس رہا تھا اہل کمال سر اور آنکھوں پر بٹھائے جا رہے تھے لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ ہر طرح کے صاحبان فن وہاں چلے آئے اور

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ؎ اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا

اس دور میں میر۔ سودا۔ سوز۔ درد اور اثر ایسے اساتذہ پیدا ہوئے ان کا کلام اس وقت کے حالات کی تصویر ان کی پریشانی خوف و ہراس اور مردہ دلی کی تفسیر ہے ؎

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے　　ان کو اس روزگار میں دیکھا　　میر
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا　　؍؍
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا　　بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا　　درد
وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا　　یعنی کبھو تو اپنے بھی دل داغ تھا　　؍؍
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے　　؍؍
جہاں کو فتنے سے خالی کبھی نہیں پایا　　ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوئے　　؍؍

عاشقانہ مضامین بھی نہایت گھٹیا درجے کے مفلس عاشق و معشوق کی تصویر ہیں ؎

یار آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی　　آزماتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی　　سوز
جو کرتا ہوں فریاد میں اس کے آگے　　تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے　　تاباں
ابھی پست ہو جاگا لاتوں کے مارے　　ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے　　؍؍

ابتذال کی حد ملاحظہ کیجیے ؎

سرسبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا　　آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا　　سوز
دعا دی تو کہنے لگا دور رہو !　　سنی میں نے دعا تیری دعا کی　　؍؍

کہا میں نے کہ کچھ خاطر میں ہو گا — تمہارے ساتھ جو میں نے وفا کی سوگند
تو کہتا ہے کہ بس بس چونچ کر بند — وفا لایا ہے دت تیری وفا کی ،،

سندھیا سندھیا نے بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لئے نو لاکھ سالانہ شاہی مصارف کے لئے معین کر دیے اور فی الجملہ دہلی میں امن قائم ہوا۔

بادشاہ نابینا انتظام سلطنت کے قابل کبھی نہ تھے ہاں شاعر تھے اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے لکھنؤ کے بعض امرا سیاسی وجوہ سے دہلی چلے گئے تھے اور شعر و سخن کی محفل جمائے ہوئے تھے ان میں شجاع الدولہ کے بیٹے امین الدولہ ناصر جنگ عرف مرزا مینڈو کے مشاعروں کی بڑی دھوم تھی۔ بڑا اہتمام ہوتا تھا ختم مشاعرہ پر دعوت عام ہوتی تھی ان مشاعروں میں بڑی رسا کشی ہوتی تھی ایک طرف انشاء اللہ خاں انشا برکت اللہ مشتاق تھے دوسری طرف حکیم قدرت اللہ قاسم حکیم ثناء اللہ فراق مرزا عظیم اکثر تلواریں کھنچ جاتی تھیں اور نواب بیچ میں پڑ کر صلح کراتے تھے۔ بادشاہ سلامت بھی اپنی غزل بھیجتے تھے ان کے درباری شاعر انشا، جرأت، رنگین تھے جن کی شاعری خوب چمکی ان کے یہاں حزن و یاس نامرادی اور ناکامی نہیں کیونکہ دہلی کے حالات بدل چکے تھے چھچھورے اور بازاری قسم کے مضامین نظم کئے جاتے تھے ؎

ادا جان لیتی ہے جانی تمہاری — غضب ڈھا رہی ہے جوانی تمہاری
یار آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
اس ڈھب سے کیا کیجئے ملاقات کہیں اور — دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور ،،
دیکے بوسہ مجھے چتون میں بتاتا ہے وہ شوخ — ایسا پایا ہے بھلا تو نے مزہ اور کہیں ،،

یاد آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ — پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائیگا

یاد جب آتا ہے یہ کہنا تو اڑ جاتی ہے نیند — اپنی ہٹ تو رکھ چکے لو اب تو ہٹ کر سوئیے

تنگ چلا میں جو شب وصل تو ہٹ کر بولے — جھانکتا روزن در سے نہ ہو ہے ہے کوئی

دو تین دن تو ہو چکے اب پھر چلو وہیں — فیروز شہ کی لاٹ کے اس جو کھنڈر پہ ہیں

امرد پرستی کے مضامین جو ہر دور میں رہے ہیں وہ ان بیہودہ گوئیوں کے علاوہ ہیں ۱۲۰۳ھ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد یہ شعرا بھی لکھنؤ روانہ ہونے لگے

دہلی پر آٹھواں حملہ

چودہ برس تک شاہ عالم اسی عالم میں رہے ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک فوج لے کے آیا اور مرہٹوں کو نکال کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار بادشاہ کا وظیفہ مقرر کر دیا اب "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" رہ گئی۔ شہر میں مکمل امن قائم ہوا۔ چہل پہل پیدا ہوئی۔ مگر شعراء سب لکھنؤ چلے آئے دہلی میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں رہ گیا۔

لکھنؤ میں سعادت علی خاں حکمراں تھے میر تقی میر۔ مصحفی۔ انشاء جرأت رنگین زندہ تھے آتش فیض آباد میں تھے اور کمسن تھے۔

دہلی میں ذوق تیرہ برس کے، غالب پانچ برس کے اور مومن تین سال کے تھے۔

لکھنؤ میں ناسخ کا ڈنکا بج رہا تھا مولانا عبدالقادر رامپوری اس زمانے میں لکھنؤ آئے تھے وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں۔

"شیخ امام بخش ناسخ کو ان دنوں اس میں دن دونی شہرت حاصل تھی ص ۱۶۰"

انھوں نے زبان و شاعری میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جس سے اس میں سنجیدگی اور حسن پیدا ہو گیا اور سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔

مصحفی ایسے کہنہ مشق استاد نے ان کی تقلید کی۔ غالب کا بیان ہے کہ میری شاعری کی ابتدا تھی جب ناسخ کا دیوان دہلی پہنچا جس طرح دلی کے دیوان کی دھوم مچ گئی تھی اسی طرح لوگ ناسخ کے کلام پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا (جلوۂ خضر) ناسخ کے اتباع سے ذوق۔ غالب اور مومن کے کلام میں شائستگی پیدا ہوئی مگر کچھ بھونڈا پن باقی رہا جس کا خود غالب نے اعتراف کیا کہ "میرے کلام میں جو محاورے غیر فصیح ہیں وہ دہلی کی زبان کا اثر ہیں" شاعری میں بھی ایسی باتیں باقی رہ گئیں جنھیں ذوق سلیم برداشت نہیں کر سکتا مومن کا یہ شعر زبان اور مفہوم دونوں کے لیے ڈھکے چھپے کی اچھی مثال ہے ؂

سن کے میری مرگ بولے مر گیا اچھا ہوا ؎ کیا برا لگتا تھا جس دم سامنے آجائے تھا

معشوق کو رقیب نے سیم بر کہا تو اس نے پستان کھول کے دکھا دیے اس پر عاشق صادق نے اس کی قباحت سمجھائی۔

غیر کو سینہ کہے سے سیم بر دکھلا دیا ؎ تم نے کیا کچھ کس کو اپنی بات پر کھلا دیا

عاشق کی بے غیرتی اور پست فطرتی کی حد دیکھیے۔ ؂

ہے شب وصل غیر بھی کاٹی ؎ اب مجھے آزمائے گا کب تک

ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے ؎ غالب

بد مذاقی کا شاہکار ہے ؂

بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

لطف زبان اور حسن معنی کا نادر نمونہ ہے

گر نفس جادہ سر منزل تقوی نہ ہوا

اس میں تقوی راضی کا قافیہ اور بد ذوقی کی ایسی مثال ہے جس کا جواب اردو شاعری میں نہیں ہے۔

دہلی پر نواں حملہ | دہلی میں بہادر شاہ ظفر لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر کا دور تھا اور ناسخ و آتش کے شاگردوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لکھنؤ میں انتزاع سلطنت ہوا اس کے بعد ہندوستان میں غدر ہوا رہی سہی دہلی پھر لٹی ہزاروں بے گناہ جس طرح مارے گئے اس کا ایک دن کا نظارہ لارڈ رابرٹس بیان کرتا ہے۔

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو شہر حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سنائی نہ دیتی تھی کوئی زندہ آدمی نظر نہ آیا ہر طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا جن میں بعض حالت نزع اور جانکنی میں مبتلا تھے ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ آہستہ بات کرتے تھے کہ ہماری آواز سے مُردے چونک پڑیں۔ اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مردوں کی لاشوں کو کتے کھا رہے ہیں۔ دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جو ان کے گوشت کو نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے کچھ اڑ کر تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھتے ہیں ہم کو بڑی عبرت ہوئی اور ہمارا دل رنجور ہوتا جاتا تھا ہیبت سے مُردے ایسے پڑے تھے کہ گویا زندہ ہیں بعض مُردوں کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرف اشارہ کر رہے ہیں غرض ان مُردوں کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی جیسے ہم کو انھیں دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر

بدکتے اور بہنہناتے تھے مُردوں کی لاشیں پڑی تڑپتی تھیں ان کے تنفس سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو اٹھ رہی تھی۔"

ایک اور انگریز لکھتا ہے۔

" دہلی کے باشندے اگرچہ سب نہیں مگر آدھے باشندے بے قصور شہر کے گرد و نواح دیہات اور جنگلوں میں پڑے ہوئے بلک رہے ہیں۔ ۱۹۵۷ء مرتبہ میاں محمد شفیع ص ۲۱۷ تا ۲۱۸

ہندوستانیوں کا خون اس طرح بہانے کے بعد جب انگریزوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا تو شہر کی آرائش کی طرف متوجہ ہوئے محلہ کے محلے اور بازار کے بازار ڈھانے لگے اس سے بچے کھچے لوگوں کا ٹھکانا بھی نہیں رہا۔ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں دہلی کی اس تباہی کا نقشہ جابجا کھینچا ہے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

یہاں شہر ڈھے رہا ہے بڑے بڑے بازار خاص بازار' اُردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ دوکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا برسات بھر مینہ برسا اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔"

" مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں۔ صحاف اور نقاش کہاں ہے"

ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو دہلی کی تباہی کی داستان یوں لکھی ہے۔

صاحب! کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔

اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں جس میں تم نے تحصیل علم کیا، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے، مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اناث میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جوانیں ہیں کسبیاں ہیں امرائے اسلام میں اموات گنو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ سو روپے روز کا پنشن دار۔ سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ۔ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان۔ بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا بیمار پڑا نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی احبا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں ٹکے کی آمدنی نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے، ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایہ کی املاک واگزاشت ہوکر پھر قرق ہوگئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔

شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔

ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے علمار اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے ان کو بھی سچ جانو اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر۔ آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔

یکشنبہ ۱۶؍فروری ۱۸۶۲ء

عافیت کا طالب غالب

رئیس احمد جعفری نے بہادر شاہ اور ان کا عہد ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، اس میں غدر کے بعد کے حالات یہ لکھے ہیں:۔

دہلی غدر کے بعد | صدہا عورتوں نے بدکاری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اول کو برقعہ اوڑھ کر مسافروں کی سراؤں کے گرد قطاروں کی قطاریں مسافروں کے بلانے کے انتظار میں بیٹھی یا کھڑی رہتی ہیں اور اس طرح دو چار پیسے صبح کو کما لاتی ہیں بہت سی عورتوں نے اپنا سر منڈوا ڈالا اگر کوئی شخص کبھی ایک خمیری روٹی یا ایک مٹھی چنے کوڑیاں تقسیم کرتا تو صدہا مسلمان عورتیں جمع ہو جاتیں جن میں سے بعض صورتوں سے نجیب زادیاں معلوم ہوتیں جو خود بھی صدہا روپیوں کی خیرات کرتی تھیں اب کوڑیاں مانگتی ہیں۔ جن کے آگے دو دو چار چار مامائیں کام کرتی تھیں اب خود ماماگیری کے قابل نہ رہیں۔ بعض بڑی عورتیں جن کی حسانیت پر فرنگیوں کو بھی رشک آتا تھا۔ اپنی خوش نصیبی سے بعض انگریزوں کے گھر

بیٹھ گئیں دلی میں پہلے بہت کم خانگیوں کے گھر تھے اشراف کبھی اپنے محلّوں میں آباد نہیں ہونے دیتے یا پھر جب شہر آباد ہوا ہے تو ہر محلہ میں ایسے دو چار گھر ضرور تھے۔

منشی ذکاءاللہ کی زبانی | بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی احمدی بیگم کی داستان سنئے۔ احمدی بیگم کے شوہر مرزا منجھو جو غدر میں کام آئے بڑے دبدبے کے آدمی تھے ان کی سرکار بجی ہوئی تھی۔ بیسیوں آدمی ان کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے دروازے پر نالکی پالکی موجود تھی۔ جب مرزا مارے گئے اور شہر کی حالت بگڑی تو بڑی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑنے ....کا ارادہ کیا پیٹیوں میں زیور بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کا مال تھا شہر کی کیفیت لمحہ بہ لحمہ ردّی ہو رہی تھی عین شب برات کے روز یہ سب شہزادیاں کھڑی ہوئیں احمدی بیگم کی ضعیفی میرا بچپن تھا انھوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ آخری دنوں میں وہ باہر نکلنے کے قابل نہ رہیں اور بہت تکلیفیں اٹھا کر یہ شہزادی دنیا سے اس طرح رخصت ہوئی کہ کفن تک میسّر نہ ہوا ــــــ فالج نے بالکل بے کار کر دیا تھا چل پھر نہ سکتی تھیں اور کئی دموں کا گزارہ اس ایک دم کی محنت پر تھا۔ میری (منشی ذکاءاللہ) بارہ تیرہ برس کی عمر ہوگی کہ میری والدہ مرحومہ نے احمدی بیگم کا پتہ دے کر مجھے ایک روپیہ دیا کہ دے آؤ ــــــ میں گیا۔ شہزادی کے گھر میں مٹی کے ٹوٹے برتن تھے اور سردی کے موسم میں بادشاہ کی اولاد بچی

اور شکر ٹی بیٹھی تھی۔ احمدی بیگم اس روپے کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئیں اور جو دعائیں ان کے منہ سے نکلیں اس کا اظہار مشکل ہے۔ اس وقت ہنستا ہوا گیا اور ہنستا ہوا آیا۔ مگر آج جب اس جھلنگا چارپائی کا خیال آتا ہے تو تڑپ جاتا ہوں۔

شہزادیاں کسبیاں بن گئیں | وہ شہزادیاں جو جاہ و جلال کی زندگی بسر کر رہی تھیں طوائف اور کسبیاں بن گئیں۔

شہزادی نکاح باورچی سے | متواتر فاقے رنگ دکھاتے ہیں کہ ربیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے ——— منشی ذکاء اللہ اس شادی کا ذکر طنز و تعریض کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

بہادر شاہ کی بیٹی ربیعہ نے اپنا نکاح حسینی باورچی سے اس لئے پڑھایا کہ روز تردیگی[1] کھانے میں آئے گی۔ فاطمہ سلطان جیسی باپ کے سر پہ تاج شاہی رکھا جاتا تھا مشنریوں کے زنانہ اسکول میں وظیفہ دار بن کے معلمی کا پیشہ سیکھا ص ۹۸۴ تا ۹۸۶

میں نے دہلی کی تباہی کی داستان ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کی ہے کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دہلی کی صرف رونق اور دولت ہی نہیں لٹی بلکہ اخلاق بھی تباہ ہو گیا۔ ان حالات میں تہذیب و تمدن اور سیرت و کردار زبان اور خیالات میں بلندی کہاں سے آتی۔

---

[1] تردیگی غلط ہے تہ دیگی ہونا چاہیئے۔

لکھنؤ کے تمدن کا پس منظر

یہ بتایا جا چکا ہے کہ شاعری تمدن کا آئنہ ہے اور تمدن نام ہے طرز زندگی میں نفاست و شائستگی کا جس کی انسانی فطرت دلدادہ ہے وہ ہر نفیس اور شائستہ بات کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔

ایران کا تمدن معاشرت کی اسی نفاست سے ایران کی تہذیب ساری دنیا پر فائق ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس نے اس سے کچھ نہ سیکھا ہو عربوں نے ایران کو فتح کیا مگر اس کی تہذیب کے آگے سر جھکا دیا۔

ہندوستان میں جن مسلمانوں نے حکومت کی وہ افغانستان و ترکستان کے مغل اور پٹھان تھے ایرانی کوئی نہ تھا مگر شان و شوکت رعب و داب تہذیب و شائستگی نفاست و پاکیزگی میں ایران کی نقل کرتے تھے یہاں تک کہ درباری آئین اور سرکاری زبان فارسی تھی فارسی ادب ان کا قومی ادب تھا فارسی شاعری ان کی شاعری تھی گلستاں بوستاں شاہنامہ سکندر نامہ یوسف زلیخا ان کی درسی کتابیں تھیں فارسی خط ان کا خط تھا ایرانی کھانے ان کے دسترخوان کی لذت تھے اور مغلوں کے زمانہ میں تو ایرانی ہی طبیب و شاعر منجم و فلاسفر فاتح ملک مدبر سلطنت حکومت کی شان اور ملک کا استحکام تھے جو عالم طبیب شاعر سپاہی خطاط ایران سے آیا ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اعلیٰ عہدہ و منصب پر فائز ہو گیا۔ ایران ولایت اور ایرانی ولائتی کہا جاتا تھا جس میں عظمت و برتری کا مفہوم مضمر تھا۔

ہمارا سفر ایران ۱۹۵۲ء میں عراق کے راستہ سے میں ایران گیا بغداد سے ایک ایرانی ہمارے ہم سفر ہوئے اتفاق سے ہم اور وہ بس میں ایک سیٹ پر

بیٹھے کھڑکی کی طرف وہ تھے۔ جب وہ کسی ضرورت سے جاتے تو پہلے اپنے جوتے اُتار کے ہاتھ میں لیتے پھر میرے زانوں کو نانگھتے اسی طرح آتے وقت وہ زحمت اُٹھاتے میں نے کہا بھی کہ اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے مگر انھوں نے گوارا نہیں کیا۔ جب میں نے ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ آقائے علی نقی فلسفی کے بھائی ہیں اور میرے متعلق انھیں ایک پاکستانی مسافر ہونے کا علم تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کے ساتھ ان کا یہ مہذب برتاؤ انسانیت کا احترام تھا۔

خانقین | ہمارا سفر جاری رہا غروب آفتاب کے وقت ہم عراق کی سرحدی چوکی خانقین پہنچے وہاں آمد و رفت کو دخول و خروج سُنا وہاں سے تین چار کوس پر

منذر خسروی | ایران کی سرحدی چوکی منذر خسروی میں صدور و خروج سننے میں آیا اور ایرانیوں کی پاکیزگی ذوق کا اندازہ ہوا صدور و ورود بھی عربی لفظ ہیں اور دخول خروج میں ذم کا پہلو بھی عربوں کے محل استعمال کے موافق ہے مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوا۔

گل زمین ایران | اب ایران میں ہمارا سفر شروع ہوا رات ہو چکی تھی اس وجہ سے منذر خسروی سے صبح تک کی مسافت کا علم نہیں صبح کو جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ نہروں آبشاروں درختوں پھولوں اور سبزے کی فراوانی تھی چوراہوں پر ایک دائرہ میں سبزہ درخت پھول اور حوض نظر آیا۔

اہل ایران کی نفاست پسندی | حوض پر ایک تختی پہ لکھا تھا "نظافت را مراعات دارید" اور ہم نے کسی کو حوض پر منھ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے نہیں دیکھا پانی الگ لے جا کے منھ ہاتھ دھوتے ہیں۔ اس سے جہاں ملک نہروں آبشاروں درختوں اور پھولوں سے بہشت نظر آیا وہاں اس کے باشندوں کی طبعی نفاست کا اندازہ بھی ہوا کہ انھوں نے طہارت کو کافی نہیں سمجھا نظافت کو

ضروری سمجھا جس کی فطرت میں نفاست ہوتی ہے اس کے اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے زبان و خیالات میں بھی نفاست ہوتی ہے اور کسی چیز میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جیسے کہیں ہم بھونڈا پن کہیں ابتذال کہیں چھچھورا پن کہیں بے سلیقگی کہیں بازاریت کہتے ہیں ایرانیوں کی ہر بات نفاست میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے تمدن کو ساری دنیا سے ممتاز کیا ہے اس میں فطرت نے بھی ان کا ساتھ دیا ہے۔

ہر گھر میں قدرتی نہر کی ایک پتلی سی شاخ گزرتی ہے جس سے ہر وقت سرد شیریں صاف اور تازہ پانی ملتا ہے۔

گھر پھولوں سے بھرے ہیں دیواروں پر بیلیں چڑھی ہیں خانہ باغ، پائیں باغ انہیں کی زبان کی لفظیں ہیں جو ان کے تمدن کا آئینہ ہیں راستے اور گلیاں پھولوں اور درختوں سے گلزار ہیں رنگ اور پھول ان پر برس رہا ہے قالین پر بیل بوٹے دروازوں پر پھول پتیاں اینٹوں پر گل بوٹے مکان کی جالیوں میں پھول زمین پر گل کاری (ٹائل) در و دیوار پر نقش و نگار صنادید عجم کی یادگار ہے ان کی زبان میں رنگینی ہے ان کی شاعری میں رنگ اور پھول سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آنکھ نرگس، چہرہ گلاب، جسم یاسمین، دہن غنچہ، لب برگ گل، ہنسی خندۂ گل، قد سرو، زلف سنبل ہے۔ یہ استعارے ایران سے تمام دنیا میں پھیلے۔

مہندی گلاب اور نرگس ایران کی خاص چیزیں ہیں۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔

"ہندوستان کے قدیم ہندو لٹریچر میں عورت کے سولہ سنگھار میں مہندی نہیں یہ ہندوستان کی چیز نہیں ہے مسلمانوں کے ساتھ آئی ہے۔

فارسی شاعری میں اس سے جتنے مضمون پیدا کیے گئے ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں نرگس اور گلاب وہاں کا خاص پھول ہے نرگس کو کہیں اور کی آب و ہوا راس نہیں آئی اس لیے اس نے ایران سے باہر قدم نہیں نکالا گلاب ہر جگہ پہنچا مگر ایران میں اس کا جس جس طرح استعمال ہوا کہیں نہ ہو سکا وہاں اسے گل کہتے ہیں یہ تمام پھولوں کا سرتاج ہے اس کا رنگ آنکھوں میں کھب جاتا ہے اس کی خوشبو مشامہ کو معطر دل میں سرور آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ بلبل مست ہو کے چہکنے لگتی ہے اور اس کے قریب بیٹھ کے اس کی مستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رات رات بھر بولتی ہے۔

گلے کے ہار میں اس کا پیوند ہار کو بھاری بھرکم بنا دیتا ہے گلدان میں دوسرے پھولوں کے ساتھ رعایا میں بادشاہ معلوم ہوتا ہے شاعری میں تشبیہ و استعارہ ہے اس کا عرق کھانوں کو معطر کرتا ہے محفلوں کو بساتا ہے مریضوں کی دوا ہے زبان میں اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے سیکڑوں مرکبات ہیں تنہا گل کے کئی معنی ہیں۔ گلابی کے کئی مفہوم ہیں ہر اچھی چیز اس سے تعبیر کی جاتی ہے اچھی صورت گل رو، گل رخسار، گل عذار، گل چہرہ، خوبصورت جسم گل اندام، گلبدن، اچھا لباس گل پیرہن، اچھی بات گل فشانی، گل پاشی، گل ریزی، اچھی آواز گلبانگ۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے سابقہ لاحقہ سے اتنے مرکبات بنے ہوں۔

لاحقے: گلاب، گل آفتاب، گلابی، گل بو، گل بازی، گل برگ، گل بن، گل بیگانہ، گلبانگ، گل پاپوش، گل پاش، گل پوش، گل پیادہ، گل تر، گل تراش، گل تسبیح، گل چیں، گلچین، گل زرد، گلدام، گل دام، گلدار، گل دوز، گل رعنا، گل رنگ، گل زمین، گلزار، گلستان، گل شمع، گل شکر، گلشن، گل صبح، گلفام، گلقند، گلکار، گل کدہ، گلگوں، گلگونہ، گل میخ، گل مہتاب، گلنار، گل دشمن، گلی۔ گلِ چشم۔ گلِ کفش۔ گلِ خودرو۔ گلِ رستہ۔ گلِ نورستہ۔ گلدان۔ گلِ شب افروز۔

سابقے | برگِ گل، تبسمِ گل، خندۂ گل، عرقِ گل، غنچۂ گل، دامنِ گل، زرِ گل، بوئے گل، نکہتِ گل، شمیمِ گل، فصلِ، موسمِ گل، سبدِ گل، قبائے گل، جامۂ گل، رنگِ گل، روغنِ گل، ساغرِ گل۔

محاورے | گل گفت، گل دیگر شگفت، گل گشت، گل در آب کردن، گل دادن، گلگل شگفت، گل خوردن۔

اب معلوم ہوا کہ وہ دنیا کو گلشن ایجاد کیوں کہتے ہیں۔

رنگ اور ایران | یہ عالم رنگ کا ہے ہر اچھی چیز رنگین ہے، رنگین نوا، رنگین سخن، رنگین زبان، رنگین بیان، رنگین شعر، رنگین ادا، بہت سے محاورے ہیں۔ رنگ بر روے آوردن، رنگ بختن، رنگ زدن، رنگ بستن، رنگ شکستن، رنگ برآب ریختن، رنگ گرفتن، رنگ گذاشتن، رنگ نہادن، رنگ ماندن، رنگ چسپیدن، رنگ مالیدن، رنگ پوشیدن، رنگ خندیدن، رنگ برخاستن، رنگ گسیختن، رنگ گرداندن، رنگ جستن، رنگ، رنگ بردن وغیرہ غرض رنگ و بو کا ایک سیلاب ہے اور دنیائے رنگ دلربا سی بے نظیر ہے اس طوفان رنگ و بو میں پلنے والے اپنی شاعرانہ طبیعت سے روزانہ نئی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

خراسان میں ایک لڑکا دو گلدستے ہاتھ میں لئے بیچ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ہم گل دہم گلدستہ، گلدستہ کے لئے ہم نے یہ فقرہ نہیں سنا تھا۔

اہل ایران کی ایجادیں | دنیا میں ہزاروں چیزوں کے وہ موجد ہیں اور اس دور ترقی میں بھی ان کی بہت سی ایجادوں پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا جام شراب تخت و تاج دربار اور اس کے آئین ساری دنیا نے ایران سے سیکھے کافوری شمعیں، شمعدان اور فانوس ان کی نفیس طبیعت اور پر ایجاد ذہن کی پیداوار ہے۔ بیمارستان (اسپتال) دنیا میں سب سے پہلے ایران (جندشاپور)

میں بنا اور طب یونانی وہیں سے ساری دنیا میں پھیلی۔

دنیا میں سب سے پہلے مشین ایرانیوں نے ایجاد کی۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے آلۂ جرِ ثقیل مشین گن (ایک راؤنڈ میں بارہ فیر کرنے والی بندوق) قلعہ شکن توپ ہوا سے چلنے والی چکی ایجاد کی۔

خطِ نستعلیق ایرانیوں نے ایجاد کیا جب ایران میں عربی خط (نسخ) رائج ہوا تو اس کی ناہمواری اہلِ ایران کی نفیس اور حسن پرست طبیعت پر بار ہوئی انھوں نے اس میں گول دائروں اور نوک پلک سے حسن پیدا کیا اور اس کا نام نسخ تعلیق رکھا کیوں کہ وہ نسخ پر تعلیق تھی (خ ثقل کی وجہ سے خارج ہو گئی اور نستعلیق رہ گیا پھر اس میں جدتیں پیدا کیں اور اس کی بہت سی قسمیں ایجاد کیں خطِ گلزار خطِ ماہی خطِ غبار، خطِ طغرا، خطِ ریحان، خطِ شفیعہ وغیرہ اور ہر خط کو مضمون کی مناسبت سے استعمال کیا۔

نسخ کو بھی انھوں نے اس کی حالت پر نہیں چھوڑا اس میں بھی ایک حسن پیدا کیا گویا اونٹ کو بنا سنوار کے دلہن بنا دیا۔ مکانوں کی جالیاں اور ٹائل کی زمین ان کی اختراع ہے۔

قالین کی ایجاد بھی ان کی حسن پسند طبیعت کا کارنامہ ہے انھوں نے جیسے قالین بنائے دنیا میں کہیں نہ بن سکے آج بھی وہ اعلیٰ تمدن کا اہم جزو ہے اور اس سے بہتر کوئی ایجاد اب تک نہیں ہو سکی سفید فرش اور اس کا نام چاندنی نورجہاں کی اختراع ہے۔ عطر بھی اسی کے حکم اور تجویز سے بنا اس سے پہلے مشک رکھتے اور غالیہ (خوشبودار بجو روغن) بالوں میں ملتے تھے درختوں میں پیوندکاری بھی انھوں نے ایجاد کی۔ راستوں میں میلوں کے نشانات اور کاروان سرائیں انھوں نے بنائیں۔ کھانے میں پلاؤ زردہ مزعفر متنجن شیر برنج انہیں کی ایجاد ہے۔

شاعری میں غزل رباعی اور مثنوی کے وہ موجد ہیں۔

ایران کے تمدن میں انقلاب

صفویوں کے زمانہ میں ایرانی تمدن میں انقلاب آیا شیعیت اس میں شدت سے داخل ہوئی اہلبیت سے عقیدت میں ترقی ہوئی شعراء کو مدح اہلبیت میں قصائد اور مصائب میں مرثیہ لکھنے کی ہدایت ہوئی اور اس پر بڑے صلے دئے گئے علماء کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ سلاطین ان کے سامنے تخت و تاج پیش کر کے ان کی نیابت میں امور سلطنت انجام دیتے تھے اپنی بیٹیوں کی شادی ان کے ساتھ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلبیت مرکز عقیدت بنے صوفیت و امرد پرستی کا خاتمہ ہوا خانقاہیں ویران ہوئیں مجلس و ماتم نذر و نیاز اور تعزیہ داری کو فروغ ہوا۔ یہی زمانہ ہندوستان سے روابط بڑھنے کا تھا شاہ اسمٰعیل نے بابر کی اور شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی مدد کی جس کے نتیجہ میں ترکستان افغانستان اور ہندوستان میں ان کی حکومت قائم ہوئی بابر اور ہمایوں سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ دونوں شیعہ ہو گئے تھے [1] ان کے زمانہ میں ہر شعبہ میں ایرانی نظر آتا تھا اور اپنی صلاحیتوں سے سب پر چھایا ہوا تھا۔

ہندوستان کا قدیم تمدن

ہندوستان کے قدیم تمدن میں ہاتھی کی سواری کو بڑی اہمیت تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ شاندار سواری دنیا میں کوئی نہیں۔ جامہ مختلف قسم کی پگڑیاں۔ مٹھائیاں۔ کھانوں میں پوریاں کچوریاں مال پوا دہی بڑے پھلکیاں مزیدار چیزیں تھیں۔ پان بھی یہاں کی خاص چیز ہے جس سے کسی وقت منہ میٹھا پھیکا نہیں رہتا۔ طوائفیں بھی یہاں کی

---

[1] محمد اکبر جوہر ہمایوں کے آفتابہ بردار نے ہمایوں نامہ ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی ہے جس میں ان دونوں کو شیعہ ثابت کیا ہے یہ کتاب حیدرآباد دکن اور کراچی میں چھپ چکی ہے۔

دنیا بھر سے الگ بڑی خصوصیتوں کی حامل تھیں جنسی تسکین کے علاوہ شادی بیاہ اور تفریحی محفلوں کا وہ لازمی جزو تھیں ان کا گانا اور ناچ یہاں کی محفلوں میں ایک سماں باندھ دیتا تھا وہ امرار اور رؤسا کی مقرب اور ان کی تفریح کا سامان تھیں شادی بیاہ کی بھی بہت سی رسمیں یہاں مخصوص تھیں ان سب کو مسلمانوں نے اور ان کی بہت سی باتیں ہندوؤں نے اختیار کرلیں اس طرح ایک مخلوط تمدن قائم ہوا۔

لکھنؤ کا تمدن

برہان الملک سید محمد امین ایرانی امیر زادے جوانی میں بیوی سے خفا ہو کے اپنے وطن نیشاپور سے نکلے اور ہندوستان کا رخ کیا یہاں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہت جلد بلندی پر پہنچ گئے پہلے سعادت خان پھر برہان الملک بہادر جنگ خطاب ملا ۱۱۳۲ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے ان کے ساتھ بہت سے ایرانی سپاہی اور سردار جو دہلی میں بیکار پڑے تھے لکھنؤ آئے جب یہاں ان کا تسلط ہو گیا تو اپنے اہل خاندان اور لواحقین کو ایران سے بلوالیا اس طرح لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا ایران آباد ہو گیا یہ لوگ صفوی دور کے ایرانی تھے جو شیعیت میں بہت سخت اور رسم عزا کی بجا آوری میں بڑا اہتمام کرتے تھے اب لکھنؤ میں بھی مجلس و ماتم ہونے لگا جس طرح ایران میں ہوتا تھا۔ اس کی ترقی دیکھ کے دہلی کے مشہور مرثیہ گو حیدری لکھنؤ چلے آئے ان کی مرثیہ خوانی خوب چمکی اور لکھنؤ میں پہلے پہل شیعیت نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے کوئی شیعہ نہ تھا اودھ کے مشہور فلسفی ملا حمد اللہ شیعہ ہو گئے۔ ان سے متاثر ہو کے بعض اور لوگوں نے بھی شیعیت اختیار کرلی۔ برہان الملک خوش مذاق تھے اور بہت اچھے شعر کہتے تھے ان کے گرد علمار و شعرار کا مجمع رہتا تھا۔

اور سب ان کی قدر دانی سے خوشحال تھے۔ کئی شاعر ایران سے آئے اور ان کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔

اب لکھنؤ میں جو تمدن قائم ہوا اس میں دہلی سے زیادہ شائستگی اور نفاست تھی کیونکہ یہاں ایران کی نقالی نہ تھی بلکہ اصل ایران آگیا تھا جس میں شیعیت نمایاں تھی برہان الملک نے سولہ برس اودھ پر حکمرانی کی سنہ ۳۲ء میں زہرباد سے دہلی میں انتقال ہوا۔

صفدر جنگ برہان الملک نے اپنے بھانجے مرزا مقیم کو ایران سے بلوا کے بادشاہ کے سامنے بیٹی کیا وہ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ پانچ سال تک مہمات سلطنت میں شریک رکھنے کے بعد اپنی بیٹی صدر جہاں بیگم سے ان کی شادی کی برہان الملک کے بعد وہ اودھ کے صوبیدار اور ابدالی کو شکست دینے کے صلہ میں ہندوستان کے وزیر اعظم ہوئے۔ ملکی نظم و نسق اور شجاعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے تمام مورخین ان کی بہادری پر متفق ہیں۔ خود بھی شاعر اور شعرار کے قدردان تھے ایک ایک شعر پر ہزاروں روپیہ انعام دیتے تھے علمار اور صاحبان کمال کے مرجع تھے۔ خود خوش خلق شان و شوکت اور خوش پوشاکی میں مشہور تھے ان کے ہاتھیوں کے گزگے جھنڈے زرکار چوبی جھولیں گھوڑوں کے گنگا جمنی ساز و یراق کی ہندوستان بھر میں شہرت تھی میر تقی میر نے ذکر میر میں لکھا ہے کہ "ان کی شان و شوکت بادشاہ سے بھی زیادہ تھی ان کی فوج کے سپاہیوں کی بانات کی وردیاں تھیں اسلحے سے لیس گھوڑے ساز و یراق سے آراستہ تھے دنیا بھر کے سپاہیوں سے زیادہ ان کی تنخواہ تھی اس پر بھی وہ جیالے نوجوانوں کو خفیہ تنخواہ دیتے تھے اور سپاہیوں پر عام بخشش بھی کرتے تھے اس کی شہرت سن کے

نادر شاہ کی فوج کے بہت سے سپاہی اور سردار ہندوستان آ کے ان کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔

سخاوت میں بھی وہ مشہور تھے کوئی ان کی داد و دہش سے محروم نہ تھا۔

شام اودھ | اجودھیا کے قریب برہان الملک کی فوجی چھاؤنی بنگلہ کو انھوں نے ترقی دے کے شہر بنا دیا اور ایران کے ایک شہر کے نام پر اس کا نام فیض آباد رکھا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان میں سہ پہر کو بازار بند ہو جاتے تھے ایران میں اسی وقت بازار گرم ہوتا تھا اور گیارہ بارہ بجے رات تک چہل پہل رہتی ہے۔ یہی حالت فیض آباد کی بھی تھی یہی شام اودھ ہے جو ہندوستان میں ایک انوکھی بات ہونے کی وجہ سے مشہور ہو گئی۔

سنہ ۱۱۶۵ھ میں ان کو زہرباد ہوا نہایت کرب میں مبتلا تھے مگر اتنا تحمل تھا کہ اس کا اظہار نہیں ہوا انتقال کے بعد لوگوں کو ان کی قوت برداشت پر حیرت ہوگئی کہ مرنے سے کچھ پہلے وہ بڑی شان و شوکت اور سکون و وقار سے بیٹھے دیکھے گئے تھے۔

ان کے زمانہ میں شان و شوکت خوش پوشاکی لکھنؤ کے تمدن میں داخل ہوئی اور ان کے بعد اذیت کا تحمل اہلِ لکھنؤ کی وضع بن گیا کراہنا اور ہائے وائے کرنا بزدلی سمجھا جانے لگا۔

شجاع الدولہ جنگ | سنہ ۱۱۶۵ھ میں جلال الدین حیدر شجاع الدولہ اپنے والد منصور کے بعد حاکم اودھ ہوئے۔ فنون حرب اور جسمانی قوت میں یکتائے زمانہ تھے ایک ضرب میں بھینسے کی گردن اڑا دیتے تھے گوسفند کا کلہ چیر ڈالتے تھے۔ روپیہ کے حرف چٹکی سے مسل کے مٹا دیتے تھے انھوں نے فوج کی تعداد بڑھائی توپ اور بندوق ڈھالنے کے کارخانے قائم کئے عام طرز زندگی

میں سپاہیانہ بانکپن پیدا ہوا اور فیض آبادی آن مشہور ہوئی ایرانی طرز کے چار سو باغ اور سیر گاہیں بنائیں جن کی اتنی شہرت ہوئی کہ شاہ عالم ان کو دیکھنے آئے۔

شعر و سخن کے دلدادہ اور اہل کمال کے قدر داں تھے دہلی کی ابتری سے اہل کمال نے فیض آباد کا رخ کیا اور انہوں نے ان کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ان باتوں میں اپنے پیش رووں سے بڑھ کے قدم مارا

وہ ایرانی ہونے کے ساتھ ساتھ دہلوی بھی تھے ان کی بیوی اور ماں ایرانی باپ کی بیٹیاں ضرور تھیں مگر دہلی میں پیدا ہوئی تھیں خود شجاع الدولہ نے دہلی میں آنکھ کھولی۔ امرائے دہلی کے اکثر ذوق ان میں موجود تھے رقص و سرود جانوروں کی لڑائی ان کی بہترین تفریح تھی ارباب نشاط سے دلچسپی کی شہرت دور دور پہنچی کشمیر کلکتہ اور اطراف ملک سے اتنی حسین و جمیل طوائفیں آئیں کہ ان سے فیض آباد کی گلیاں کوچہ بھر گئے۔ کسی عورت کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس حکم میں طوائفوں پر پابندی مقصود تھی وہ اپنے کو قید نہ سمجھیں اس کے لئے ان پر طرح طرح کی نوازشیں ہوئیں اور بغیر کسی خدمت کے انعام واکرام کا دستور قائم کیا کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں۔

سیر و شکار میں تمام مصاحب ارکان سلطنت فوج کا ایک بڑا حصہ شہر کے خوش باش امیر اسد کے لئے ہر طرح دو کاندار ساتھ ہوتے تھے ہر منزل پر بازار لگ جاتا طوائفوں کے ڈیرے نصب ہو جاتے اور جنگل میں شہر بنجاتا۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ طوائفوں کی کتنی کثرت تھی اور وہ زندگی کا ایک جزو بن گئی تھیں۔

ان کے گھر میں ایرانی فضا تھی ان میں متانت۔ وقار سنجیدگی اور

بلند نظری تھی طوائفوں سے اتنی دلچسپی اور قدردانی کے بعد بھی انہیں تہذیب متانت کے حدود سے تجاوز کی اجازت نہ تھی وہ یہاں آکے پہلے تہذیب سیکھتیں ادب تعظیم کے طریقے دیکھتیں اس کے بعد کسی رئیس کے سامنے آنے کے قابل ہوتیں۔

شجاع الدولہ کے سالے سالار جنگ کھانے کے بڑے شوقین تھے ان کی وجہ سے اہلِ لکھنؤ میں کھانے کا ذوق پیدا ہوا دور دور سے باورچی آئے اور بڑے لذیذ و تکلفی کھانے پکنے لگے۔

مذہبی حیثیت سے ہندو مسلمان دو فرقے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کے بہت سے رداسم اختیار کر رکھے تھے۔

سنی شیعہ کی تفریق نہ تھی شیعہ تھے تو مگر کوئی علیحدہ قوم نہ تھے نکاح طلاق دفن کفن سب اہلِ سنت کے طریقہ پر ہوتا تھا نماز جماعت وغیرہ کچھ نہ تھی کیونکہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا۔

مذہبی رواسم میں پیری مریدی عرس قوالی بڑے پیر کی فاتحہ میراں جی کے ٹلگے شیخ سدو کا بکرا سید احمد کبیر کی گائے مدار صاحب کی کندوری مسعود سالار کا جھنڈا شیعہ سنی دونوں کے مذہبی رواسم تھے۔

محرم میں دس دن تعزیہ داری بھی سب مل کے ایک ہی طریقہ پر کرتے تھے۔ صرف شجاع الدولہ کا علم عام طریقہ کے خلاف اٹھتا تھا لمبی چھڑیں بڑا سا علم اس کی گردن میں کمان کے بیچ کا حصہ مضبوط بندھا ہوا جس کے دونوں سروں پر ذوالفقار لٹکتی ہوتی تھی اس سے کچھ نیچے چھوٹی سی مشک اس کے نیچے پرچم اس کے نیچے پھریرا سیاہ یا سفید شہاب چھڑ کا ہوا شجاع الدولہ یہ علم لے کے سیاہ لباس میں ننگے پاؤں برہنہ

ماتم کرتے نوحہ پڑھتے گشت کرتے تھے۔

عزاداری کا یہ طریقہ شجاع الدولہ کے زمانہ سے شیعوں میں رائج ہوگیا۔ سپاہیانہ بانکپن خوش پوشاکی خوش خوری شان و شوکت تہذیب و متانت کرب و اذیت کی اتنی برداشت کہ اس کا اظہار نہ ہو شعر و شاعری کے ساتھ رقص و سرود اور اربابِ نشاط سے دلچسپی لکھنؤ کے مزاج میں داخل ہوئی۔ ۱۱۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

آصف الدولہ | شجاع الدولہ کے فرزند اکبر مرزا یحییٰ آصف الدولہ ہیتم جنگ ۱۱۸۸ھ حکمراں ہوئے ایک سال کے اندر فیض آباد چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے اور باون گاؤں ملا کے اس کو وسیع کیا نئے محلے عمارتیں اور باغ ایسے عالیشان اور اتنی کثرت سے بنوائے کہ لکھنؤ دنیا کا سب سے بہتر شہر سمجھا جانے لگا۔ بڑے دیندار سخی بہادر شاعر اور فنِ تاریخ و سیر میں کامل تھے۔ ان کے زمانہ میں بڑے بڑے اہلِ کمال لکھنؤ آئے اور شعر و سخن کا ذوق بڑھا۔

ان کو تعزیہ داری سے بڑی دلچسپی تھی اپنا عظیم الشان امام باڑہ بنوایا محرم میں وہ تعزیہ کی زیارت کو نکلتے تھے ہر تعزیہ پر کچھ چڑھاتے تھے یہ طریقہ عام ہوگیا رؤسا نے بھی اسے اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا شہر تعزیہ خانہ بن گیا مجلسیں بڑے اہتمام سے ہوتی تھیں ایران تک سے حدیث خواں واقعہ خواں روضہ خواں اور کتابخواں آئے۔

پہلے شیعہ مجتہد | ان کے زمانہ میں مولانا دلدار علی (غفرانمآب) عراق و ایران سے مذہبی علوم کی تکمیل کر کے آئے اور لکھنؤ میں قیام کر کے شیعوں کی جمعہ و جماعت قائم کی نکاح طلاق دفن کفن سب ان کے طریقہ پر ہونے لگا۔

شیعیت اور صوفیت میں کوئی حد فاصل نہ تھی علمائے عراق نے اس موضوع پر کچھ نہیں کہا علمائے ایران میں ملا محمد باقر مجلسی نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی۔ علامہ محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی قوالی کے جواز کے قائل تھے۔ قاضی نوراللہ شوستری نے بھی صوفیا کی بڑی حمایت کی ہے شیخ علی حزیں بھی صوفیت کے حامی تھے۔

غفرانمآب پہلے شیعہ عالم ہیں جنھوں نے آصف الدولہ کے زمانہ میں صوفیت کے خلاف مہم کا آغاز کیا ایک مستقل کتاب (شہاب ثاقب) لکھی اور تقریر و تحریر سے یہ ثابت کیا کہ صوفیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں صوفیا گمراہ ہیں سوائے آئمہ اہلبیت کے کوئی مرکز عقیدت بننے کے قابل نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا عرس قوالی بڑے پیر کی فاتحہ شیخ سدو کا بکرا میدھ پیر کی گائے غازی میاں کا جھنڈا اور چادر۔ گاگر وغیرہ رواسم جو شیعوں میں رائج تھے وہ چھوڑ دیے گئے ان کی جگہ حاضری علم تعزیے اور آئمہ و شہدائے کربلا کی نذر و نیاز ہونے لگی۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کے تمدن میں کسی خاص چیز کا اضافہ نہیں ہوا مگر ہر چیز میں ترقی ہوئی غفرانمآب کی کوشش سے شیعیت کو بڑا فروغ ہوا اور غزل میں بھی عورت سے عشق یا بیباکانہ باتیں اور شیعی عقائد کا اظہار کیا جانے لگا۔ میر تقی میرؔ نے تو مناظرانہ نوک جھونک سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ باغ فدک خلافت بلا فصل وغیرہ کا ذکر ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا۔

یمین الدولہ سعادت علیخاں | آصف الدولہ کے بعد ان کے سوتیلے بھائی سعادت علیخاں سنہ ۱۲۱۲ھ مسند حکومت پر بیٹھے وہ بہت بڑے عالم مفکر فلسفی سیاستداں اہل کمال کے سرپرست تھے رقص و سرود اور حسن پرستی کی فضا میں انہوں نے پرورش پائی تھی شعر و سخن کی فضا میں آنکھ کھولی تھی نفاست و پاکیزگی

ذوق ان کے گرد و پیش پھیلی ہوئی تھی سنجیدگی وقار ان کی فطرت تھی۔ اس وقت تک رات کو سواری کے ساتھ مشعلوں کا رواج تھا انھوں نے سونے چاندی کی کئی سو لالٹینیں بنوائیں جن میں شمعیں جلتی تھیں یہ خوبصورت چھڑوں میں ان کی سواری کے ساتھ رہتی تھیں۔

شجاع الدولہ کے زمانہ سے ناچ گانے اور طوائفوں سے دلچسپی مانو اودھ کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سعادت علی خاں ایسا متین و سنجیدہ شخص بھی اس سے نہ بچ سکا صبح کو اجلاس کے وقت ایک طرف امرائے دربار فوجی افسر کاغذات لیے حاضر رہتے تھے دوسری طرف طائفے رقص و سرود میں مشغول رہتے تھے نوبت و نقارے کی آواز اس پر مستزاد تھی اور وہ کام کرتے ہیں اٹھ اٹھ کے کھڑکیوں میں سے دیکھتے رہتے تھے یہی حالت تمام امراء کی تھی عوام کو بھی اس سے بڑی دلچسپی تھی اس وجہ سے طوائفوں کی بڑی کثرت ہو گئی ان کو شہر سے باہر جانے کی ممانعت تھی نواب کا خیال تھا کہ یہ شہر کی رونق ہیں حکومت اور رؤسا کی طرف سے ان کو بغیر کسی خدمت کے انعامات ملتے رہتے تھے۔

زبان کے معاملہ میں بھی ان کا ذوق بہت پاکیزہ تھا شوکت الفاظ کے ساتھ بلیغ مختصر معنی خیز اور مرصع فقرے برجستہ ان کی زبان سے نکلتے تھے۔ وہ ملائی کو بالائی کہتے تھے انشاء نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ :-

"حضور والا کی اردو میں تحریر و تقریر مقامات حریری کی یاد دلاتی ہے۔ نہ کوئی ایسا فصیح زبان اور شیوا بیان پیدا ہوا نہ ہوگا کسی وقت ان کی بات لطیفہ سے خالی نہیں ہوتی کبھی طباق کبھی ایہام کبھی ترشیح کبھی محتمل الضدین"

بظاہر یہ خوشامد معلوم ہوتی ہے مگر سچ پوچھیے تو ان کی ادبیت کا حق ادا نہ ہو سکا حریری نے انشا پردازی کی ہے اور سعادت علی خاں کی معمولی بات چیت اور روزانہ کے احکام ہیں یہ بات حریری کو کہاں نصیب انہوں نے قانون بنایا کہ جو منشی املا کی غلطی کرے اسی حرف کے ہم عدد اس پر جرمانہ کیا جائے۔ ایک نیا منشی نوکر ہوا اس نے بہ نوع "نو" "بہ نو" لکھدیا تحریر نظر سے گذری اس پر حکم لکھا،

"منشی نو لفظ نوع را بطرز نو نوشت عین خط کرد ہفتاد روپیہ جرمانہ"

ایسی برجستہ عبارت بڑے بڑے انشا پرداز نہیں لکھ سکتے سرکاری درزی نے اضافہ تنخواہ کی درخواست دی اس پر حکم لکھا ؎

گر زمیں را با سماں دوزی　　　نہ دہند ت زیادہ از روزی

جان بیلی صاحب فارسی دانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے خود بھی ان کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا سعادت علی خاں کے مختصر معنی خیز اور مرصع جملوں کی شہرت تھی بیلی صاحب جب رزیڈنٹ ہو کے لکھنؤ آئے تو کہا تو یہی میں ان سے مختصر سوال کروں اور انھیں طولانی جواب دینا پڑے اپنے دل میں کچھ سوال مرتب کیے جب ملاقات کو آئے تو سلام، مزاج پرسی کے بعد پوچھا،

آپ کے عجائب خانہ میں کون کون سے جانور ہیں؟　　از شیر تا بٹیر۔

آپ کے ملک کے کیا حدود ہیں۔؟　　از سنگ تا گنگ
　　　　　　　　　　　　　　　　ہمالیہ　گنگا

بیلی صاحب حیران ہو گئے اور پھر کسی سوال کی جرأت نہ ہوئی۔

سعادت علی خاں کا یہ انداز تحریر و تقریر بیحد مقبول ہوا خاص و عام سب معمولی گفتگو صنائع و بدائع میں کرنے لگے۔ سودا بیچنے والوں کی

صدائیں مشہور ہیں۔

علماء کی تقریر و تحریر بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی سلطان العلماء مجتہد العصر کی تصنیفیں ایسے فقروں سے بھری پڑی ہیں ان کی روزانہ کی گفتگو اور مقدمات کے فیصلے بھی اسی رنگ میں ہوتے تھے۔

مُتی لطائف بدکاری جرم میں گرفتار ہوئی جرم ثابت ہوا فیصلہ میں لکھا مُتی بالتضم والتشدید لے

ایک حکیم عنب حنائے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرلیا اس کی شکایت صحیح ثابت ہوئی فیصلہ میں لکھا۔

"حکیم صاحب رفع قبض نمایند"

یہ انداز تقریر و تحریر لکھنؤ کے تمدن کا ایک جزو بن گیا۔

سعادت علی خاں کو اپنے باپ دادا اور بھائی کی طرح ع۔ا اداروں سے بڑی عقیدت تھی وہ محرم بہت اہتمام سے مناتے تھے۔ ابتک صرف دس دن محرم میں تعزیہ داری ہوتی تھی انھوں نے چہلم بھی قائم کیا تال کٹورے کی کربلا اور حضرت عباس کی درگاہ بنوائی۔

میر سید علی نے سوز خوانی میں وہ کمال پیدا کیا کہ لوگ حیران ہو گئے اور لکھنؤ میں سوز خوانی نے ایک اعلیٰ فن کی حیثیت اختیار کی۔

ایک نیا شہر انگریزی طرز کا آباد کیا۔ بڑے بڑے شعراء دہلی سے آئے اور مختلف سرکاروں سے وابستہ ہوئے۔

پرکاش نے بتاسے پر ناچ کے لوگوں کو حیرت میں ڈالدیا

لے مُتی برائی میں شدت سے ملوث ہوئی۔

سنہ ۱۲۲۹ھ کو سعادت علی خاں کا زہر سے انتقال ہوا۔

غازی الدین حیدر | غازی الدین حیدر سعادت علی خاں کے فرزند اکبر اپنے باپ کے بعد سنہ ۱۲۲۹ھ میں مسند حکومت پر بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی شاہی کا اعلان کیا اپنے نام کا سکہ ڈھلوایا۔ دو کروڑ میں تاج و تخت اور گنبد زرنگار تیار ہوا اٹھارہ ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۴ھ کو تخت شاہی پر جلوس فرمایا سلطان العلماء مجتہد العصر نے اپنے دست مبارک سے تاج شاہی ان کے سر پر رکھا اور پہلا حکم کچھ سادات کی تنخواہ کا شاہی قلم سے صادر ہوا شاہ زمن لقب اختیار کیا۔ وہ بڑے شجاع و بہادر عالم و فاضل علماء و فضلا کے سرپرست و مرجع تھے۔

شاعری سے بھی دلچسپی تھی حمد نعت اور مرثیہ زیادہ کہتے تھے غزل میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی کی ایک بلند پایہ لغت (ہفت قلزم) کے مصنف ہیں ایک عربی لغت (تاج اللغات) مستند علماء سے لکھوائی۔

ٹائپ کے حرفوں کا چھاپہ خانہ اور کنواری لڑکیوں کی شادی کا محکمہ قائم کیا۔ طبیعت نفاست پسند اور جدت طراز تھی کپڑوں کے ذوق کی بشپ ہیبر نے بہت تعریف کی ہے ایک ٹوپی مندیل کی قسم کی ایجاد کی گھوڑے اور مچھلی کی شکل کی کشتیاں بنوائیں ہاتھی کا ایسا ہودا بنوایا جو چاروں طرف گھومتا تھا گینڈے پر ہودا رکھ کے سواری کی بے طناب کا خیمہ بنوایا۔ حقہ کا نام حسن محفل رکھا نجف اشرف قدم رسول اور شاہ سعادت علی خاں کا مقبرہ تعمیر کرایا نہر کھدوائی اور اس میں پانی کے لئے انجن منگوایا ان کے زمانہ میں شہر کی بہت رونق بڑھی۔

آداب نشست و برخواست اور لوازم تعظیم و تکریم سخت ہو گئے چھینکنا کھانسنا۔ جماہی لینا کھجانا بے تماشا ہنسنا خلاف تہذیب قرار پایا خطاب و جواب میں بڑی لچک اور دلکشی پیدا ہوئی سلام و مزاج پرسی کے انداز میں اشتیاق اور خلوص کا مفہوم پیدا ہوا سنجیدگی متانت کی پابندی لازمہ شرافت تھی۔ غیر مہذب آدمی شرفا کی محفل میں بیٹھنے کے قابل نہ تھا اسوجہ سے ہر شخص کو آئین تہذیب کا معیار بننا پڑا مصاحب طائفین خدمتگار خاص طور پر مہذب ہو گئے یہ بات صرف دربار اور امیروں کی سرکار تک نہ رہی بلکہ عام ہو گئی اس کا اثر یہ ہوا کہ بازاری اور مکروہ لفظیں لونڈا۔ لپاڑ۔ جاٹنا۔ چولیا۔ بڑ جود۔ بھڑوا۔ ابے وغیرہ زبان سے خارج ہو گئیں نقل۔ قول کی ضرورت پر موزوں الفاظ سے کام لیا جاتا ہے یہ معیار تہذیب دہلی میں کبھی نہ تھا۔

فن سپہ گری کو ترقی ہوئی لوگ عموماً سپاہیانہ وضع میں رہنے لگے شعر و شاعری کا ذوق بڑھا علوم و فنون کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا علما، شعرا، اطبا اور دوسرے صاحبان فن دور دور سے آئے اور قدر دانی سے سرفراز ہوئے نفاست اور پاکیزگی ذوق کا شعور بڑھا تعزیہ داری کو ترقی ہوئی بادشاہ نے حضرت علی کے روضہ کی نقل تعمیر کرائی اور اس کا نام شاہ نجف رکھا انگلینڈ سے بلور سبز کی ضریح ڈھلوا کے منگوائی علم و تعزیے کے ساتھ یہ ضریح بھی اٹھائی جاتی تھی۔

۱۲۴۲ھ میں ان کا انتقال ہوا اپنے بنوائے ہوئے امام باڑہ (شاہ نجف) میں دفن ہوئے لالہ صاحب رائے فریاد نے تاریخ کہی ہے

حیدر نجف مقام بگرفت

نصیر الدین حیدر | غازی الدین حیدر کے اکلوتے بیٹے نصیر الدین حیدر ۱۲۴۲ھ میں

تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور سلیمان جاہ لقب اختیار کیا سلطان العلماء سید
محمد رضا مجتہد العصر نے تاج پہنایا۔ وجیہہ و شکیل رعب شاہی چہرہ سے نمایاں
اعلیٰ درجہ کے شہسوار اچھے پیراک اور خوشگو، شاعر تھے بادشاہ تخلص تھا
ان کا دربار بڑے رعب و داب کا دربار تھا کسی کو چھینک آگئی تو اس کی
ناک کٹوائی[1] طبیعت میں بڑی نفاست اور خوشبو سے بہت رغبت تھی عطر اور
پھول کا استعمال عجیب عجیب طرح کیا خس کی ٹٹیوں پر کیوڑہ اور گلاب چھڑکا
جاتا تھا عطر کے فوارے چھوٹتے تھے اور حوض بھرے جاتے تھے ہزاروں سرکاری
باغوں کے علاوہ سیکڑوں روپیہ کے پھول روزانہ بازار سے آتے تھے
مزاج میں اتنی نزاکت تھی کہ بیلے کے تیل کی خوشبو ناگوار ہوئی۔

خوبصورت عورتوں کو جمع کرنے اور انھیں آراستہ رکھنے کا بے حد شوق تھا
کئی ہزار کہاریاں پہرہ داریاں خواصیں اور کنیزیں تھیں جو بہت بناؤ سنگھار
سے رہتی تھیں ان کی لونڈیوں نے جو لباس پہن ڈالا وہ مغل اعظم کی ملکہ اور ان کی
شہزادیوں کو نصیب نہیں ہوا ایک ایک دوپٹہ چار چار ہزار کی لاگت کا ہوتا تھا

رفاہ عام کا بڑا خیال تھا شہر کے ناداروں کا وظیفہ معین کیا انگریزی
اسپتال یونانی شفاخانہ۔ محتاج خانہ اپاہج خانہ بنوایا جو اب تک موجود ہے۔
گومتی پر لوہے کا پل بنوایا۔

علم نجوم کے بڑے ماہر تھے رصد خانہ سلطانی تعمیر کرایا اور زیچ سلیمان
جاہی مرتب کرائی۔

لکھنؤ کا چھاپہ خانہ کھولا ڈرامے کی بنیاد قائم کی رقص و سرود کو ترقی

---

[1] لکھنؤ میں چھینکنے سے ناک کٹنا محاورہ اسی بنا پر ہے فسانۂ عبرت سے تاریخ اودھ

اور عالموں کی کثرت ہوئی شعر و سخن کا ذوق اور سپہ گری شوق بڑھا سارا شہر ہتھیار بند ہو گیا تعزیہ داری کو بہت عروج ہوا۔ ذوالجناح اور مہندی نکالنے کی ابتدا کی آٹھویں ربیع الاول تک ایام عزا قرار دیئے ایک عالیشان کربلا تعمیر کرائی میر ضمیر نے تحت لفظ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

اہلِ بیت سے مودت اور عقیدت عام تھی اہلِ سنت تفضیلی تھے ہندو مسلمان سب تعزیہ داری کرتے تھے پہرہ وار علم حیدر جاگو کہہ کے پہرہ دیتے تھے فقیر مناقب پڑھ کے بھیک مانگتے تھے یہ لکھنؤ کے شباب کا زمانہ کہا جاتا ہے اس وقت لکھنؤ کا تمدن یہ تھا۔

لباس کا شوق۔ عطر کا ذوق۔ سپہ گری میں مہارت ہتھیار سے لیس شہ سواری بٹیر بازی مرغ بازی عشق و عاشقی شعر و شاعری رقص و موسیقی علوم و فنون کی قدر جسمانی تکلیف کا اتنا تحمل کہ زبان سے ہائے وائے نہ نکلے خوش خوری اور کم خوری مفلسی کو چھپانا۔ اپنے کو خوشحال ظاہر کرنا ادب و تعظیم کا لحاظ رفتار و گفتار میں سنجیدگی وقار بازاریوں کے الفاظ سے پرہیز نکتہ رسی و بذلہ سنجی خلق و انکسار باتوں میں اپنی تعریف اور نمائش کا پہلو نہ آنے دینا گفتگو میں تشبیہ و استعارہ صنائع کا صرف شعروں اور مصرعوں کا برمحل استعمال ہر بات میں اپنے اوپر نگاہ احتساب کہ کوئی فعل نفاست و سنجیدگی کے خلاف سرزد نہ ہو۔ اس معاشرہ میں نسلیں گذر گئیں ذہن اس سانچے میں ڈھل گئے سپہ گری کی آن بان کے ساتھ خلق و انکسار عشق و عاشقی اور رقص موسیقی کے ساتھ تہذیب و وقار نفاست و نزاکت مزاج بلند نظری جدت اور جودت طبع حاضر جوابی نکتہ سنجی فصاحت و بلاغت اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت اور شناخت بن گئی۔

ناسخ کی شاعرانہ صلاحیتیں | اسی فضا میں ناسخ نے نشو و نما پائی ان میں فطرتاً شعر و ذوق سلیم شاعرانہ حیثیت صلاحیت جدت طبع بے انتہا تھی ان کی فطری صلاحیتیں لکھنؤ کی تہذیب و نفاست کے سانچے میں ڈھل کر ایسے پاکیزہ ذوق کی شکل میں نمودار ہوئیں جس کا لکھنؤ کی تہذیب تقاضا کر رہی تھی انھوں نے زبان کی صفائی پاکیزگی کے ایسے قاعدے بنائے اور ان پر عمل کر کے فصاحت و بلاغت کا ایسا معیار قائم کیا کہ لوگوں کو اس کی تقلید سے گریز ممکن نہ ہوا۔ شاعری میں مضامین کی سنجیدگی اور ادائے مطلب میں جدتوں سے ایسی دلکشی پیدا کی کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی ہر جگہ کے شاعر نے اس کی تقلید کی کہنہ مشق اپنے انداز کو چھوڑ کے ان کی پیروی کرنے لگے مصحفی ایسے استاد کل اتنا مرعوب ہوئے کہ سر مشاعرہ ان سے غزل پڑھنے کی اس طرح فرمائش کی ؎

ہاں مگر شیخ کی خدمت میں یہ ہے اپنا سوال ؛ پڑھ چکے ہم تو کچھ اب آپ عنایت کیجے

معلوم ہوتا ہے کہ غزل کہتے وقت ناسخ کا اتنا رعب تھا کہ نہیں معلوم وہ اس زمین میں کیا کیا گلکاریاں کریں گے عنایت کیجے کے قافیہ میں دل کی بات بے اختیار زبان پر آگئی۔

اپنے چھپے دیوان کے مقدمہ میں ان کی تقلید کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے :-

تخلص خود را اسم با مسمیٰ نگاشتہ بر طرز ریختہ گویان
سادہ کلام در عرصہ قلیلے خط نسخ کشیدہ ______
غزلیات ایں دیوان ششم را اکثرے بر رویہ ایشاں گفتہ

غالب ایسا مغرور شاعر جو بڑے بڑوں کی حقیقت نہیں سمجھتا کسی کی جھوٹی تعریف کو کبھی کہتا اور اپنے لیے اس کو ننگ و عار جانتا ہے ناسخ کے

آفتاب کمال کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور ان کو موجد و مجدد و مصلح زبان و شاعری تسلیم کرتا ہے۔ عبدالغفور نساخ کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک اور گستاخ ہیں شیخ امام بخش ناسخ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔"

ناسخ کو اپنے دیوان کے ساتھ جو خط بھیجا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے وہی عقیدت ٹپکتی ہے جو ایک لائق شاگرد کو اپنے باکمال استاد سے ہونا چاہیے۔

غالب کا خط ناسخ کے نام

"این ورقہائے بخون جگر نگاربستہ ارمغانیست بغالب جگرخستہ بحضرت خدام والا مقام سخن سنج معنی نیاہان امید گاہ نظامی نظام ظہوری ظہور۔ نظیری نظیر فیضی فیض۔ ضمیری ضمیر۔ ثنائی شان۔ نوائی نوا۔ فغانی فغان۔ در علم صائب و در عمل راسخ مخدوم معظم مطاع مکرم۔ مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختہ اند و در ریختہ نقش بدیع انگیختہ او فرستادن این فہرست نادانی بدان دانا آموز کار نہ ازان رواست کہ طبع آہنگ نمائش و ہمت بعرض تجمل گرائش دارد بلکہ نامہ نگار در پی پردہ سگالی است کہ نیز این تیرہ بخت سرانجام قلم و تحریر بلمعان نگاہ قبول مولانا روشنے اندوزد و آنچہ بجز لک انصاف قابل ازیں اوراق سترون نرسیدہ است بغازہ تحسین مخدوم رخ امتیاز افروزد۔"

ناسخ نے اپنا دیوان مرزا موسیٰ جان کے ہاتھ غالب کو بھیجا تھا اس کا شکریہ جن الفاظ میں ادا کیا ہے اس کے ضروری اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"ندانم چہ می نگارم کہ دریں نگریستن نگاہ از ناز بدیدہ در نمی گنجد و دریں نگارش خامہ از شادی در بنان می رقصد۔ بخت را بر رسائی ستایم و پندارم کہ بطور معنی رسیدہ ام وخود را بگمان مائگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ را با ید بیضا دیدہ ام۔

زہے دیوان کہ مداد ش از دودۂ چراغ طور است و غلافش از دیبائے حلہ حور لفظ معنی را گنجینہ۔ چوں بگوئی خواہ نامہ گر اہد نگارندہ این کریم نہادم کہ ایں نامہ دو میں نقش است ازاں خامہ اگر ان تحسین نامہ دلپذیر نبودے مرا ایں را بہیچ نظر نبودے۔

آرے ہر متاعے را کہ بیک نائے نام برآور دو گزند چشم زخمش ہمہ بیشتر آید سبحان اللہ سخن بروزگار مخدوم بہا پایہ بلند بید دارد و رار ونقے دیگر پدید آمد" (پنج آہنگ)

اس خط میں غالب نے ناسخ کے مقابلہ میں اپنی ہیچ میرزی اور ان کے کمال کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے بہت مرعوب تھے اور ان کے مقابلے میں کسی شاعر کی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ کچھ انھیں پر موقوف نہیں اس وقت کے تمام ادبا و شعراء ان کے طرز سخن کے شیدا اور اس کی تقلید حسن کلام کی ضمانت سمجھتے تھے دہلی کے مستند اہل زبان اور قادر الکلام شاعر مرزا قادر بخش صابر گلستان سخن میں یوں زمزمہ سرا ہیں۔

"گرسنہ ہنر اس کے مائدہ سخن سے زلہ رباد عمیدار الملک اس کے شوکت الفاظ سے پائمال اہل انصاف اس کو استاد مانتے اور ارباب فہم اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں۔"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ گلشن بے خار میں یوں نغمہ طراز ہیں۔

"نسیم طبعش نکہت ریز۔ شمیم گل فکرش دل آویز۔ طائر بلند پروازِ غورش جز بشاخ سدرہ آشیانہ نسازد۔ و مرغ تیز بال خیالش جز ببام فلک جلوہ نیانداز د۔ والا مایہ۔ بلند اندیشہ۔ نازک خیال در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و بے مثال"۔

مؤلف تذکرہ بہار بے خزاں یوں گل فشانی کرتے ہیں :۔

"سحر بیان استادی نکتہ بنداں زباں بود"

تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مؤلف لکھتے ہیں :۔

"ناسخ رسم کہن مجتہد شعر و سخن۔ صاحب رائے سلیم یادگار عصا و کلیم خلاق معانی شیریں بیان، مرحوم مغفور شیخ امام بخش ناسخ"۔

مؤلف بہارستان اودھ رقمطراز ہیں :۔

شیخ امام بخش ناسخ سر دفتر شعرائے عظام لکھنؤ مانا گیا ہے فصاحت و معنی آفرینی میں یکتائے روزگار تھا فکر رسا اور بلاغت کلام میں مرزا صائب اور ملا ظہور سے گوئے سبقت لے گیا ہے

طرز اندیشہ آفریدہ اوست　　　　در تن لفظ جان دمیدہ اوست

نصر اللہ خان خویشگی گلشن ہمیشہ بہار میں لکھتے ہیں۔

شاعر غرا کلامش از شتم معرا طبعش نکہت انگیز فکرش دل آویز والا مایہ عالی پایہ بلند اندیشہ

ناسخ کی زبان و شاعری کے قبول عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کا کلام لکھنؤ کا تحفہ سمجھا جاتا تھا شیفتہ ان کے حال میں لکھتے ہیں :۔

جدید غزلوں کے بھی دو تین اشعار جو بعض احباب تحفتہً لکھنؤ سے لائے

تھے قلم بند کیے گئے۔" (گلشن بیخار)

صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں غالب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ناسخ کا کلام دہلی پہنچا تو ایک دھوم مچ گئی، میں نے اور مومن نے ان کا متبع ہونا چاہا۔

اتنی پسندیدگی کی وجہ سمجھنے کے لئے انہی لوگوں کے بیانات پر غور کرنا چاہیئے۔

مصحفی:۔ طرز جدید کے موجد متقدمین کے کلام پر خطِ نسخ کھینچ دیا۔

غالب:۔ طرز جدید کے موجد۔ پرانی ناہموار روش کے ناسخ۔ شاعری کو پایہ بلند پر پہنچایا۔ اُردو کے قالب میں روح تازہ پھونکی"۔

شیفتہ:۔ ان کا کلام دل آویز۔ ان کی فکر بلند۔ خیال نازک تلاش مضمون تازہ اور معنی سیراب میں بے مثال۔

نصراللہ خان:۔ طبع نکہت انگیز فکر دل آویز۔ بلند اندیشہ۔ نازک پیشہ۔

مرزا قادر بخش صابر:۔ شوکتِ الفاظ سے ان کا کلام سحر ہے۔"

سعادت ناصر خان:۔ ناسخ رسم کہن خلّاق معانی۔

بہارِ بے خزاں:۔ سحر بیاں استاد نزاکت بندان زباں

بوستان اودھ:۔ نقاد جنت معنی آفرینی میں یکتائے روزگار میرزا صائب اور ملا ظہوری سے بازی لے گئے۔

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک بلند پروازی معنی آفرینی نازک خیالی طرز ادا میں جدت اور زبان میں فصاحت و بلاغت کی وجہ سے ناسخ کے کلام میں دلکشی ہے اور یہی باتیں شاعری کی جان ہیں یہی دلی لکھنؤ کا فن ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لکھنؤ میں یہ فن سنجیدہ صاف ستھرا اور معراج کمال پر پہنچا ہوا ہے اس کی تفصیل لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنے میں مدد دے گی۔

زبان ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ گنواری بازاری۔ بھونڈی۔ بھدی لفظیں اور ترکیبیں ترک کیں۔

۲۔ تذکیر و تانیث کا تعین بڑے سلیقہ سے کیا۔

۳۔ علامات فاعلیت وغیرہ کا ترک ممنوع قرار دیا۔

۴۔ حرف کا دبنا۔ گرنا اور بڑھنا ترک کیا۔

۵۔ تعقید اور اضمار قبل الذکر سے پرہیز کیا۔

ان اصلاحوں سے زبان میں روانی سلاست اور صفائی پیدا ہوگئی۔

۶۔ شعر کی ایک خاص زبان بنائی۔

لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ میں دو زبانیں بولی جاتی ہیں ایک گھر کے اندر کی زبان ہے جسے اہل لکھنؤ کی مادری زبان کہنا چاہیئے اس میں عربی فارسی لفظوں تشبیہوں استعاروں اور صنعتوں کا بڑا ہلکا پھلکا استعمال ہے بچے بوڑھے عورت مرد سب یہی زبان بولتے ہیں۔ مثلاً مزاج عالی مزاج اقدس گھر کے اندر کی زبان نہیں اس کی جگہ مزاج اچھا ہے؟ مزاج کیسا ہے؟ کہتے ہیں بڑے بڑے علماء گھر کے اندر اسی سادی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔

ہم آپ کو لکھنؤ کی دو ہمسایوں کی بات چیت سناتے ہیں ایک ہمسائی اپنے گھر کی کھڑکی سے دوسری ہمسائی کے گھر آئی ہے۔

بہن تسلیم۔ تسلیم مزاج اچھا ہے آج کدھر بھول پڑیں؟ کیا بتاؤں سارا دن الم غلم میں گذرتا ہے گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی آج سب کاموں کو تج کے آئی ہوں۔ بٹیا کہاں ہیں؟ کمرے میں سو رہی ہیں رات کو باجی اماں کے میاں رتجگے میں گئی تھیں۔ ماشاء اللہ کیا سن ہے؟ خدا رکھے ڈگنا برس ہے

اللہ سلامت رکھے اب تو شادی کا سن ہو گیا کہیں سے بات آئی ہے ؟

ہاں چچا کے لڑکے کا پیام ہے مگر وہ شہدہ پاک پنج عیب شرعی نہ کماتا ہے نہ کجاتا ہے۔ کنکیا ہے اور وہ ہے محلے لفنگے گھیرے رہتے ہیں باپ کی دولت ہے جو ہوا میں اُڑ رہی ہے۔

باپ دیتے کیوں ہیں ؟ اے لو۔ کیوں نہ دیں چہیتے ہیں اکلوتے ہیں۔

نوج۔ "ایسی چاہت پر خدا کی مار" جو بچے کو برباد کر دے خدا رکھے بہن کا لڑکا بھی تو سمجھدار ہو گیا۔

دوسری بیوی۔ آپ کہاں رہتی ہیں اس کی تو شادی بھی ہو گئی۔ اے سچ کہیے کہاں ہوئی ؟ پھوپھی کی لڑکی سے۔

خدا مبارک کرے۔ لڑکی کیسی ہے ؟

چندے آفتاب چندے ماہتاب کامنی سی مورت۔ بوٹا سا قد نک سک سے درست خوبصورت۔

کچھ سلیقہ بھی ہے ؟ کیوں نہیں سینا پرونا پکانا ریندھنا کیا نہیں آتا ماشاءاللہ پانچوں انگلیاں پانچ چراغ ہیں۔

میاں کا کیا حال ہے ؟ پروانہ ہے دیکھے جیتا ہے۔

جہیز کیا ملا ؟ اے جہیز کی بھلی چلائی موئی کُھسیا بہمی کے نام پھوپھی کے ٹوٹے پھوٹے دو چار ٹھیکرے بوری بوری کپڑے انھیں کے ہاتھ لگے کے دو چار تار چھپلے۔

چلو دو سر تو جڑ لگے۔ ہاں خدا رکھے گھر آباد ہو گیا میاں بیوی دونوں خوش ہیں۔ بس اور کیا چاہیئے۔

خدا رکھے صاحب زادے کا کیا حال ہے ؟

بس کیا بتاؤں خدا موت نے ایسے لڑکے سے نہ ہونا اچھا۔

اے نوج ۔ دور پار ۔ چھائیں پھوئیں ۔ شیطان کے کان بہرے
اے انگریز بندوں کو ۔ آپ کو وہم بھی نہیں آتا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ خدا
رکھے ابھی سن ہی کیا ہے ؟ اے سن کیوں نہیں موا نوبنڑ ہوگیا نہ لکھنے کا
نہ پڑھنے کا سارا دن کنکوے کے پیچھے لترلقر کرتا پھرتا ہے نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کی
سوکھ کے کانٹا ہوگیا آنکھیں ہیں کہ ڈھکر ڈھکر کر رہی ہیں دو نوالے
اتارے اور بھاگا دو نوالے اتارے اور بھاگا کھائے گا دن بھر میں
پانچ چھ دفعہ مگر وہی دو چار نوالے وہ بھی بیٹھ کے اہل دلی ہیں۔ جاتا کہاں ہے۔
باہر تو میں نکلنے نہیں دیتی وہی بارہ دری کے سامنے والے ہاتے (احاطہ)
میں دن بھر اودھم[1] مچائے رہتا ہے۔
اکیلا ؟ نہیں اکیلا کیوں ہر مرزی خانم کا لڑکا اچھے صاحب کا لڑکا اور محلے کے
دو چار شہدے ۔
خدا رکھے سن آنے پر سنبھل جائے گا بچپنا ایسا ہی ہوتا ہے شادی
بیاہ ہوگا بیوی بچوں میں پھنس جائے گا پھر کہاں کا کنکوا کہاں کا وہ
اے بہن آپ کی بھی باتیں یہ عادتیں کہیں چھٹتی ہیں بچپنے سے سنتی آرہی ہوں۔
نواب آغن صاحب نے میدان بد اچھے کنکوا لڑ رہا ہے پوتا پوتی نواسا
نواسی والے ہوگئے مگر کنکیا ہاتھ سے نہ چھوٹا تھی نہ چھوٹی اے سب ایسے تھوڑی
ہوتے ہیں اتنے بڑے شہر میں ایک نواب آغن صاحب ایسے نکل گئے تو کیا۔ اے
ایک انہیں پر تھوڑی موقوف ہے ایسے نہیں معلوم کتنے آغن صاحب شہر میں

نوٹ:۔ خط کشیدہ فقرے عورتوں سے مخصوص ہیں باقی عورت مرد سب یکساں بولتے تھے۔
له تکرار بار بار کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔

ہیں ۔ آخر ان سے کنکیا لڑانے والے بھی تو ہوں گے ۔

لکھنؤ کی ادبی زبان دوسری زبان باہر کی ہے یہ ذکاوت و ذہانت ادبیت اور قابلیت کے اظہار کی زبان ہے اس میں عربی ۔ فارسی لفظیں تشبیہیں استعارے اور صنائع و بدائع ہیں ناسخ نے اس زبان کو شعر میں اس خوبی سے استعمال

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کیا کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے ؎

تماشائے بخون غلطیدن بسمل پسند آیا

یا

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات

کی طرح فارسیت نہیں پیدا ہونے پائی بلکہ اردوئے معلیٰ بن گیا ؎

یہ سماعدون کا ہے اس کے عالم کو جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم
نیام تیغ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

ناسخ کے اس شعر میں ان کے اور شعروں کی بہ نسبت عربی فارسی لفظیں اور ترکیبیں زیادہ ہیں ۔ یہ شعر خاص طور پر اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں کی افراط کے بعد بھی ناسخ کے شعر سے فارسیت نہیں ٹپکتی بلکہ نہایت فصیح اردو معلوم ہوتا ہے اسی کو ٹکسالی زبان کہتے ہیں ۔ لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھتے وہ اسے مستند زبان کے معنی میں بولتے ہیں ۔

ٹکسالی زبان کے معنی دنیا کی کسی زبان میں مستند زبان کو ٹکسالی نہیں کہا جاتا ۔ ٹکسال میں سکے ڈھلتے ہیں زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہ صرف اردو میں ناسخ کی زبان کے لئے کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محلہ ٹکسال میں وہ رہتے تھے ان کی زبان میں جو شعر کہتا تھا اس کی تعریف میں کہا جاتا تھا کہ یہ ٹکسالی زبان ہے یعنی ناسخ کی زبان ہے باہر والوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا وہ اسے مستند زبان کے معنوں میں بولنے لگے ۔

شاعری میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ بھونڈے بازاری اور اوباشانہ مضامین اور انداز بیان کو ترک کر کے تہذیب و شائستگی پیدا کی۔

۲۔ ہر طرح کے اخلاقی تمدنی اور فلسفیانہ مضامین غزل میں داخل کیے۔

۳۔ صنائع بدائع تشبیہ و استعارے ابہام و اشاریت سے نئی راہیں کھولیں۔

۴۔ ادائے مطلب کے سیکڑوں طریقے بتائے ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا ٭ روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

معجزہ شاعرانہ ہے شعرا نے اس زمین میں غزلیں کہیں مرثیہ گویوں نے سلام کہے۔ میر انیس ایسے خدائے سخن نے سلام کہا اور پوری قوت سے کہا مگر اس کا جواب نہ کہہ سکے اس کی ساری خوبی ادائے مطلب میں ندرت سے ہے۔

شدت جنون سے برہنگی کی حالت کس طرح بیان کرتے ہیں ؎

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا ٭ چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

عالم بیخودی

دل کو خوش آئی میں صحرا کی ہوئیں پر خار ہے اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

دنیا میں مجھ سے زیادہ گنہگار کوئی نہیں۔ ؎

نجات ہوگی عذاب حساب سے سب کو ٭ جو پہلے روز قیامت مرا حساب ہوا

مفلسی کی وجہ سے کوئی پرسان حال نہیں۔

سد راہ کس و ناکس ہے مرا شہرۂ فقر ٭ ورنہ کب مجھ کو میسر کوئی درباں ہوتا

ترک دنیا میں آسودگی ہے ؎

کھلے دروازے ہر شب چین سے سوتے ہیں ہم جب سے!
دیا ہے خانہ ویرانی کو عہدہ پاسبانی کا!!

اسی مضمون کو دوسری طرح یوں کہا ہے ؎

بادشاہی کر رہے ہیں اے نزدِ الفقر میں ؂ بخت خفتہ کو کہیں اب طالع بیدار ہم

معشوق کے باغ میں جانے سے گلوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور باغ بے رونق ہو گیا۔ اس مضمون میں ناسخ کا اہتمام اور جدت دیکھیے وہ کہتے ہیں کہ باغ کی ساری رونق اس وجہ سے ہے کہ تو اپنی نزاکت سے باغ میں نہیں جاتا اگر تو اپنی نزاکت سے باغ میں جانے کی اجازت مانگے تو روئے گل سے رنگ اڑنے کی اجازت طلب کرے ؎

تو نزاکت سے گلستاں کی جو رخصت مانگتا ؂ رنگ روئے گل سے اڑنے کی اجازت مانگتا

گلوں کی پردہ دری کیا ہوئی تمھیں منظور ؂ جو آج سیر گلستاں کو بے نقاب چلے،

رفتار ناز کا اثر دیکھیے۔

آستین زن ہے لیا کوئی چراغ جا پر ؂ کھا گیا دان روش ناز سے ٹھوکر دامن

قناعت کا فائدہ کس طرح بیان کیا ہے۔

خانہ مستی پہ قناعت ہو جو تم کو میکشو ؂ ہے لبالب بادۂ عشرت خم افلاک میں

اپنی عاشق مزاجی کس انداز سے بیان کی ہے ؎

تو نے شہباز نظر کو جو ادھر چھوڑ دیا ؂ ہم نے بھی طائر دل باندھ کے پوچھو بلند پر دیا

معشوق کے چہرہ کے سامنے چاند سورج ماند پڑ جاتے ہیں اس کو کس طرح کہا ہے۔

جلوہ رخسار تاباں سے وہ رشک ہر ماہ ؂ چاند سورج کو بنا دیتا ہے تارا چاند کو

عشق میں جان نہیں بچتی اس مضمون میں ناسخ کی جدت دیکھیے۔

تنگ ہوں زیست سے ہو جاؤں کسی پر عاشق
کوئی اور اس کے سوا مرنے کی تدبیر نہیں

دنیا کی ہر چیز بے ثبات و ناپائیدار ہے اس مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے ؎

عیاں ہے ہر حباب بحر سے کیفیت دنیا
برائے چشم بینا ہیں ہزاروں جام جم پیدا

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے ایک دفعہ ناسخ کا یہ مطلع پڑھا ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اور کہا کتنا سجا ہوا مطلع ہے مگر ہمارے دل پر کیا اثر کرتا ہے ؟

میں نے کہا اگر اس سے ان کے شاعرانہ کمال سے انکار ہے تو مجھے اختلاف ہے۔ جب پہلے پہل یہ مطلع میں نے سنا تو مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اس سے پہلے کسی نے اس مضمون کو اس طرح ادا نہیں کیا جس اہتمام سے انہوں نے کہا ہے ادائے مطلب کے ان اسلوبوں سے اردو پہلی مرتبہ ناسخ کی بدولت واقف ہوئی انھوں نے نئے اسلوب کی راہیں کھولیں تشبیہ و استعارے کے استعمال کے نئے نئے طریقے بتائے زبان میں ادائے مطلب کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں ۔

ناسخ سے پہلے اردو میں غالب و اقبال کہاں تھے یہ سب ناسخ ہی کے خوشہ چیں ہیں وہ کون سا اسلوب اور مضمون ہے جو غالب نے ناسخ سے نہیں لیا ۔

مرزا صاحب مسکرا کے چپ ہو رہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ ہی نے زبان کو اس قابل بنایا کہ اسمیں ادائے مطلب کی صلاحیت پیدا ہوئی ایک ہی بات کو سیکڑوں طرح سے کہا ہے ایک شب ہجر کے مضمون کے ہر شعر میں انداز بیان کی ندرت دیکھیے ۔

طول شب فراق کے شکوے سے فائدہ
ہم جان بلب ہیں ہم کو امید سحر کہاں

شب فرقت میں شمع کا کیا ذکر
زندگی کا چراغ بجھ گیا ہے

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے
تمام رات چراغوں سے دل کے داغ جلے

روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا چرخ خلق — صبح میری و شام غم کو امتحاں کرتا نہیں

شب فراق نہ دیکھی نہ دیکھی زلف سیاہ — کبھی نہ ہوش تمہارے فراق میں آیا

آفتاب حشر بھی تارا ہے اس کی شام کا — گردش ایام میں صبح شب ہجراں نہیں

ہے بیاں کسکو شب فرقت میں ہوش — ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں — ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

وصل کی شب ہو چکی اندھیر ہے — شام سے دکھلاتی ہے آزار صبح

وصل میں غائب تو حاضر ہجر میں — دیتی ہے ہر شب نیا آزار صبح

توقع ہے شب فرقت میں مجکو صبح ہوئے گی — معاذ اللہ کتنا موت سے انسان غافل ہے

رات ایسا انتظار یار میں بیتاب تھا — بستر گل نہ تھا میں اگ پر سیماب تھا

رات مجکو تیرے آنے سے جو مایوسی ہوئی — انتظار مرگ تھا یا اشتیاق خواب تھا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں — سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

ہے شب ہجر تا ابد نہیں صبح — نہ رہا خوف روز محشر کا

صنعتوں کا استعمال صنعتوں کے استعمال سے وہ شعر میں جس طرح لفظی و معنوی حسن پیدا کرتے ہیں اس کی تعریف نہیں ہو سکتی ہے

کشتی اس کی نہ ڈوبے صورت موج — جو کہ طوفان کو ناخدا سمجھے

کتنا بلند خیال ہے اس کو کتنی روانی اور فصاحت سے پیش کیا ہے اور کشتی - موج - طوفان - ناخدا سب جمع کر دیا ہے

سیر خشکی و تری گھر میں میسر ہو جائے — دل اگر آئینہ ہو جائے سکندر ہو جائے

وحشیو کھینچی ہے زنجیر آواز بلند — بستہ عقل جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

چلا معلوم ہے یہ جبراً تو بول اٹھی تقدیر — بلائیں پڑنے کو کچھ اختیار دیتا جا

کس قدر بلند مضامین ہیں ان کو کس روانی برجستگی صنائع و بدائع اور طرز

ادا کی ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے اور سنئے ؎

اے اجل ہی تو نے باہم سے اگر نجات دی تھا
کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا انبار تھا

عشق جب کامل ہوا ہے جیلنے حس
آگ میں پڑ جائے جو سنے آگ ہے

نکتہ آفرینی ملاحظہ کیجئے ؎

ہمارے کیف کو کچھ خوف احتساب نہیں
خیال چشم ہے پیالہ ساغر شراب نہیں

جانب رحمت حق دھیان ہے لبس رندوں کا
شاد ہو جاتے ہیں کیا دیکھ کے میخوار گھٹا

جینا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں
مدت ہوئی کہ ہے مر چکے ہیں ہم حساب سے

محذوفات سے ندرت ان کا ایک خاص اسلوب الفاظ و فقرات کے حذف سے بیان میں ندرت پیدا کرتا ہے ؎

ہر ایک کی صدائے قدم ندر زونی ہے دل
بہتر ہے مجکو پاس ترے انتظار سے

وہ بدگمان سمجھتا ہے چاند کا مشتاق
کبھی جو ہم سوئے گردوں نگاہ کرتے ہیں

فصل گل ہیں چار دن ایام توبہ ہیں مدام
عمر بھر اے میکشو باب اجابت باز ہے

آتا ہے رشک اے دل پر آبلہ تجھے
کیا جلد پھوٹتا ہے پھپھولا حباب کا

اشاریت اشاریت کے معنی ہیں ایک نازک کنایہ سے ذہن کا معنی کی طرف منتقل ہونا اداے مطلب کی اس ندرت سے لطف معنی بڑھ جاتا ہے اور یہ شاعری کا بڑا نازک مرحلہ ہے ناسخ نے اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی ؎

نور مہتاب ہے دھوئیں کی مثال
ہائے کیا آج رات کالی ہے!

خلل پذیر ہمیشہ ہے کارخانہ عقل
کبھی نہ خانہ زنجیریاں خراب ہوا

ابہام کسی بات کا واضح طور پر نہ کہنا ابہام ہے شاعری میں ابہام اسی وقت لطف پیدا کرتا ہے جب وہ سیکڑوں وضاحتیں اپنے دامن میں لئے ہو نہیں تو مہمل ہے ناسخ نے

اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال اُردو میں کوئی نہیں ہے

دل اس بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے　　خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

حیات و کائنات کے مسائل | زندگی کی تلخ حقیقتیں کس شاعرانہ انداز میں بیان کی ہیں

عالم ہے محو آئینہ خانہ کی سیر میں　　اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں!

تمام صفحہ عالم ہے ایک ہی صفحہ　　سر کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

موسم گل کر گیا پرواز باغ دھر سے　　یاں ابھی تنکے ہیں بہر آشیاں منقار میں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب　　یاں اعتبار دوستی جسم و جاں نہیں

ہمصفیر دیکھنا قسمت چلی آئی ہے کیا　　اُڑ کے گلشن کو جو بعد ذبح اپنے پر جلے

ہم میکدے میں آئے تو خالی نظر پڑے　　رہتے تھے خم شراب کے اول بھرے ہوئے

ذکر پرواز تو کیا تنگ ہے اتنا یہ چمن　　پھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہپر اپنا

روزمرہ اور سادگی دیکھیے

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں　　دل نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

وصل میں بھی ہائے جس دل کو نہ آتا تھا قرار　　اے فلک تو نے کیا اس کو گرفتار فراق

تجھ سے انصاف تو کر چھوٹ نہ سکا ایک عجب　　میں نے کیونکر تری الفت میں زمانہ چھوڑا

ہوں وہ غم دوست کہ سب اپنے ہی دل میں رکھتا　　غم عالم کی اگر دل میں سمائی ہوتی

صحن گلشن میں جو اس گل کی سواری آئی　　سمجھے مرغان چمن باد بہاری آئی

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے من گئے　　بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے

فراق یار میں فصل بہار آئی ہے　　الٰہی آتش گل سے تمام باغ جلے

تمثیل | ان کی بڑی خصوصیت تمثیل ہے جس میں انھوں نے صائب کو بھی پیچھے ہٹا دیا اور ایسی نادر تمثیلیں پیدا کیں جن کا مثل اُردو میں نہ تھا ہے

عشق سے کس کے دل کو لاگ نہیں　　کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو — صدمہ شیشہ کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

رہتا ہے کہاں ساتھ برے وقت میں کوئی — پتھر کو لگی چوٹ تو شرارے نکل آئے

آزاد ہوں قیود سے افتادگان خاک — اڑتا پھرا شجر سے جو برگ خزاں گرا

شوخی ان میں سنجیدہ ظرافت اور متین شوخی بھی تھی جو خاص لطف پیدا کر دیتی تھی ؎

خبر کرے کوئی زاہد کو آئے بہر مدد — شکست توبہ کو پھر موسم بہار آیا

کعبہ ہی میں جا کے بیٹھ رہو گو یہیں بیٹھنا — تو در سے نکالے گا اسے بت اگر مجھے

مے پرستو آؤ کر لو محتسب کو سنگسار — بچ رہے ہیں سنگ کچھ میخانے کی تعمیر سے

توڑی واعظ نے اگر گردن مینا ناحق — مے پرستو نے بھی مسجد کا منارہ توڑا

صبحدم جب صحن مسجد میں اذاں ہونے لگی — ہم نے بھی میخانے کے دروازہ پر آواز دی

جو ہم فنا ہوں تو لازم ہے اے نظر بازو — ہمیں بھی یاد کرو جب کوئی حسین دیکھو!

تصوف ان کے یہاں تصوف بھی ہے مگر وہ تصوف نہیں جو سمجھ میں نہ آئے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے مسلک شاعری کی مطابق بہت صاف اور واضح ہے ؎

سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا — جس کی خواہش تھی وہی ہر سو نظر آیا مجھے

تو کسی سے نہیں ہے بیگانہ — پر کوئی آشنا نہیں تجھ سے

کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے — نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھئے — تصویر کس کی ہے ورق آفتاب میں

تغزل غزل کا تیکھا پن ملاحظہ ہو ؎

بھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آجا کبھی — میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

تری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت — ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

گیا وہ چھوڑ کر رستہ میں مجھ کو — اب اس کا نقش پا ہے اور میں ہوں

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں — ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

دل ہی اس کا جانتا ہے جس پہ گزرا ہے یہ حال　　عشق کا صدمہ زبانوں سے کہا جاتا نہیں

آسماں پر دل فرشتوں کے ہلے جاتے ہیں آج　　یہ زمیں پر پاؤں رکھنے کا نیا انداز ہے

چلنے سے عمرِ رواں اپنی ٹھہر جاتی ہے　　جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے

سو رمز کی کرتا ہے اشارہ دس فتہ باتیں　　ہے لطف تکلم سے خموشی میں زیادہ

سو رقص سے افزوں ہے پری رو تری رفتار　　پاؤں کی صدا لاکھ ترنم سے زیادہ

پوچھ اے ناصح نہ کچھ میری اداسی کا سبب　　اب میں خود دن رات حیراں ہوں ہوا ہے کیا مجھے

بیٹھ جاتا ہوں جگر تھام کے میں دیوانہ　　وہ پری رو مری محفل سے جہاں اٹھتا ہے

دل کو تھامے ہوئے بیٹھے ہیں جو ہم فرقت میں　　ہم نشیں آج بہت دردِ نہاں اٹھتا ہے

دل دوڑتا ہے کوچۂ دلدار کی طرف　　جب سے نہیں ہے طاقتِ رفتار پاؤں میں

زبان کی یہ صفائی، بیان کی یہ سنجیدگی مضامین کا یہ تنوع طرزِ ادا کی یہ جدتیں مضمون کی یہ خلاقی۔ تمثیلات کی یہ شان صنعتوں کا یہ حسنِ استعمال نہ میر کو نصیب تھا نہ سودا کو یہ اردو میں بالکل نئی چیزیں تھیں۔ انھیں کو دیکھ کے مصحفی مقلد ہوئے غالب کو ان کی نثریت محسوس ہوئی نقاد ان سخن نے میر و سودا کے کلام سے مقابلہ کر کے فیصلہ کیا کہ ناسخ نے اس پر خطِ نسخ کھینچ دیا اور "در ریختہ طرحِ نوی ریختہ"

بعد کے شعراء نے اس طرحِ نو کی پیروی کی غالب نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہم نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا ان کے بہترین اشعار وہی ہیں جن میں وہ ناسخ کی زبان و شاعری کے تتبع میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ص

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا　　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا　　غالب

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو　　یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا — غالب
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا — ״
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا — ״
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا — ״
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں — ״
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا — مومن
میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا — میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا — ״
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا — ״
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا — ״
ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں — ״
ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو — ״
برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو — ״
اک لحظہ نہیں قرار مجھ کو — موت آئے بس ایسی زندگی کو — ״
کوئی نہ رہا جو پوچھے آنسو — کیا روؤں میں اپنی بےکسی کو — ״

معلوم ہوا کہ ناسخ نے زبان و شاعری میں جو انقلاب پیدا کیا اس کو لوگوں نے زبان کے اعلیٰ معیار فصاحت و بلاغت پر پہنچنے اور شاعری میں ادائے مطلب کی جدتوں تشبیہ و استعارہ کی ندرتوں مضامین کی وسعتوں خیالات کی بلندیوں تہذیب و شائستگی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے پسند کیا ان سب کی تفصیل آپ سن چکے۔ مصحفی۔ غالب اور سعادت ناصر خاں نے ایک بات اور کہی ہے کہ وہ پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔ اس پرانی ناہموار روش کو جب تک آپ نہ دیکھیں گے لکھنؤ یا ناسخ کی ہموار روش کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناہموار روش مضمون آبرو و میر و سودا سے مصحفی و انشاء جرات و رنگین تک باقی رہی اس لئے ناسخ سے پہلے کے تمام ادوار کا کلام دیکھئے۔

اُردو شاعری کا ابتدائی دور

آبرو۔ یکرنگ۔ مضمون۔ ناجی۔ حاتم۔ آرزو۔ فغاں۔ مظہر

مجھے درد و الم گھیرے ہے نت میرے میاں تھا
انداز سے زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
دل لہو لوں ڈرے ہے زلف کا مارا بھونگ سین
مکھ مس چرچا غیر سے جا کر چھپو نہ رچھوڑ دی
ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے !
چھپ کر نگاہوں سے اس طرح آ پلنگ پر
کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن
یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط
انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج گر ہوتی
ز لو کو ملا کو کر خطر رکھتا یا منڈاتا ہے
لیا اس گلبدن کا ہم نے بوسہ !
کئی عالم کئے ہیں قتل ان نے
دریائے اشک اپنا جب سر پر اوج مارے
مرشح خرابی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو !
مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے
کھا پیچ و تاب اب وہ ڈسیں مجھ کو کالیاں
نہیں آتا اسے تکیہ پہ آرام ۔
الم سے یاں تلک دوشیں کو آخر ہو گئیں سودا
لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر

خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں تم تھا آبرو
جو خال اپنی حد سے بڑھا سو سیاہ ہوا ۔
رُخ سے اڑ وعا کا ڈیلے خون ڈھلا ۔
گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا گیا ٹوٹا ہوا ""
یہی غنچے کے دل کی گل جھڑی ہے ! ""
کوئی سنہ زیبا ہے تیرے قدم کا کھٹکا ""
گر غیر سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں۔ یکرنگ
رکھتا ہوں میں دو تین کہو تو نذر کروں ""
جنھوں کی ان کے پنچی اٹھو ہے وہ ایک جھلکے مضمون
مرے نشہ کی خاطر لطف ہے سبزی بنا ہے ""
تو کیا جو مار رقیبوں نے بھگایا ہے حاتم
کرے گیا اکیلا حاتم بچارا ""
طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے آرزو
بہار حسن کو دی آگ اس نے جب چڑھی بخار ""
آمرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے فغاں
ظالم اسی لئے سے زلفیں جیسی پالیاں ""
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے مظہر
ڈبو لیا ہائے آنکھ نے مسخرہ کا فرکتا پیار
فی الحقیقت جل گھر گیا مظہر

اُردو شاعری کا عہدِ زریں

میرؔ ۔ سوداؔ ۔ دردؔ ۔ سوزؔ

یہ اُردو شاعری کا تدریجی دَور کہا جاتا ہے اس لئے ہم اسے تفصیل سے پیش کرینگے

تغزل

کہتے ہیں لوگ یار کا ابرو پھڑک گیا ۔۔۔ تیغا سا کچھ نظر میں ہماری سڑک گیا سوداؔ
ماہ نو تجھ یادِ ابرو میں ہے سینہ کا خراش ۔۔۔ کس بسولے سے ہے کم یہ ہر مہینے کا خراش ״
ملے جب ہم سے گیا ہو کر خفا وہ تند خو ۔۔۔ غنچۂ دل کی کھلی پھر نہ کلیاں دیکھیاں ״
دشنام دیکے ملے وہ جدھر کا کھیچتا ۔۔۔ چبھتی ہے میرے دل میں وہی آن آن آن ״
مژہ اس چشم کا کھٹکے ہے دل غمزوں میں ۔۔۔ نشتر میرے لہو کی پڑی جیجوں سی ہیں ״
کیونکر نہ چشم و ابرو سے ہو قتل دل مرا ۔۔۔ دو ترک مست لیکے جو تیغا بلا کریں ״
خون جگر کا کھانا دل پر نہیں گوارا ۔۔۔ اس ترش ابرو کی جب تک نہ ہوئے چٹنی ״
آہ کس طرح تری راہ میں گھیروں کہ کوئی ۔۔۔ سدرہ ہو نہ سکا عمر چلی جاتی کا ״
اس کنج لب پہ چپکے ہوئے منہ کو رکھے ہم ۔۔۔ دلچسپ اس مقام پہ حرف و کلام کیا ״
دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا ۔۔۔ لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ میرؔ
مت آنکھوں ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر ۔۔۔ غمزے ہیں بلا ان کو نہ سکار دیا کر ״
ہیکے سنگ مزار پر فرہاد ! ۔۔۔ رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد ״
ہم وحشیوں سے مدت مانوس جو رہے ہیں ۔۔۔ مجنوں کو شوخ لڑکے کہنے لگے ہیں کاکا ״
طاقت نہیں ہے دل میں نے دل بکار ہا ہے ۔۔۔ کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے ״
ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی ۔۔۔ کہاں ہم کہاں تم کہاں زندگانی ״
ہوا جاتی رہی وعدہ ہی تو فک نگانی کی ۔۔۔ جو اب بھی سو رہو مل کر تو جاڑا ہے دلا کا سودا

لباس اور سامانِ آرائش

دندان و لب پہ ساکھ تھا نیم جاں میں لیکن — مسّی دو انگلی مل کر کھایا جو پان مارا سودا

شکل تری کے میاں بنے ہیں کتنے آن کے — منھ کی مسّی ریکھ کی لالی کے لب پہ پان کے ؍؍

اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک — جوں خوش جنبشوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں ؍؍

میں دیکھی دشمن ایمان لٹک پلی گوشہ میں در کی — نگاہِ سرمگیں کے کیا کہوں جادو کی تھی ترکی ؍؍

پان کھا کھا کے آرسی کے بیچ — اپنے ہونٹوں کو دیکھنا لالی ؍؍

جلوہ ماہ تہ ابر تنک بھول گیا — ان نے سوتے میں دوپٹے سے جو منھ کو ڈھانپا ؍؍

کیا بدن دیکھا ہے جیبی سے ہائے — مار حسرت ہی کے ہم جان سے گئے میر

چلے ہیں مونڈھے بھی ہے کہنی بھی چولی کی تنگی ہر — بیت قبا اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو تنگ آیا ؍؍

سیر کے قابل ہے یہ تنگ پوشی ان کی — کہنیاں پھٹی ہیں چولیاں جیسے ؍؍

لطفِ قبائے تنگ پہ گل کو بجا ہے ناز — دیکھی نہیں ہے ان نے تری چولی چست ابھی ؍؍

چولی جہاں سے مسکی پھر آنکھیں وہیں جھپکیں — جب پیرہن لگ بھی اس کی چولی چس جاوے ؍؍

ناز و نیاز[1]

مجھ جاؤ لطف ہے تیرے پر کہیں گے نیک و بد — بے وفائی اس سے کرنی تھی غلامی سے بعید سودا

جو کچھ کہ نہیں ہو عاشقوں میں تیرے — بولا وہ مسکرا کے یہ نہ کہو ؍؍

لیتا ہے تو کسی کا تو دل لے سمجھ بوجھ — باندی نہ جان اس کو بلائے سمجھ بوجھ ؍؍

ہر دم تو مجھے اپنے کوچہ سے نکالے ہے — جاؤں کہاں بھلا اب میں لا دل مرا ادھر دے ؍؍

دل سی تم چیز کو بے قدر کئے دیتے ہو — کیا میں تم سے کہوں افسوس بتا یاں بتاں ؍؍

مول لیتے ہو جو اس دل کو تو لو ہیں لیے — تم دے دام مجھے اور ہیں پھر پیچھے پتا ؍؍

تم جس کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے اُس کی — لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں ؍؍

---

[1] بعض لکھنوی حضرات نازو نیاز کو معاملہ بندی کہتے ہیں اہلِ لکھنؤ کے نزدیک یہ مکروہ لفظ ہے۔

خواہ کعبہ میں تجھے خواہ میں بتخانے میں
یاں تک ستا نہ مجھ کو کہ رو رو کہے تو ہائے ہائے
پوچھا کسی نے مارا تو سودا کو کس لیے
راتوں پاس پاس گلے لگ سوئے ننگے ہوکر

اتنا سمجھو ہو مرے یار کہیں بیٹھا ہے — سودا
یار دوزخ تم سنا کہ فلانے نے کیا کیا — ،،
بولا مجھے وہ گھورتے تھا ہر آن آن آن — ،،
دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم شرماتے ہیں ہنوز — میر

روزمرہ

چاہو تو کوئی بھر کے اٹھا لو تمھیں ابھی
اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ
بات کہو کیا چپکے بیٹھے ہو یہاں آ کر!
تاہاہی کرتا رہے گا اسکا عزو دو بیدا کی
جو بتیں بڑی بنتی ہیں دیکھا میں گلستاں میں
لطف آنے کا ہے کیا بس نہیں اب تا بہ جفا
میں کہتا ہوں کہ دل تجھ سے لیا کون ہے وہ
جب کہا میں کہ تو ہی ہے تو پھر کہنے لگا
چھن گیا سینہ بھی کلیجہ بھی !!
کیوں تری موت آئی ہے گی عزیز
حال کہہ چپ رہا جو میں بولا !
میں کہا میر جان بلب ہے شوخ
کہنے لگا نہ دا ہی بک اتنا !
مرحمت دشمنا غفلت ہے نیا ہا !
میاں دل بھائی دل او مہربان دل
خدا جانے ہے اس شوخ سے کیا

کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو — میر
کاہے کو یوں کھڑے ہو وحشی سے بیٹھ جاؤ — ،،
ایسے گونگے بیٹھو ہو تو بیٹھے اپنے گھر جا کر — سودا
گھگھیا سے اب کیا حاصل نہیں خبر یہاں آ — ،،
تجھ قد سے خجل ہو کر شمشاد بہت رویا — ،،
اتنا عالم بھرا ہے جاوے کیا ہی ہو — ،،
یک بیک بولا اٹھا اسطرف آپ ہی ہوں — ،،
کیا کریگا تو مرا دیکھو تو جائیں ہی ہوں — ،،
یار کی تیرے جان لے جا بھی — ،،
سامنے سے مرے ارے جا بھی — ،،
کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا بھی — ،،
کر نے کوئی خبر کو بھیجا بھی !! — ،،
کیوں ہوا بستری آئے جا بھی — ،،
ادھر تک دیکھ لیجو مڑ کے آیا ! — ،،
مجھے تو چھوڑ کے جاتا ہے کہہ دل — ،،
اے میرے لال میرے بے زبان دل — ،،

ہجر و فراق

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی !
ناچار میر منہ کو کری مار سو رہا

آشفتہ ہو جو اس کی پریشاں خراب حال
دیکھو مجھے تو خبطی دیوانہ سڑا کہو سودا

ملا جو عشق کے جنگل میں خضر میں نے کہا
کہ خوف شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا

جب غبار اپنے جی کا نکلے ہے !
دیر رہتی آندھی کیسی دھوم

خمریات

جب پیر مغاں سے میں جا دختر رز مانگی
بولا کہ سو تو دیتے پر وہ ابھی بالی ہے

تقیہ ترک مے سے مجھ کو روز و ہیں ہے اے زاہد
جو چپکے سہو سے گاہے تو پی جاتا ہوں تو وہ بھی

دختر رز سے ہمارا باندھ دے گر تو نکاح !
خوب سا کھلوائیں اے ملا تجھے شکرانہ ہم

شیخ و واعظ

کیا شیخ اکھاڑے گا بھلا شیخ تو دیکھیں
رندوں کو دھر آتا ہے جو ریش اپنی پکڑ کر لے

یہ داڑھی تیری واعظ مسجد ہی میں منڈوا آتا
پر کیا کریں ساتھ اپنے جام نہیں رکھتا

کچھ بھی نسبت نہ تھی جب پیر مغاں تھا یہ شیخ
ہم حرم میں بھی تو ترے داماد رہے

بیٹھے جو ہم مست آ گئے سو بار مسجد سے اٹھا
واعظ کو یہ ہے خوف کہ بس لگ گیا جلا

شیخ طینت سے نہیں ہے خالی شیخ
اس کی پیدائش احتلام سے ہے

رقیب

نبھے ہے اس طرح تو مجھے دیکھ کر رقیب
جوں ہے کی بھانت جاتا ہے نظر وال پر بیٹھ

جوں توں لاٹھی ٹیکتا آتا ہوں تو وہ آپ کو بچے
رقیب آگے ترے مرے ہے مجھ سے پنڈلی سی گھڑی

اے خیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہے

حیات و کائنات کے مسائل

انھیں طول و ظلم کتا ہے میر نہ سفلہ پرورش
صدائے گرناخیے جنبش فہم ہے ٹیر کی

خطرہ ہے تجھ سے مسند شاہی کو اے فلک
حاضر ہے پوست تخت مرا پشم توا کھاڑ "سودا"

یہ دیکھ جاہ دنیا کا نہیں کم مال زادی سے
کہ اس پر روز روتے ہیں سیکڑوں جیسے اتر تے ہیں

تعجب ہے اس جہاں کی کوئی خلاص ہو گا
اس فاختہ یہ سب کو امساک ہو گیا ہے "

مال دنیا سے ہے کیا بہرہ ہمیں
پاس رنڈی ولے ہے ضعف باہ "

ان اشعار میں مضمون آفرینی ہے مگر کیا بات کہیں اور کس طرح کہیں کا شعور مفقود ہے الفاظ، مضمون اور طرز ادا سب میں بھونڈا پن اور ابتذال ہے اور دو تہائی سے زیادہ کلام ان لوگوں کا ایسا ہی ہے اس پر مستزاد طولانی غزلیں بلکہ دو دو سہ غزلہ قافیے بھونڈے ردیفیں لمبی جن سے زمین ناہموار اور سخت ہو جاتی تھی اور اسی میں شعر کہنا استادی سمجھا جاتا تھا کچھ ردیف و قافیے میر و سودا کے دیکھئے۔

جبیں میرے پر	کہیں میرے پر	پاتار فلک پر	گزار فلک پر
مہمان بھی رات	جان بھی رات	آب دریۂ آب	داب دریۂ آب
بیمار دن دو چار میں	گلزار دن دو چار میں	سیلاب آتش کا	سیلاب آتش کا
آہنگ اور سنگ	رنگ اور سنگ	گل کی اشارت	بلبل کی اشارت
سنگ و خشت شکستہ	رنگ و خشت شکستہ	گنہگار نہ ہو وے ہو	تلوار نہ ہو وے ہو
گل میں سمجھو تو کہوں	بلبل میں سمجھو تو کہوں	چھاتی ہے میاں	جاتی ہے میاں

دیہاتی اور گنواری لفظیں بے محابا استعمال کرتے تھے۔

وہ نوسل گڑ کے آن میں جاتے ہیں تاؤ سے
دل داغ ہو رہے ہیں چمن کے سبھاؤ سے

غرور اتقوی سے کہتے تھے شیخ جی سرکش
پر اب عمامے تلے گردن تنگ نوالی "ہے

ہوئے جو شیخ کبھی وار دہو اگر اس کے
"پت" رہ گئی کہ ان آنکھوں ہی میں دھرا یا "

ہم اپنے چاک جیب کو سی رہتے یا نہیں!
"بھاڑ" میں پاؤں دیے کو لے کہاں سے تم

آیا ہے زیر زلف جو رخسار کا سطح !　　پان سانجھ کے تمن بھی سحر کا سماں ہے آج

دل ہی کے غم میں گذرے وہ سن دن جو تم رہتے　　"اینچ" ہے اس نگر سے جاتا نہیں ؛ ناجی

گو وہ ہر جائی اسے اپنا اور　　ہر طرف کو گمان جاتا ہے

تذکیر و تانیث کا شعور نہ تھا

بود نقش و نگار سا ہے کچھ　　صورت اک اعتبار سا ہے کچھ　میر

شب اسی کوچہ میں جاتا ہوں اس توقع پر　　کہ اک دوست ہے وہاں خواب پاسباں میرا

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا　　موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کی

جا ڈوب گئی کا اپنی اندوہ کے دریا میں　　سے جوشی کہاں اب ہم موت ہو گئی

ایک ہی لفظ کو مونث بھی باندھتے تھے اور مذکر بھی۔

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا !　　کچھ اسی میں ہمارا وارا تھا !　میر

پھرتے پھرتے تلاش میں اس کی　　ایک میرا ہی کیا لوں نہ جان گیا

سیکڑوں جیسوں کا جان گیا　　پر نہ تیرا یہ امتحان گیا

ہر چند جانیں جاتی ہیں پر تیغ جور سے　　تم کھائے سر کی سون تم ہاتھ مت اٹھاؤ

اب جان جسم خاک سے تنگ آ گئی بہت　　کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

خاطر کی بھی رہتی ہے پھر جان چمن ہی میں　　گل آئے یہاں وہ بھی جب فصل خزاں آیا

زنانی اور مردانی بولی میں فرق نہ تھا اللہ کی سون دیا تو لیں میں اب بھی عورتیں بولتی ہیں
محاورہ استعمال کرنے کا شوق لطف زبان کے بجائے بھونڈا پن پیدا کر دیتا تھا۔

ناصحا کچھ یہ نصیحت سے نہیں ضبط سرشک　　طفل ٹھہرے نہ کبھی ہوتے کے ڈیوڑھے باہر

گر قصد ادھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا　　یہ دیر ہے زہاد نہ ہو خانہ خدا کا

راحت پہنچی تم سے تو ٹک اٹھایا برسوں تک　　سر سہلاتے ہو جو کبھی تو بھیجا بھی کھا جاتا ہو

کام میرا ترے غم میں جب کہوں ہو جائے گا　　میں یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ ہوں ہو جائے

صنعتوں کے استعمال کا بھی سلیقہ نہ تھا

چوڑائی میں ملک اپنی عدد اور بھی جم لے — لمبا کروں ہوں دیکھ تو کیا تجھے دم لے سوداؔ

طائر فریب کیسا ہے وہ شکار پیشہ — مرغان باغ سارے گویا ہیں اس کے سار میرؔ

دہقاں پسر وہ ہم سے یوں صلح کب کئے ہے — لو ٹوں کے کھیت اوپر جب تک نہ جنگ ہو لے

وہ تو بچی کا ہرگز لکھے نہ ہم کو نامہ — گدڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گولے ،،

تم نے دیکھا ہوگا بچپن میر کا — ہم کو تو آیا نظر وہ خام ہی پہل ،،

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر — پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم ،،

ضروری علامتیں حذف کر دیتے تھے ؎

دن رات ہر پلک نے مری چھڑی لگائی — کیا جانے آنکھ تجھ سے میں کس گھڑی لگائی ،،

فارسی الفاظ کے صرف کا بھی سلیقہ نہ تھا ؎

دل جو پر بیقرار رہتا ہے — آج کل مجھ کو مار رہتا ہے میرؔ

محاورے کا صرف بھی نہیں جانتے تھے ؎

پوچھ کر حال تو پھر سنتے نہیں — بس مجھے اور نہ بکوائیگا میرؔ

ان ناہمواریوں کے ساتھ امرد پرستی آپ کا موضوع غزل بنتا اور اس حد تک ؎ تھے زمانہ میں جن کے خرچے روپیہ — ٹھانسا کرتے تھے ان کو آنوں پر میرؔ

ان سب پر مستزاد ہجو جس کی بنیاد فحش پر تھی مرزا مظہر جانجاناں جو عالم صوفی منقیہ سب کچھ تھے ابرو کو کہتے ہیں ؎ ابرو سب شاعروں کی جھانٹ ہے

ابرو کا جواب ؎ جانجاناں لشم ہے

سوداؔ ضاحک کی ہجو یوں کرتے ہیں۔

ضاحک نے تب کہا یوں مجھ پاس کب ہیں گوڑے — جو تب شیخ سعدو لولا سستا دے۔ کے

فدوی سودا کو کہتے ہیں ؎ بھڑوا ہے مسخرہ ہے سودا سے ہوا ہے۔

مصحفی و انشا کا دور

اس دور میں زبان کچھ صاف ہوئی مگر مضمون کا بھونڈا پن بیہودگی ابتذال باقی رہا دو غزلہ سے چو غزلہ تک کی نوبت آگئی ردیف قافیہ کی ناہمواری اور بڑھ گئی انشا کے دیوان سے صرف ردیف الف کے کچھ ردیف و قافیے دیکھیے

بچھایا بسترا — بنگایا بسترا
بنارے غش کیا — قرار نے غش کیا
جھٹ سے غش کیا — غٹ سے غش کیا
رنگ میں کیڑا — رنگ میں کیڑا
تختوں کی ہوا — بختوں کی ہوا
چراغ ٹھنڈا — دماغ ٹھنڈا
سیماب کا گٹکا — بیتاب کا گٹکا
قلفل کا منہ چڑھایا — بلبل کا منہ چڑھایا
برآں یہ گالی دینا — نقصان یہ گالی دینا
ادھیڑے جا — چھیڑے جا

دس پانچ غزلیں ایسی ملیں گی جن کی ردیف و قافیے مناسب ہوں پورا دیوان اسی طرح کی ردیف و قافیوں سے بھرا پڑا ہے ان میں کوئی اچھا شعر کہنا ممکن ہی نہیں۔

مضمون اور انداز بیان کا بھونڈا پن اور ابتذال دیکھیے

منظور ایک بات اگر ہو تو آئیے
گلشن میں اک کنارے پہ چھپ چھپا کے خوب

کب چاہوں ہوں میں صرف ملاقات کی ٹھہر
جب خوش ہو مرا دل کہ جب اس بات کی ٹھہرے

بھلا آپ شرمائے کس واسطے
کبوتر کا باہم جو جوڑا لگا

اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا
کوئی رنگین بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہے

کچھ تو اکتا کے سا کھا جبیں پہ چین دے کے
گالی دے کر یہ کہا ان نے کہ ہاں رہتا ہے

جب میں نے کہا کہ مجھ کو تم سے
ملنے کا ہے اشتیاق بے حد

یکبار وہ کھلکھلا کے رنگین
بولے کہ چہ خوش چرا نباشد

یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ
پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آ جائے گا

یار کا در پر نکلنا اس دل بیتاب سے
کوئی ہو گر جھوٹوں کہے گا تو یہ ڈر جاتا

مت یہ گھبرا کر کہو اب گھر کو بندہ جائیگا — کوئی مرجائیگا صاحب آپ کا کیا جائیگا [1] جرأت

ڈوبے یوں بحر محبت میں کہ اب جیتے جی — اپنا دشوار ہے اوپر کو اچھل کر آنا ،،

در پئے دل کہنا مرا شاید کہ اس نے سن لیا — ورنہ کیوں مجھ کو دھراتا ہے سمجھا کیا ،،

کل جو رونے پہ مرے ٹک دھیان اس کا گیا — ہنس کے یوں کہنے لگا آنکھ میں کچھ پڑ گیا ،،

جان بلبل سی سمجھی ہے وہ مجھے یوں بولا — میری بیزار ہے مٹنے دو پڑا مجھ کو کیا ،،

شب گھر جو رہا مرے وہ مہمان ! — تھا صبح یہ کس ادا سے کہتا ! ،،

طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے — قربان گیا یہاں کا رہنا ! ،،

شب کیا وہ چپکے چپکے وہ شوخ و شنگ بولا — دیکھو نہ ہم رہیں گے گر پھر پلنگ بولا ،،

تجھی سے ہم کو کہتا کہ چل بے وال سے ہو جا — معلوم اس کو جن روز [illegible] ،،

اپنے کوچہ میں مجھے دیکھا تو یہ کہنے لگا — تو جو یاں رہتا ہے جرأت تیرے گھر کو کیا ہوا ،،

جب میں نے کہا او بت بدنام ادھر آ — تب کہنے لگا چل بے او بدنام پرے جا ،،

میں نے جو کہا ایک تو بوسہ مجھے دیدے — بولا کہ زباں اپنی کو تو تھام ارے ! ،،

ہوں گے دم میں تہ و بالا کونین — آپ نتھنوں کو نہ پھڑکائیے گا ،،

بیٹھے پیچھے مرے چلنے سے رکو مت صاحب — کوئی پوچھے تو یہ کہیو کہ مرا نوکر ہے ،،

ایسے سیکڑوں شعر ان کے یہاں سے اور پیش کئے جا سکتے ہیں اس وقت کی شاعری یہی تھی اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صاف اور سنجیدہ شعر بالکل نہیں ہیں مطلب یہ ہے کہ ایسے شعر بھی کہتے تھے ان کو شاعری سمجھتے تھے اور اپنے دیوان میں داخل کرتے تھے اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی شاعری میں زبان کی صحت روانی و سلاست فصاحت و بلاغت ہے۔ گنواری اور بازاری الفاظ نہیں ہیں ادائے مطلب میں جدت تشبیہ و استعارہ کی

---

[1] اسی مضمون کا ناسخ کا شعر ہے ؎
ہو گیا قرآں کا پڑھنا غضب ، ورد اسکو لن ترانی ہو گیا

کی نذر تیں ہیں اور یہ خوبیاں رفتہ رفتہ نہیں بلکہ ایکا ایکی انقلابی صورت میں پیدا ہو گئیں اور یہ ناسخ کا بڑا کارنامہ ہے مولانا امداد امام اثر نے سچ کہا ہے کہ اگر ناسخ نہ ہوتے تو اردو زبان و شاعری آج اتنی شائستہ نہ ہوتی۔ یہ فرق ناسخ اور ان سے پہلے کی شاعری کے موازنہ سے واضح ہو جائیگا مگر میر و سودا کے بہت سے مضمون کا ناسخ کے یہاں وجود نہیں جیسے ؎

قدم کے چھونے سے استادگی مجھے سی ہوئی ۔۔۔ کبھی وہ یوں تو مرے ہاتھ کبھی لگا ہوتا ۔ میر
شوخی تو دیکھو آپ کہا آؤ بیٹھو میر ۔۔۔ پوچھا کہاں تو بولے کہ میری فلاں پہ ۔ رر
کیسا اب زہد و تقویٰ دارو بھی اور ہم بھی ۔۔۔ بنت العنب کی اپنا شب کچھ گیا گھر کر ۔ رر
نہ پوچھ کچھ لب تر ساقی کی کیفیت ۔۔۔ کہوں تو دختر رز کی فلاں جل جائے ۔ رر
اثبات کر کے تم سے اک بات اب کہوں میں ۔۔۔ لیکن نہ کہنے لگیو مجھ پہ یہ جو تہا ہے ۔ سودا
سر ریں میں اتنی جھکی لی بذکر جام زاہد نے ۔۔۔ کہ جتنا شیخ کو مذکور انگلاتا ہے شیشہ کا ۔ رر
شیخ وہ رشتہ ہے زنار ہمارا جس نے ۔۔۔ پھاڑ ڈالی تیری تسبیح کے ہر دانے کی ۔ رر
شیخ کو ذوق اچھلنے سے نہیں محفل میں ۔۔۔ اس بہانے سے مٹاتا ہے وہ اپنی جل کو ۔ رر
لے گھسے حجرہ میں خادم کو کہ ہم جا پہنچے ۔۔۔ شیخ صاحب سے کرامات نہ ہونے پائی ۔ رر
عزلت سے نکل شیخ کہ تیرے لئے تیار ۔۔۔ کوئی ہفت گزی میخ کوئی وہ دجبی ہے ۔ رر

ایسے مضامین ناسخ کے یہاں نہیں موازنہ کے لئے ایک موضوع کے اشعار دیکھئے۔

کلامِ ناسخ !

تغزّل

چلا میں صورتِ بدمست ٹھوکریں کھاتا
وہ یوں چلے کہ کوئی ساغرِ شراب چلے

خرامِ ناز تو اس کوچہ گرد کا دیکھو
نہ اس طرح کبھی صحنِ چمن میں آب چلے

دوڑتے ہیں دیکھنے والوں کے دل بے اختیار
ہے غضب اندازِ او ظالم تری رفتار کا

چلنے سے عمرِ رواں اپنی ٹھہر جاتی ہے
جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے

وہ چشمِ فتّاں ہے غیرتِ گل وہ زلفِ پیچاں ہے رشکِ سنبل
عذار میں ہے شباہتِ گل بدن میں عالم ہے یاسمن کا

طائرِ دل تم کو کر دیتے ہیں بسمل کیونکر
تیر رکھتے ہیں نہ پیکاں نہ کمان رکھتے ہیں

لباس و سامانِ آرائش

منہ دیکھیں آفتاب پرست آفتاب کا
سرکا دے اپنے چہرہ سے کونا نقاب کا

رات گھٹتی ہے تو بڑھتا ہے فروغِ آفتاب
حسنِ رخ چمکا جو اس نے زلف کو کم کر دیا

کرے تیرے مسّی آلودہ ہونٹوں کی ثنا خوانی
خدا نے اس لیے اتنی زبانیں دی ہیں سوسن کو

بالے موتی کے ہیں تارے رخِ تابانِ آفتاب
تیرے آنے سے ابھی بامِ آسماں ہو جائیگا

بندہ بالی میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں
وہ ستارہ صبح کا ہے یہ ستارہ شام کا

سرخ پوشاک پہن کر وہ سہی قد جو گیا
جل اٹھے سروِ چمن مثلِ چنار آپ سے آپ

ناز و نیاز

یاسمن دھوپ سے ہوئے گل تر
دیکھو آئینہ میں عذار اپنا

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں تمھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

اب تو جی کھول کے دن رات کرو ظلم و ستم
ناتوانی سے مجھے طاقتِ فریاد نہیں

کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر
بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا

آئینہ دل میں ہے ترا عکس　　دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

خمریات

پیشتر نشۂ ایجاد سے مدہوش ہوں میں　　خم گر یہ دن بھی نہ تھا جب سے کہ مے نوش ہوں میں

کرتے تھے فاش نشۂ میں بد مست سر غیب　　اس واسطے حرام کیا ہے شراب کو

حاجت نہیں نماز کی مستی میں زاہدا　　کیا مرتبہ خدا نے دیا ہے شراب کو

لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے　　فصل وداع ہوش ہے موسم نائے و نوش ہے

حشر تک جی میں ہے بے ہوش رہوں اے ساقی　　کاش مے پھر جائے مری عمر کے پیمانے میں

حیات و کائنات کے مسائل

ہر کسی کام رکھتا ہے ادھورا آسماں　　گر ہم ہیں پا سر شوریدہ تو پتھر نہیں

رنگ عشرت باغ عالم میں نظر آتا نہیں　　گل کو گلچیں کا خطر بلبل کو ڈر صیاد کا

دو روز ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں　　وہ کون سا چمن ہے کہ جس میں خزاں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا　　باغ جہاں میں فصل بہار و خزاں نہیں

جدت ادا

اے پری مکھڑا ملا ہے کیا ہی پیارا چاند کو　　رات میں نے تیرے دھوکے میں پکارا چاند کو

اس کی ہر دم کی نصیحت سے میں تنگ آیا ہوں　　کاش ناصح سے بھی آنکھ اس نے لڑائی ہوتی

تعبیر ہے کہ یار کی پڑ جائیگی نگاہ　　بجلی گری رات کو کل مجھ پہ خواب میں

بے خودی میں یہ کون یاد آیا !　　خود بخود دل ہے بے قرار اپنا !

ہجر و فراق

میں نے یہ جانا کہ میری طرح ہے فرقت نصیب　　آنکھ میں جس کی نظر آیا کوئی آنسو مجھے

مرگ اک سوتی تھی ورنہ یہ کراہا شب کو　　کہ جہاں کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

ناسخ غم فرقت میں یہ ہے حال ہمارا　　جب کھینچتے ہیں آہ تو آتا ہے جگر ساتھ

یاس ہے نظارۂ رخسار آتشناک سے　　آگ لگ اٹھی ہے دلمیں شعلۂ ادراک سے

صنعتوں کا حسنِ استعمال

جس قدر ہم سے تم ہوئے نزدیک
اس قدر دور کر دیا ہم کو!
رہیے وہ گل چمنستان دہر میں شاد
دکھا کے سرو سا قامت کیا نہال مجھے
وحشیو کہتی ہے زنجیر باواز بلند
بستۂ عقل ہے جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

زاہد و واعظ

نہ پائیں زاہدِ بے آبرو شراب کہیں
نہ اپنے ساتھ کہیں کھوئیں آبرو و شراب
کسی نعمت سے ہیں واقف نہیں جز بادۂ تلخ
زاہدا اب تو سمجھ تارک لذات مجھے
عمر بھر دھڑکے عذاب حشر کے
زاہدا تیرا ہی یہ دل گردہ ہے
حسن بھی کیا چیز ہے زاہد ذرا انصاف کر
اپنے بندوں کو خدا دیتا ہے لالچ حور کا
فراق یار میں نفرت ہے مجھ کو بادہ خواری سے
کہیں زاہد نہ کر دے متہم پرہیزگاری سے

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ وہ ناہموار روش زبان کی ناہمواری طرز بیان کی ہمواری مضامین کی ناہمواری لب و لہجہ کی ناہمواری تہذیب و شائستگی کی ناہمواری ہے اس وقت تک ناز حسن اور نیاز عشق کی حکایتوں ہجر و وصل کی کیفیتوں کے بیان کا سلیقہ نہ تھا بھونڈا پن ناشائستگی اوباشانہ لہجہ بیہودہ باتیں بھونڈی زبان اور بھدی ترکیبیں عام تھیں ناسخ نے اس طوفان بے تمیزی کو روکا اور شاعری کا رخ تہذیب و شائستگی حسن بیان لطف زبان اور طرز ادا کی ندرتوں کی طرف موڑ دیا اور ایک ایسا راستہ بنا دیا جس پر وہ آگے بڑھتی رہی۔

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا اسلوب

آتش کا طرز لکھنوی شاعری کا دوسرا اسلوب ہے

ناسخ نے زبان کی سلامت و روانی تہذیب و شائستگی ضائع و بدائع تشبیہ و استعارہ کنایہ اور تمثیل مضمون آفرینی اور طرز ادا کی جدتوں سے شاعری میں جو فضا پیدا کر دی تھی اس سے نکلنا ممکن نہ تھا کیونکہ لطف زبان اور حسن بیان اسی پر منحصر تھا۔

آتش اس معاملہ میں غیر شعوری طور پر ناسخ کے متبع تھے لیکن ان کے یہاں ایک بات اور بھی ہے اور وہ عاشقانہ جذبات کا خلوص حسن و جمال کے تاثرات والہانہ کیفیت ہے

آئینہ سامنے رکھتے تو غش آ جاتا — تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

آنکھ اگر آئینہ سے تم نے لڑائی ہوتی — رات بھر میری طرح نیند نہ آئی ہوتی

جھمک جھمک کے نکلنے کا حال کھل جاتا — کسے دکھاؤں وہ رخ چشم مہر وا نہیں

کسی صورت سے نہیں جان کو قرار اے آتش — طپش دل مجھے لاچار لیے پھرتی ہے

رات بھر کیں دل بیتاب سے باتیں ہم نے — رنج فرقت کے گرفتار نے سونے نہ دیا

تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں — رہا ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبل ناشاد گفتگو کرتے

فراق یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گذری — جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بیتابانہ

شباب تک نہیں پہنچا ہے عالم طفلی — ہنوز حسن جوانی ارادہ میں ہے !

ستم سا حسین ہو یار تو کیونکر نہ اس کے پھر — ناز بیجا و غمزہ بے جا اٹھائیے

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا — کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

ذہنی شاعری | ناسخ کی شاعری ذہنی ہے اس میں ان کا دل شریک نہیں جن لوگوں کو مضمون آفرینی میں لطف آتا ہے ان کا ذہن موجد و فلسفی کے ذہن سے مماثلت رکھتا ہے ان میں جمال کی کرشمہ سازیوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت کم ہوتی ہے ایسے لوگ ناسخ کے دلدادہ ہیں۔

قلبی شاعری | تاثرات کا اظہار قلبی شاعری ہے ایسے شاعروں کا بھی ہر شعر ایسا نہیں ہوتا ان کے یہاں بھی ذہنی شاعری کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مگر ان کی قلبی کیفیت ان کی زبان اور لہجہ میں اثر اور کیفیت پیدا کر دیتی ہے جن لوگوں میں جمالیاتی احساس بیدار ہوتا ہے وہ آتش کے گرویدہ ہیں اور ذہنی شاعری کو پسند کرنے والے بھی اس میں ایک کیفیت محسوس کرتے ہیں کیونکہ بہر حال ان کا دل بھی حسن کی کشش سے یکسر خالی نہیں ہوتا مگر قلبی شاعری کے دلدادہ ذہنی شاعری سے محظوظ نہیں ہوتے کیونکہ وہ دماغ سے ادراک کے نہیں بلکہ دل سے محسوس کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کی اصلی شاعری | یہ دونوں رنگ ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ تک الگ الگ نظر آتے ہیں مگر ان کے بعد کے شعراء میں دونوں رنگ سموئے ہوئے ہیں کیونکہ تاثرات حسن سے تو کوئی دل خالی نہیں ہوتا کم زیادہ کا فرق ہے بعد کے شعراء نے قلب و دماغ دونوں سے کام لیا اور یہی لکھنؤ کی اصلی شاعری ہے۔

ناسخ کی تحریک | ناسخ زبان مضمون لہجہ انداز بیان اور تہذیب و شائستگی کا ایک سیلاب اپنے ساتھ لائے جو تمام خس و خاشاک کو بہالے گیا پھر بھی دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا ردیف و قافیہ کا بھونڈاپن تو دور ہو گیا مگر مشکل ردیف و قافیہ رہ گئے میری جان۔ جانی۔ پستان اور ساق باقی رہ گئی ناسخ کا مصرع ہے ؎

رکھتوں میں ساقی ساق گلفام دوش پر

ان کے شاگردوں نے یہ ناہمواریاں کم کیں بہت سی لفظیں ترک کیں اور شائستگی میں
ایک قدم اور آگے بڑھایا مگر مشکل ردیف و قافیے اور دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا
حسن و عشق کے بیان میں کبھی کبھی متانت و شائستگی کی حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

لکھنؤ کی شاعری کے دوسرے دور (جلال امیر مینائی) میں ردیف و
قافیہ کی ناہمواری کم ہوئی تہذیب و شائستگی بڑھی پھر بھی ایسا مال رہ گیا جس کو
الگ باندھ کے رکھا تھا اور اس سے تہذیب کی نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں۔

تیسرا دور جاوید عارف رشید مرزا رسوا احمد نظم طباطبائی کا ہے اس میں
زمینیں نہایت شگفتہ ہو گئیں ردیف قافیہ کی ناہمواری دور ہو گئی اور شاعری پہلے سے
زیادہ مہذب و شائستہ ...... ہو گئی پھر بھی آ میری جان - جانی منھ میں
زبان ایسی باتیں باقی رہیں۔

چوتھا دور صفی عزیز محشر آرزو کا ہے اس میں زبان و شاعری کی تمام
ناہمواریاں دور ہو گئیں زمینیں شگفتہ غزلیں مختصر اور شاعری مہذب ہو گئی۔ یہ
دور دو سو برس کی شاعری کا جوہر اور ناسخ - آتش کی شاعری کی معراج
ہے اس دور سے بہتر شعر اردو میں نہیں کہے گئے۔

پانچواں دور مرزا جعفر علی خاں اثر کا ہے جو ملک غزل کے تنہا فرمانروا
تھے یہ شاعری کے خاتمہ کا دور ہے کیونکہ اس پایہ کے شاعر پھر نہیں پیدا ہوئے
یہ ہے لکھنؤ کی شاعری کا مختصر جائزہ اس میں ہر دور کے شعراء کا کلام تمام
شعرائے ہندوستان کے لئے شمع راہ رہا ہے اور آج بھی ہے جدید
شاعری کے علمبردار اگر اس کا بغور مطالعہ کریں تو ان کو اپنے اشعار
کے نقائص کا ...... اور شاعری کا فن معلوم ہو سکتا ہے۔

—:—

لکھنؤ کی شاعری

کیا ہے ناسخ نے اسماں سے بلند تر پایہ اس زمین کا

دورِ اوّل

ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ

ناسخ

مست ہے عالم مرے اشعار کی تاثیر سے
مثل مینائے ٹپکتی ہے مری تقریر سے

پھر بہار آئی چمن میں داغ دل اچھے ہوئے
پھر مرے زخم جگر آتش کے پرکالے ہوئے

آنکھوں میں منتظر ہیں عبث پارہائے دل
آتا ہے ناوکِ نگہِ ناز ادھر کہاں!

خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سربلند
آسمان پیش زمیں ہر تواضع خم ہوا

ہو گیا گورِ غریباں میں عیاں حال جہاں
کاسۂ سر جو نظر آیا وہ جامِ جم ہوا

ہر صبح وہی صبح ہے ہر شام وہی شام
انساں پہ ہے زور فقط انقلاب کا

رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دن
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا

ناسخ شراب پی شب تاریک ہے تو کیا
محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا

جلا نہ آتش سودائے عشق سے جیسا
تو واجب اس پہ جہنم کا بس عذاب ہوا

یہ رنگ عارض گل رنگ سے کہ نام خط
پڑا جو عکس ترا آب میں شہاب ہوا

نگہ ٹھہرتی نہیں اپنے · عکس پر اس کی
شعاعِ حسن سے آئینہ آفتاب ہوا

آپ میں دیوانہ چھوڑے ڈالتا ہوں بنا سر
دستِ نازک سے نہ مجھ سے صنم پتھر اٹھا

خاک میں ملتا ہے بے غیرت جو روتے ہیں ہم کو غیر
اس گلی سے بس ہماری خاک کو نے صرصر اٹھا

ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں
ملی ہے عقل لیکن بخت برگشتہ ہے عاقل کا

[illegible] + [illegible]

عالم اسباب میں اسباب ہیں عزت کے
خلق کی آنکھوں میں ہی جا ہے جو بھاتا و قہر خوب

کیونکر بتوں کی خاطر نازک کو توڑنا
گلشن میں عندلیب سے میں نے چھپائے داغ

عمر گذری اک بت کافر نظر آتا نہیں
حشر میں کیونکر خدا کا پائیں گے دیدار ہم

یاں تو دل بھی سنبھل جاتی ہے گرتے گرتے
شمع کے بستر پہ قدم کیا مرے دل نے میں

گر آنکھ ہے تو باطن انسان کی سیر کر
کیا کیا طلسم دفن ہیں مشت غبار میں

کیا بھلا شکوہ بتوں کا قصہ ہو بھی گیا سے یاد
رنج دیتا ہے خدا بھی طالب دیدار کو

بتوں کے پردے میں ہم دیکھتے ہیں خدا
کہہ دیا دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں

ہو گئی نظروں سے غائب تیرے تلاطم کے ساتھ
کاہ تھی ہستی ہماری شعلہ ادراک میں

بولے جو ستی دیکھ کر اس عارض پر نور کو
کر دیا روشن اسی شعلہ نے شمع طور کو

صبح شب وصال کہیں ہوتے ہی ہم کہانی
ہے زہر ساقیا قدرہ آفتاب میں

شب ہے تو وہ صبح ہماری ہو گئی سیاہ
جو شیب میں کیا نہ کیا تھا شباب میں

خاکسار تو ہی ہے ہر جا سرکشوں کی سر کشتی
وہ زمیں ہے کون جس پر آسماں ہو نہیں

دم ہے جب تک جسم عاشق میں ہے خاصی کی خلیل
خوب جلتا جاتی ہے جو شمع پھر ہوا ہو نہیں

عمر بھر وحشت میں گو صحرا نوردی کی تو کیا
سینے کے قابل جو تھا دل کا بیابان گیا

ہمارے نالہ پر اثر کی قدر زور آور ہے
گریبان چاک ہو گیا نہ کیوں بلبل کا غنچہ بھی

تیری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ شبنم کا
وہ ملا ہے ستا ہے آنسو ہو نہیں سکتا

اٹھنے نہ دی ہے کیوں مجھے زخم کہن سے میں
آئی ہے شاید آج ہوا کوے یار سے

وہ بے نقاب ہوا ہے تو یہ تماشا ہے
دو چار ہوئے کی آنکھوں کو اپنی تاب نہیں

اٹھا کے میں تو یہ دشت غبار لیتا جا
مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا

دل میں پوشیدہ غم عشق بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں

ہماری جامہ دری میں گلوں کی کیا تقلید
یہ وہ جنوں ہے جو وابستہ بہار نہیں

آئی قیامت اس نے لگایا ہے منہ سے جام — ہے اتصال ماہ میں دور آفتاب میں

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن — آگ میں پڑ جائے جو شے آگ ہے

ایک سا عشق کبھی زمانہ میں ہوا ہم کو نہ اوج — آسمان پر کیا ہمارے بخت کا اختر نہیں

نکہت گل کہتی جاتی ہے زبان موج سے — قابل نظارہ رنگ گلشن عالم نہیں

صدمے اٹھانے والے ہیں روز فراق کے — کیا لائیں ہم شمار میں روز شمار کو

ہوس نے جوش بدمستی بہت ترغیب گستاخی — خجالت یار سے ہوگی کبھی تو ہوش آتا ہے

تنگ آ کر جب کہا میں نے کہ مر جاؤں کہیں — بدگماں سمجھا کہ اس کو اشتیاق حور ہے

ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے — روانہ کشتی عمر رواں ہے

مر جاؤں بستر میں الٰہی وصال کے — فرقت میں زیست کی ہو تمنا اگر مجھے

ایک چھوٹا تو ملی دوسرے کو قید حیات — کبھی ہوتا نہیں یہ خانہ زنداں خالی

نام خدا لیا جو منکرین کے حضور — مر کر بھی اے صنم مجھے اخفائے راز ہے

ڈر تھا اثر کا اس کو سو وہ بھی نکل گیا — نادم ہوا ہوں منہ سے میں نالہ نکال کے

آب و گل میں اڑ گیا ہے آس عمر رواں — توڑ کر تار نفس کو تازیانہ کیجیے

اندوہ کر فشردہ ہمیں رکھے قفس بلبل عبا — کون ہے اک مشت گل میں جو چمن آرا ہوا

اپنی کی اگر تو کہاں ملک بھی لاکھوں نفیس — سر سودا زدہ بیکار نظر آتا ہے

جانتا ہوں انھیں آنکھوں کو یہ دیکھ آیا ہے — مست جب دم کوئی میخوار نظر آتا ہے

کام کچھ بھی دیدہ بیدار سے ہوتا نہیں — دولت بیدار ملتی ہے دل بیدار سے

رنج غربت وحشت کیس دشمن ہجر دوست — کس طرح ہو شادمانی خاطر ناشاد کی

اس سے پہلے اردو میں ایسے شعر نہیں کہے گئے۔ ان میں زبان کا لطف، ادا کی خوبی زندگی کے پیچ و خم تمثیلات استعارات اپنی مثال آپ ہیں۔ اس طرز فکر و انداز بیان نے غالب و اقبال کو پیدا کیا۔ غالب نے اس کا اختراع کیا۔

خواجہ محمد وزیر وزیرؔ

تعارف:۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ کی اولاد میں متوکل اور گوشہ نشین آدمی تھے عربی فارسی کی معمولی استعداد تھی شاعری میں ناسخ کے ایسے شاگرد تھے کہ استاد کو ان پر ناز تھا اور ان کی زندگی میں ان کی استادی مسلم ہو گئی تھی استاد نے اپنے اکثر شاگرد ان کے حوالے کر دیئے تھے ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء میں انتقال ہوا سنہ ولادت نہیں معلوم انتقال کے بعد ان کے اعزہ و احباب نے دیوان جمع کر کے ۱۲۷۲ھ میں شائع کیا

گردش یہ چشم مست کی دل میں گیا وزیرؔ
ٹوٹا ہے دور جام سے شیشہ شراب کا

تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اٹھ جائے گا

ہو گیا ہے چین دل دشمن کی بھی فریاد سے
دل نے جب نالہ کیا ٹکڑے جگر ہونے لگا

مر گئی بلبل جو کیا یاد چمن کو
غربت میں خدا یاد دلائے نہ وطن کی

قفس تن میں نہ گھبرائیو اے طائر روح
جو گرفتار ہے اک روز رہا ہوتا ہے

ہم اسیران قفس کو بھی ذرا چین نہیں
روز دھڑکا ہے کہ اب ذبح ہوا ہوتا ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

بگڑے ہوئے ہمارے گریباں سنور گئے
انگڑائی میں جو یار کی چولی مسک گئی

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نامہرباں کل مہرباں ہو جائیگا

بیٹھے بٹھائے تمھیں کیا ہو گیا
اٹھ کے چلے حشر بپا ہو گیا

آج مجھ سے بات اگر کرتے نہیں
دیں گے یہ بت کل خدا کو کیا جواب

افزوں کہیں ہیں حسن میں شمس و قمر سے آپ
آئینہ لے کے دیکھئے میری نظر سے آپ

شکر ہے ان بتوں کے کوچہ میں
پہنچے ہیں ہم خدا خدا کر کے

قدر نعمت ہوتی ہے بعد از زوال
یاد آئے لطف جوانی پیری سے

یوسف جو کہا تمھیں تو بولے
کیا آپ نے مول لے لیا ہے

پہنچی نہ اس کے کان تلک آہ نارسا — کیا فائدہ زمیں سے اگر تا فلک گئی
کچھ حال اپنی زلف کے دیوانے کا نہ پوچھ — بس مختصر یہ ہے کہ یہ قصہ دراز ہے
سر پیٹتا ہوں پلا دے مے سرجوش مجھے — ساقیا دور کہ پھر آنے لگا ہوش مجھے
آگئی لغزش مستانہ کسی مست کی یاد — دور ساغر نے کیا بزم میں بے ہوش مجھے

اس درجہ کیوں ہے چرخ جفا جو کو اضطراب — دل کو مرے قرار کہیں آگیا نہ ہو
ساغر عمر کو اللہ نے لبریز کیا — جام تو نے نہ دیا اے بت میفروش مجھے
باتوں میں نگاہوں کا غزالان ختن — آنکھوں سے تری سیکھ لیا طرز سخن کو
تصویر ہے کھنچی تو لکھا حشر زیر پا ! — مانی سے جب کھنچا نہ وہ انداز جوانی کا
غنچہ چمن میں چٹکے چلی ناز سے نسیم ! — انداز اڑایا سب نے تری بول چال کا
راز دل کتنا چھپایا کھل گیا — حال اس دولت سری کا کھل گیا
اگر زمیں کی پوچھی فلک کی اس نے کہی — یہ ان کا آدمی اچھا فرشتہ خو آیا
وہ حال پوچھتے ہیں تو غنچہ میں خموشی ہوئی — زبان بند ہوئی وقت گفتگو آیا
کب خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائیگا — دوست کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائیگا
جلایا طور کو جس نے وہی گری بجلی — کہ ہر شعلے سے آواز گفتگو آیا !
جی ڈر رہا ہے دل جو کیا دلربا کے ساتھ — نا آشنا کو ہم نے کیا آشنا کے ساتھ
کیا کیا نہ ہم کو اپنی عبادت پہ ناز تھا — بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے
یہ دل بدگماں نہ دیکھ سکے — اگر ہوں بت کے ہو خدا ہمراہ
بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہ خود فراموشی — دل گم گشتہ آپ ہی خضر ہے اپنے بیاباں کا
کسی کی جستجو میں تخت دل آنکھوں میں آتے ہیں۔ — تلاش یوسف گم گشتہ میں ہے قافلہ دل کا
کبھی خورشید نہ افلاک پہ پنہاں ہوگا — لاکھ پردوں میں جو تو ہوگا نمایاں ہوگا
اپنے گناہ آ نہیں سکتے حساب میں — زاہد کو خوف چاہیے روز حساب کا

۱؎ دیکھ بہتر ہے۔

اب جامہ سے جو اوہ باہر!
ہم بھی آنکلیں گے مسجد میں وزیر
اس کو طاعت پہ غرور اس کو ہے آمرزش پر
ہمیشہ گریہ وزاری رہی کہ خونباری
چھپایا جام جو ساقی نے کوچے پر اشک
پلا ہوں دامن صحرا سے بیقراری میں
ستم ایجاد جفا کرتے ہیں
بند ہیں وہ ہاتھ حنا سے کیا ہے جن سے شہید
نہ دیکھا نقش قدم کا صدائے یار بنی
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
نقشہ موئے کمر کھینچا تو بھولا تھا لچک
پھول جب جھڑنے لگے رنگین بیانی سے مری
مثل سایہ سرو ہے پامال دیکھو تو خرام
اندھا ہے وہ جس نے ترا دیدار نہ دیکھا
بلبل کی بھلا پوچھتا کاہے کو کوئی بات
بت کہتے ہیں کیا کیا مجھے اس بیدہنی پر
پائے مجنوں جب کھنچے زنجیر سی اک بن گئی
یاد جب کرتا ہوں لطف سایہ دیوار کو
معاک ہو وہ دل کہ جو درد آشنا نہ ہو
کبھی کسی تیغ نہ نزاکت سے کھنچ سکی
اس نجابت نے ابر کم مجھے ڈنے نہ دیا

جس نے تجھ کو کبھی عریاں دیکھا
خشت خم لے کے جو ہنوز آئیے گا
کبر زاہد سے ہے جدا کبر گنہگار جدا
جو اشک تھم گئے تو آنکھ سے لہو آیا
ستارے آئے نکل آفتاب ڈوب گیا
ہوا ہوں ظاہر بسمل کے زیر پر پیدا
ستم ایجاد کیا کرتے ہیں
کچھ عدو یار سے منظور انتقام نہیں
سمند عمر سا کوئی سبک خرام نہیں
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر تو تیر کو
ہو گئی لغزش یکایک خامہ بہزاد کو
رہ گئی حسرت سے بلبل کھول کر منقار کو
پھول منہ سے جھڑتے ہیں سنیو ذرا گفتار کو
بہرا ہے وہ جس نے نہ سنا تیرے سخن کو
صد شکر دیا نطق نہ غنچے کے دہن کو
اللہ نے صد شکر بنایا نہ دہن کو
خود بخود لغزش ہوئی یہ خامہ بہزاد کو
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں جنت میں میں کوئے یار کو
پھوٹے وہ آنکھ جس سے کہ آنسو گرا نہ ہو
قاتل کا کیا قصور جو مری قضا نہ ہو
ہجر میں لگ گئی تھی ایک گھڑی ہچکی سی

جیتے جی لیں وہ بت رہا ہمراہ ! اب تو بندے کے ہے خدا ہمراہ
دل دیا اس کو پر یہ ڈرتا ہوں دشمن اک دوست کے کیا ہمراہ
تجھ کو دیکھا جدھر نگاہ گئی تھا تصور ز بس ترا ہمراہ
رنج تنہائی کچھ نہ رہا یار کے غم کو لے لیا ہمراہ
اس نے تنہا مجھے نہ جانے دیا ! غم فرقت کو کر دیا ہمراہ
ناتواں ہے بہت غبار مرا تو ذرا رہیو اے صبا ہمراہ
رہی یاں گردش اور جامہ داری کاش لاتے نہ دست و پا ہمراہ
لکھ سکا خط میں نہ جب وصف صفائے رخ یار دیدیا آخر کو دست نامہ بر میں آئینہ
چاہیے اگر خدا تو ہر اک عیب ہو ہنر موسیٰ کو دیدیا ید بیضا جلا کے ہاتھ
آئینے کی وہیں کھل جاتی ہے ساری قلعی تیرے چہرے کے مقابل جو ذرا ہوتا ہے
سخت جاں ہوں نہ مروں گا شب فرقت میں دیر سیکڑوں بار اجل آئے تو کیا ہوتا ہے
ایک ذرے کو نہیں ہوتی ہے جنبش بے حکم تو جو پھر جاتا ہے اللہ پھرا ہوتا ہے
قصہ فرہاد کے دھوکے میں حال اس نے سنا سرگذشت اپنی کہی ہم نے بھی کس تدبیر سے
آنکھوں کو کب ہے تاب اسے دیکھیں بے نقاب گویا کہ ہے حجاب جو وہ بے حجاب ہے
جنت میں جائیں یا کہیں دوزخ نصیب ہو یہ پرسش عمل تو ہمیں اک عذاب ہے
برق یاراں جس کو کہتے ہیں مرا افسانہ ہے کچھ حقیقت نے کی کچھ حال بتایا نہ ہے
دیکھ لیتے ہیں وہ دل میں جو نہیں دیکھا کبھی جام جم کہتے ہیں جس کو کیا یہی پیمانہ ہے
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے
حجاب آتا ہے جرأتوں کو تم کو دل دکھانے سے کبھی چشم سرگیں سے تیر کس نے دل بہلایا ہے
دن ہو گیا نمود شب وصل کو یا آگئی ! اٹھی نقاب کیا مری قسمت الٹ گئی
مجنوں سے کہہ دو کہتے ہیں جوش جنوں سے آتے ہی فصل گل مری تصویر پھٹ گئی
گر پڑے پھولوں کے خرمن پہ یکایک بجلی نالہ ہم نے کیا جو تو جانب گلشن دیکھے !

محمد رضا برق

تعارف:- ناسخ کے شاگرد تھے، واجد علی شاہ کے استاد اور مصاحب خاص تھے۔ خود مختار الملک خطاب تھا۔ واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے وہیں ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا۔ ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا جو شائع ہو گیا ہے۔

نہ کوئی ان کے سوا اور جہاں جان دیکھا
رہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا

کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا
سنے نہ اس میں دیکھا تمھیں جہاں دیکھا

وہ چند اور تربت ہوئی محبت سے
غضب ہوا جو کبھی ان کو مہرباں دیکھا

دیدار کو ترستے ہیں عاشق جمال کے
پر جل رہے ہیں طائر وہم و خیال کے

عاشق زار کہاں تم وہ ستم عشق کہاں
جو فرشتوں سے نہ اٹھے وہ اٹھا لیتے ہیں

بتوں سے جلوہ حق کا ظہور ہوتا ہے
عجیب تھا کہ تلون میں نور ہوتا ہے

اذان دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لن ترانی تمھیں زیبا ہے کسے تاب نظر
غش پہ غش آتے ہیں پردہ جو اٹھا دیتے ہو تم

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلا ہوتا ہے

بے اثر نالہ نہیں آپ کا ڈر ہے مجھ کو
ابھی کہہ دیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

کب تلک جور و جفا ہم بھی ہیں انسان آخر
حال دل منہ سے کہیں کچھ تو نکلا ہوتا ہے

وصل کی رات تو دھڑکے میں کٹی فرقت کے
آپ کے جانے کے دن دیکھئے کیا ہوتا ہے

بلاؤں میں دل مبتلا ہو گیا
مجھے عشق گیسو بلا ہو گیا!

مر مر کے ساری رات تو فرقت میں کٹ گئی
لیکن امید آج نہیں ہم کو شام کی

مضطرب سن سن کے وہ رشک قمر ہونے لگا
رفتہ رفتہ نالۂ دل میں اثر ہونے لگا

حسرت موت میں مرتے ہیں ہجر تک عاشق
ہم سے پوچھو کہ تب ہجر میں کیا ہوتا ہے

دیکھ لیجئے گا جو لے مالِ الفاہی تمام ہے
فصلِ گل آتے ہی عالم میں قیامت آئی
پھر وہی آئی مصیبت وہی آفت آئی
خوف کیجئے دلِ مظلوم کی بربادی ہے
خدا غریب کی سنتا ہے غضب سے فریاد
شہرت بجا جہاں میں اس خود نمائی ہے
ساقی ہے مے ہے باغ ہے ابر سیاہ ہے
کوکیں ہیں کوئلوں کی پپیہوں کے شور ہیں
زلفوں میں دل الجھ کے سحر تک تڑپ گیا
تا صبح میں لاکھ بار جیا اور مر گیا

کیا کہیں تم سے شبِ ہجر میں کیا ہوتا ہے
پھر جنون تازہ ہوا پھر وہی آفت ہوئی
روز مر مر کے کٹا پھر شبِ فرقت آئی
حشر ہوگا اثر نالۂ فریادی سے
اثر عجیب دلِ دردمند رکھتا ہے
ویسے بشر بھی ہوتے ہیں قدرتِ خدا کی ہے
اس وقت میں شراب نہ پینے گناہ ہے
طاؤس رقص کرتے ہیں آن ہی بہار کے
چھایا ہوا بلا ہے چھٹے درد سر گیا
کیا کیا فراقِ یار میں مجھ پہ گزر گیا

کیا شوخیاں ہیں ابلقِ لیل و نہار کی
راحت بھی کم از غم نہیں دل جبکہ غمگین ہو
بحرِ عالم میں رہی کشتیِ امید تباہ
خاکساری کا جہاں میں سب سے عالی رتبہ ہے
سبز باغ دہر میں برگِ خزاں ہو تو نہیں
غیر دل کا حال دیکھ کے روتا ہو زار زار
غم اٹھے اور بڑھے جس قدر دیا رہا
عیاں ہوتا ہے رازِ عشق سینہ میں نہاں ہو کر
ڈر نہیں عشق کو موجِ حوادث کا نہیں
قوتِ بازو جمعیت نہیں خط آتا ہے
تکلیف کیوں اٹھائیے بن بن کے ہوشیار

جیتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی
سر سر چھپے کچھ نکلا ہے نسیمِ سحری کا
دمبدم موجِ حوادث نے تماشا دیکھا
یہ نہیں وہ کہ جس کا آسرا ہوتا نہیں
پیر ہو کر پھر بشر کوئی جواں ہوتا نہیں
پوچھو نہ حال میرے دلِ دردمند کا
صبر سے تحمل شمروار سنگ ساز ہوا
بیان کرتی ہیں آنکھیں یا دل ترجمان ہو کر
مچھلیوں کو خوف کیا ہے آمد سیلاب کا
سر کی آفت اٹھانے کو تیار ہیں دو دوستی
مرتا ہوں میں تو اہلِ جنوں کے شعور پر

چھوڑ زمانہ گیا ہے جفائے فلک سے کیا
اٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اسے میں نے
مربوط ہم شیشہ و ساغر ہیں ازل سے
درد فرقت میں زہر لازم ہے
شب فرقت کبھی کاٹ دیتے ہیں ہم
ہجر میں یار اور بھی شمس و قمر سے حسرت
حشر تک کوچہ محبوب میں چارا نہ ہوا
چاند سورج کو ترستا ہوں میں ...
محال ہے کہ ... خلد سے جائیں

خوگر وہ جو ہوئے قدم میں خوشی پانے کا
نہ سوجھی عارض گلگلوں کی جب مثال مجھے
آنکھیں نہ پھیراؤ دل مضطر ملے گا
آدمی کب تلک دوانہ کرے
کیا کریں عمر اگر وفا نہ کرے
پھر نظر آئی نہ اس طرح کی صورت آئی
کس کو ملتا ہے نظارہ جو ہوا ہے مجھے
کس کو پھر کہیے شب غم میں پکارے مشتاق
جو درد ہے آپ کے جاتا ہے پھر نہیں آتا

بے قراری سی بے قراری ہے
جس شعلہ رو کو دیکھ لیا دل اچھل گیا
گذر ہی ہے جو دل پر وہ ہم ہی کہیں کس سے
میکدے پہلے سے جو وہ سر تمنا اٹھا
وعدہ تیرا قیامت کے لیے امید بندھی صبح

نہ جئیں گے اگر یہ حال رہتا
جو شمع آگے آگئی پروانہ جل گیا
کسی کو منہ دکھانے کے نہیں ہم
دم میں سو بار جگر تھامے کے بیٹھا
شام ہی سے آج تو درد جگر بہکنے لگا

پیر مغاں سے پوچھئے مری خرابیاں
غضب کیا کہ جوانی میں توبہ کی
زاہد تو روز حشر سے بڑھتی ہے اپنی
روز حور کی بہت وصف کیا کرتا ہے
آج دیتے ہیں سزا ہم کو خطا سے پہلے

سو بار توبہ توڑ چکا ہوں شباب میں
اگر یہ سچ ہے تو پھر عمر بھر خراب ہا
دانستہ ہم قصد کریں گے قصور پر
ہم بھی زاہد کو دکھائیں گے تماشہ اپنا
بات تک آپ کہتے تھے خیال سے پہلے

ابر رخسار کی یاد دلوں سے وحشت ہے
برق زلفوں کے تصور میں رواں ہیں آنسو

دار پر چڑھنے سے حسرت بڑھ گئی منصور کی
... رہتا ہے اٹھا چار طرف چھائی ہے

دل کے ٹکڑوں سے نہ خالی کبھی پلکیں نکلیں
کھچ گئے سیکڑوں منصوبے یہاں داسوں پر

دیتا ہوں جان جان کے اس نوجوان پر
دنیا بھی ہے ایک کھیل جو کھیلا ہوں جان پر

کاوش دہر سے ہیں اہل بصیرت محفوظ
آج تک پائے نظر میں نہیں سنگ لگا

ناطاقتی اس قدر بدن زار ہو گیا
دم توڑنا فراق میں دشوار ہو گیا

جب جان دیتا جو میسر مجھے درد ہوتا
سر نہ رکھتا میں سر پر اگر احسان ہوتا

پہلے سے عیب بے عیب کر دیا ہم کو
یہی ہنر ہے کہ کوئی ہنر نہیں آتا

ضد سے اس رشک پری کی کوئی شے خاک نہیں
سحر ہے گفتار میں اعجاز ہے رفتار میں

وہ گئے غبار جوش جنوں کے نکال کے
صحرا نئے بنائیں گے گرد ملال کے

ہر ایک نفس عشق میں ہے زندگی خضر
جینے کے لئے مرتے ہیں بیمار محبت

حسن رفتار جو اعجاز نما ہوتا ہے
پھر ہر ذرہ خاک کف پا ہوتا ہے

چال وہ ہے کہ فلک بنتی ہے چلنے سے زمیں
چہرۂ اس ماہ کا نقش کف پا ہوتا ہے

مختصر طول شب ہجر بیاں کرتا ہوں
کہتے ہیں ایک گھڑی حشر کے سارے دن کو

جو بلا آئی وہ لی دانستہ اپنی جان پر
میں نے جب فتنہ کو دیکھا اس پہ مفتوں ہو گیا

فرقت نے بنایا ہے مجھے طالع بیدار
کس طرح ملوں خواب میں جانا نہیں ہوتا

بھیج کر قاصد کو پچھتاتا ہوں ایسا رشک ہے
وہم میرا دیکھئے کیا کیا گماں ہوتا نہیں!

اے صنم حسن اسے کہتے ہیں اللہ اللہ
ایسی صورت کا بھی دنیا میں بشر ہوتا ہے

جب خلق یہ اس طرح سے بیدار کر دو گے
ایجاد نیا گلشن ایجاد کر دو گے!

مہتاب نقاب میں ہے رخ پر ہیں رخسار
کس طرح نہاں حسن خداداد کرو گے

کس طرح کہوں نالوں میں تاثیر نہیں ہے
تدبیر مطابق ہو یہ تقدیر نہیں ہے

زور لغزت ہے مجھے بادیہ پیمائی کی
ہر قدم پر یہی کہتا ہوں کہ صحرا اڑ جائے

جوش وحشت یہی کہتا ہے نہایت کم ہے
دو جہاں سے بھی اگر وسعت صحرا بڑھ جائے

میر علی اوسط رشک

تعارف:- ناسخ کے شاگردوں میں بڑا درجہ رکھتے ہیں ان کے بنائے ہوئے قاعدوں پر عمل کیا اور ان قاعدوں کی روشنی میں نئے قاعدے وضع کیے ناسخ کے زمانے کی بعض بھونڈی لفظوں اور ترکیبوں کو ترک کیا اور ان کے جانشین کی حیثیت سے مسلم درجہ رکھتے تھے آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے وہیں ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء میں انتقال ہوا۔

نہ ہوا وقت خزاں ضبط فغاں و نالہ — بات نکلی جو صدائے مرغ چمن سے باہر

ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں — اک مشت خاک کو مہ انور بنا دیا

جو ساغر و مینا نظر آیا مجھے خالی — یاد آگیا ساقی دل مایوس بھر آیا

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں گل — تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

یارب وہاں و چشم و دل زار کیا کروں — فریاد و اشک دونوں کسی میں اثر نہیں!

دل نہ قابو میں ہے نہ دلبر ہے — موت اس زندگی سے بہتر ہے

ایذائے دل بیان کروں کس زبان سے — یارب کبھی کسی کو یہ درد نہاں نہ ہو

موت آئے مجھے اجل مجھے اے ہمسفر اگر — ساقی نہ ہو بہار نہ ہو جانِ جاں نہ ہو

بتوں کو دل مبتلا چاہتا ہے — کوئی کوہ آفت گرا چاہتا ہے

ہجر جاناں میں کہیں جینے سے مرنا بہتر — زندگانی کے مزے کو بھی کھلتے دیکھا

بیڑیاں ہاتھ میں اور اطفال سنگ انداز گرد — وکل سمجھے میرا آنا غل جدھر ہونے لگا

کس کو تاب نظارہ باقی ہے — رکھتے ہو چہرے پر نقاب عبث

غم دل سوز جگر داغ فراق! — میرے مرنے کے پیچھے کیا کیا باعث

ناصحو عشق میں رکھو معذور — جانتا ہوں کہ برا کرتا ہوں

شیخ بگڑے کہ برہمن بگڑے — میں ترا نام لیا کرتا ہوں

پتھر کسی کا ہے دل کسی کا دل آئینہ — ششدر ہوں کارخانۂ پروردگار میں

ہجر میں ابلق ایام بھی کاوش میں رہا ‎ بارہا میری سواری میں یہ گھوڑا الٹا
کرتی ہے غریق یم غم آرزوے دل ‎ بات ہی نہیں بحر تمنا کا کنارہ
ہاتھ آیا لطف جس نے سراپا اٹھا لیا ‎ دنیا سے جس نے دست تمنا اٹھا لیا
ترک دنیا کرتے ہی کھلنے لگے اسرار غیب ‎ باخبر ہونے لگا جو بے خبر ہونے لگا
دل بستہ لطافت باغ جہاں نہیں ‎ پروا نہیں جو رنگ بہار و خزاں نہیں
نخل امید کسی روز نہ پایا سرسبز ‎ گلشن عمر میں پیوستہ خزاں رہتی ہے
عیش ممکن نہیں مجھ کو چمن ہستی میں ‎ جب بہار آتی ہے تشویش خزاں رہتی ہے
دمبدم وادی الفت میں جنوں کہتا ہے ‎ فہم کہتے ہیں جسے عقل کہاں رہتی ہے
جو کہ خالی ہو علائق سے اسے غم کس کا ‎ نے سے پوچھے کوئی کیوں گرم فغاں رہتی ہے
بھول وہ خود رفتہ الفت کہ جسے معلوم نہیں ‎ زندگی کہتے ہیں کیا موت کہاں رہتی ہے
دوست جاناں جسے وہ دشمن تھا ‎ بس اسی اشتباہ نے مارا
چمن دہر میں وہ طائر خوش قسمت ہوں ‎ کسمسا دام مصیبت سے دم چند جلا
بحر غم میں ڈبو دیا ہم کو ‎ دل نے بیڑا ہے خدا پار ہی کیا
مال جو صرف ہوا پھر کے کہاں آتا ہے ‎ کبھی دیکھا نہیں بہتے پھرے دریا آتا
محو اپنا ہے دیکھئے جس کو ‎ حق پرستی کا ہوش ہے کس کو

ہوگا ہمچہرہ روئے دلبر کا ‎ منہ کوئی دیکھے ماہ انور کا
روتے ہیں ہجر یار میں کڑھتے ہیں انتظار میں ‎ اب دل بیقرار میں نام نہیں قرار کا
جس کی آبادی اجاڑی آپ نے ‎ نام دل تھا اس خرابہ آباد کا
حلق سے نکلی فلک تک پہنچی ‎ ہم سے سو بار آزمائی بات
مطلب یہ ہے صدمۂ شکست حباب کا ‎ دیکھا بنائے ہستی ناپائیدار کو
صحن چمن ہو خیمہ دور سحاب ہو ‎ ساقی ہو یار ہو قدح پر شراب ہو

شکوہ ہو ایک خانۂ دل ہو اگر خراب
اس عشق فتنہ گر نے کیے گھر کے گھر تباہ

ہجر میں تاب و تواں ہوش و حواس
سب گئے دھیان تمہارا نہ گیا

مجھے تھا کام آئینہ سے یا زلف پریشاں سے
میں اپنے حال آشفتہ میں حیران و پریشاں تھا

سنا رہا ہوں نکیرین کو فسانۂ ہجر
سوال ان کے جدا ہیں مرے جواب جدا

وہ کوٹھے پر چڑھے دنیا میں چاندنی چھٹکی
صد حیف ایسے باغ میں وہ مژدۂ بہار آیا

دل و دیدہ ہو گیا آوارہ ہمارا
نہ صحرا ہمارا نہ دریا ہمارا

تم نے کیوں عشق میں چھپائی بات
آخر اسے رشک مہ پہ آئی بات

قسم اول تو تیرے عارض تاباں کی ہے
اس سے کم سمجھے ہیں ہم اس اثر کے چاند میں

روز شب ہجراں کی درازی حد بیاں سے ہے باہر
رات آئی تو صبح ہے عنقا دن آیا تو شام نہیں

گھر کا دروازہ ابھی کھلا رکھتا ہوں میں
جس طرف سنتا ہوں شہرہ آمد سیلاب کا

ارباب فتنہ ڈوبنے کا غم نہیں کرتے
دریا میں پھرا کرتی ہے بے خوف و خطر موج

عمل نیک و بد اک روز ثمر لاتا ہے
بیج بونے میں نہیں دیکھتے کیسا اٹھتا

اپنی سچائی سے انسان کو نیک بختی کی شناخت
آپ تک جو کوئی پہنچا وہ خدا تک پہنچا

جلوۂ یار سے روشن ہے زمانہ دن رات
کہیں خورشید کہیں شمع شبستاں نکلا

تو نظر آئے دیکھئے جس کو
احد توحید کہتے ہیں کسی کو

یاد ایام کہ میلان مزاج یار تھا
یاس میں امید تھی اقرار میں انکار تھا

بیچ دریا پہنچ کر تو ہوا قسمت میں غرق
بحر غم سے پار اتر جاتے تو بیڑا پار تھا

کیوں نہ مرتا عاشق چشم و لب و زلف و کمر
زار تھا آشفتہ تھا خاموش تھا بیمار تھا

اے خدا کوئی نہ دیکھے مرض الفت چشم
دم اس آزار میں آنکھوں سے نکلتے دیکھا

اب جہان شام و سحر ہے بجا زلف و رخ
شام ہوئی تو صبح لائے صبح ہوئی تو شام نہیں

کیا قصہ الست و بلا کی خبر نہیں
حاضر جواب ہم تو ازل سے بلا کے ہیں

بعد مردن خاک کا انبار یا لوح مزار — اے اجل اس کے سوا کیا خاک پھر چاہیے

ہے مائل عیادت اگر یار کا مزاج — بہلے گا سیر باغ سے بیمار کا مزاج

نہ کرے باغ میں خزاں جو کچھ — مجھ سے تو نے وہ اے بہار کیا

ہوں اسیران بلا میں وہ گنہگار قدیم — کبھی کھلتا نہیں دیکھا در زنداں جس نے

مجھ کو بدنام کیا روح کا ہو جائے برا — کہ لب پیکر تصویر بھی فریادی ہیں

ور آمد شد جاناں کے مشابہ کیا ہے — دم کو آتے کبھی دیکھا نہ نکلتے دیکھا

ساتھ دل کے ہے داغ ہجراں بھی — تمران دونوں کی برابر ہے

دیکھا جو چشم غور سے دونوں کا حال ایک ہے — گردش چشم یار کا گردش روزگار کا

تصور تھا جو اس آئینہ رو کا قیدخانے میں — صفا بخشا تھا آئینہ ہر دیوار زنداں کو

کرے نگاہ بصارت کی کیا حقیقت ہے — وہ لعب قدرت پروردگار کی صورت

کہاں سپید خیالی مانی و بہزاد — کہاں وہ خامہ قدرت نگار کی صورت

سمجھوں جو مدعا تو لکھوں کچھ جواب بھی — تقریر سے زیادہ ہے تحریر لاجواب

مشتاق سیر لالہ دل داغدار ہے — ہنگام آمد آمد فصل بہار ہے

قتل کرنے کو خوش اندازی کا جوہر چاہیے — کون کہتا ہے کہ تیغ و تیر و نشتر چاہیے

کمال تنگ ہوا ہوں جہان فانی سے — دیا خدا نے عجب خانہ خراب مجھے

راستہ صبح سے اے رشک قمر دیکھیں گے — آج ہم شام سے آہوں کا اثر دیکھیں گے

جب تک عوض صبح نہ ہو صبح قیامت — لطف اثر نالہ شبگیر نہیں ہے

شمع میں نور نہ سوز دل پروانہ رہا — کچھ کہیں بھی نہ رہا جب ترا جلوہ نہ رہا

صبح سے ہیں قائل تاثیر وحشت اہل ہوش — بکتے بکتے مجھ سے ناصح ہو گیا دیوانہ آج

کھلیں خدا نے کیا آب و تاب غنچہ و گل — چمن کی سیر کرو ڈالدو بہار میں روح

ہوا ہے تنگ جہاں اب کی وحشت دل میں — کدھر میں جاؤں زمیں آسماں سے باہر

باتیں وہ کرو کہ ہو رنگینوں کے بول — یہ ساز میں صدا ہے نہ یہ لطف راگ میں

امداد علی بحر

تعارف امام بخش کے بیٹے اور امام بخش ناسخ کے شاگرد علمی استعداد کا حال معلوم نہیں۔ تحقیق الفاظ و محاورات عروض و قافیہ میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ چھوٹی شہزادی کے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا اور انہی کی ڈیوڑھی کے بغلی کمرہ میں قیام تھا۔ افیون کے عادی تھے۔

کچھ دنوں کے لئے رام پور بھی گئے تھے مگر پھر لکھنؤ واپس آ گئے۔ ۱۲۹۵ھ میں ۷۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔

ہر غنچۂ نسرین مظہر انوار خدا ہے
ہر دانۂ ذرات میں خرمن نظر آیا

یہ کہہ دو کوچۂ جاناں کے جانے والوں سے
اُدھر جو کوئی گیا پھر اِدھر نہیں آیا

عذابِ سخت ہے قاصد کا انتظار مجھے
اجل ہی آئے اگر نامہ بر نہیں آتا

جیتے جی عاشق بیتاب کا کب دل ٹھہرا
روح جب کھنچ گئی پرواز تو بسمل ٹھہرا

یہ راز عشق رہے دل ہی میں تو بہتر ہے
اِدھر زبان سے نکلا اُدھر فسانہ ہوا

عشاق کی تقدیر میں آرام نہیں ہے
کیا سوئیں شب وصل کہ دھڑکا ہے سحر کا

گو وہ چپ بیٹھا ہے پر شوخی کی باتیں ہو رہی ہیں
ہے لب خاموش پر عالم لب تصویر کا

کہاں وہ نغمے اب بہ یمن فریاد تیشہ ہی
ہوا دل سخت بھی لے ورق الٹا گیا ہے

ہمارے حق میں ہے یہ دو مری بلائے آسمانی
شب فرقت کا جانا اور آنا روز ہجراں کا

کٹے ٹکڑا دل ہی اپنا جینا ہی مرا کوئی کہی
چراغ لیکر مزار ڈھونڈھا مزاج پایا نہیں

کوئی سجدہ تری درگاہ کے قابل نہ ہوا
لے چلا ساغر جبیں پر ... ساقی ...

آدمی گردش ایام سے غافل نہیں ہے
شام کیا ہوگا خدا جانے سحر کیا ہوگا

دو تا دو راہ اسلام و کفر ہے
زاہد ادھر خراب ادھر برہمن خراب

روئے کوئی غریب تو ہنسنا نہ چاہیے
اے دل یہ بھیڑ بھاڑ میں گم ہو تو سوچ لیں
ہے موجِ نسیمِ سحری ہونٹوں کی جنبش
بر روزِ وعدہ کہاں اڑ گئے یہ فرماد
یہ بات سچ ہے کہ دنیا مقامِ عبرت ہے
رونے دھونے سے فائدہ بجز
کوئی آداب محبت کو بھلا کیا جانے
جو میری عرض ہے وہ نہیں یار کو قبول
عشق کیا درد ہے خداوندا
کیا برا درد ہے جدائی کا
بے تابیاں بھی ہیں تو دیکھو نجات ہے
میں قسم کھا کے یہ کہتا ہوں کہ مے نوش نہیں
مشاطہ کا محتاج نہیں حسنِ خداداد
معاف کیجئے ایسی خطا نہ ہوگی کبھی
بہار آئی ہے کہہ دو یہ ہمصفر دل سے
ترے ملاپ میں دونوں جہاں کی عشرت ہے
اللہ ہی بچائے اجل کا ہے سامنا
قبلہ ہے کس طرف میں وہ نہ ادا کروں
صاحب ہنر کو آج کوئی پوچھتا نہیں
کچھ نہ سمجھے آئینہ کی شکل حیرت میں ہے
کیوں نہ بند آنکھیں کیے دنیا سے جائیں بشر
عاشق نزار ہوں میں مجھ کو نصیحت ہے

واقعہ نہیں کسی کی فغاں اثر سے آپ گئے
سینہ میں حسرتوں کا نہ اتنا ہجوم کر
ہنستے ہو تو ہو جاتا ہے غنچہ سا دہن بھی
مکاں نہیں رہیں اے یار بازار میں ہم
کہ خواب دیکھتے ہیں جب خیال کرتے ہیں
کب سینے کے داغ چھوٹتے ہیں
دلنشیں جتنی ہیں عاشق کی وہ تقریریں ہیں
بندے کی جو خوشی وہ خدا نہیں
کوئی دارو کوئی دوا مفید نہیں
کسی کروٹ مجھے قرار نہیں
صیاد یا تو میں بھی نہیں یا قفس نہیں
آنکھ دیکھی وہ نشیلی کہ مجھے ہوش نہیں
تم چاند نظر آتے ہو بے ساختہ ہم میں
برا کیا تمہیں چاہا گناہگار ہوں میں
چمن کا ذکر اسیرِ دل کے سینہ پر وہ کر
جو تو ملے تو کسی شے کی آرزو نہ کریں
فرقت کی شب کہاں ہے چراغِ سحر کہاں
صاحب قدم تمہارے کہاں میرا گھر کہاں
یارب تلاشِ رزق کرے بے ہنر کہاں
ایک ہے دیکھا نہ دیکھا عالمِ ایجاد کو
اس پری کو دیکھ کر کیا دے مجھے کوئی
ذبح کرتے ہیں جو لولے آتے ہیں تھالے کو

دیکھنے دیتے نہیں کان رخِ زیبا کو
بجلیاں کوندتی ہیں تاب نظر کیوں کر ہو

مار ڈالے گا مجھے عشق یہ معلوم نہ تھا
ناگہانی ہو جو شے اس کی خبر کیوں کر ہو

بسمل کو سنبھالے سے سنبھلتے نہیں دیکھا
میرے دلِ بیتاب کی کیا چارہ گری ہو

کب دیکھ سکوں گل کو جو تقدیر میں ہو داغ
جب فصلِ چمن آئے تو بے بال و پری ہو

دل کو لگی ہے تو انساں سمجھتا نہیں کچھ
نالے کرنے سے مجھے کام اثر ہو کہ نہ ہو

ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی
بہار دیکھ چکے باغِ زندگانی کی

گلے شکوے نہ کر ارض و سما کے
خدا کو یاد کر بندے خدا کے

ہم نے ڈھونڈھا نہیں ہستی سے عدم تک کیا کیا
نہ اِدھر ہاتھ لگے تم نہ اُدھر ہاتھ لگے

خراب جائیں گے خضر سے بھی طلب آبِ بقا کرینگے
سرور لطفِ زندگی ہے خمار میں جی گیا کریں گے

اب ان میں اپنا نہیں گنا بتوں سے ہٹ کے دل گیا ہمارا
کرینگے بت خانے سے کنارا حرم میں یادِ خدا کرینگے

جوہر اس حسن پرستی میں وہ پیدا کرتے
دل کو آئینہ بنا کے تجھے دیکھا کرتے

روزِ تقسیم ہیں کچھ نہ بن آئی زر آسے بحر
بگڑی ہوئی تقدیر کو ہم کیا کرتے

نیرنگیِ دنیا کا تماشا ہے نمایاں
غفلت اسے کہتے ہیں کہ عبرت نہیں ہوتی

ہم خزاں کی اگر خبر رکھتے
آشیانے میں پھول بھر رکھتے

یار کی دونوں آنکھیں قاتل ہیں
اک نظر ہم کدھر کدھر رکھتے

پار اتر گئے مددِ غیر سے کیا لطف اے بحر
ڈوب مرئیے یہ نہ کشتی کا سہارا لیجیے

جنوں کے جوش میں نکلے جو گھر سے
اِدھر سے ہم چلے پھر اُدھر سے

چرخ کے ہاتھوں تہ و بالا ہیں دل احباب کے
اس ہنڈولے میں کوئی بیٹھا نہیں آرام سے

ہوئی تفریح مجھ کو پھاڑ کر پوشاک خستہ میں
درِ جنت نظر آیا مجھے چاکِ گریباں سے

عجب یہ رسمِ محبت ہے جس نے ظلم کیا
اسی کی خدمتِ عالی میں دادخواہ چلے

ناقوس کی آواز سے جو نکلا نہ اذاں سے
کس نیند سلایا ہے مجھے بے خبری نے

دیکھوں انجام مرے عشق کا کیا ہوتا ہے
بت خفا ہوتے ہیں ناراض خدا ہوتا ہے

پھول مرجھائے ہوئے دید کے قابل کب ہیں
شوقِ دیدار جو منظورِ نظر اس کا ہے
بت کدہ میں سر بسجدہ کعبہ میں سیا غریب سمت
بیمارِ محبت کا خدا حافظ و ناصر
روز اک تازہ بلا در پئے جاں رہتی ہے
آنکھیں نہ جینے دیں گی تری بے وفا مجھے
بتلائے کون کعبۂ مقصود کا پتہ
سیر کو اٹھے تو ہیں وحشی مزاج
توڑ کر دیکھ لے آئینہ کے ٹکڑے ناصح
کیا اعتبار تری قسم کا تو وہ ہے یار
دل بھی ہے ایسی چیز کہ تم کو نہ دیجئے
ہنسی ہے جان پہ ایسی کہ اب نہیں امید
خدا پرست ہوئے ہم نہ بت پرست ہوئے
اپنے اعمال سے پیری میں خبردار ہوئے
ہر طرف لوگ تماشے کو کھڑے رہتے ہیں
نیکیوں کو اور ہی صورت نظر آنے لگی
کچھ اعتبار نہیں قول و فعل کا ان کے
ہیں کلام سے گریں اے یار کس کس بات کا
اس چمن میں رنج کس کس سے نہیں پہنچا مجھے
آغازِ جوانی ہی میں پیرانہ سری ہے
کون دنیا میں بٹاتا ہے کسی کا دکھ درد
میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں وہ قاتل نہیں ملتا

آنکھ پڑتی ہے اسی پر جو کھلا ہوتا ہے
ہم جدھر دیکھتے ہیں جلوہ ادھر ہوتا ہے
بجز اپنے خوابِ غفلت کی یہی تعبیر ہے
تشخیص یہ ٹھہری ہے کہ تدبیر یہی ہے
نہیں معلوم مری موت کہاں رہتی ہے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے
اپنا ہی دل جو قبلہ نما ہو تو جائیے
باغ جاتے ہیں کہ صحرا دیکھیے
کیا چھیڑے حسن پرستی کی جسے خو ہو جائے
فردا کا وعدہ کر کے قیامت پہ ٹال دے
الفت یہ کہہ رہی ہے کلیجہ نکال دے
کوئی گھڑی کوئی ساعت کوئی پہر کوئی
کسی طرح نہ جھکا سر ہم ایسے مست ہوئے
سوتے تھے سر پہ جو دھوپ آئی تو بیدار ہوئے
ہم جو دیوانے ہوئے رونقِ بازار ہوئے
جب ہوا دل آئینہ آنکھوں کو حیرانی ہوئی
کبھی ہمارے ہوئے اور کبھی پرائے ہوئے
یہ کہانی دن کی ہو جائے نہ قصہ رات کا
شکوہ گلچیں کا کروں میں یا گلہ صیاد کا
وہ شام ہماری ہے کہ عالم ہے سحر کا
کون سر پہ بوجھ لیتا ہے کسی مزدور کا
گھر بھول گئی ہے مری تقدیر اجل کا

امان علی سحر!

تعارف:۔ ولادت و وفات معلوم نہیں ناسخ و برق کے شاگرد اپنی شہرت کی بدولت واجد علی شاہ کے دربار میں طلب ہوئے اور وظیفہ پایا بڑے جامہ زیب اور کپڑوں کے شوقین تھے غدر کے بعد وفات ہوئی۔

ہر خشک و تر میں تو ہے سبب ظہور تیرا — دل میں جگہ ہے تیری آنکھوں میں نور تیرا

حور بھی خلد میں ہوگی تو نہ ایسی ہوگی — آج ان پریوں میں دیکھا ہے اک انساں سا

گل اندا موں کے نقشے نقش دل پر ہو گئے ہیں — انہی صورتوں میں اس ویرانہ کو آباد ہونا تھا

وصال یار ہے مرنے پہ موقوف — جو یہ سچ ہے تو کچھ مشکل نہ ٹھہرا

قید دل لیے اہل شرع کی دیوانہ کرتا — کیسے گنہگار ہیں بے قصور ہم

جیتے جی انساں آتے ہیں فرشتے بعد مرگ — گھر یہ کیا ہے گور میں بھی کنج تنہائی نہیں

ایک معشوق وہ ہیں اور زمانہ عاشق — کیا کریں وعدہ فردا لے قیامت نہ کریں

کوہ پر فرہاد پہنچا دشت کو مجنوں گیا — ہم کہاں ہیں کچھ ہمیں اپنی خبر ملتی نہیں

بعد فنا بھی جیب ملے یہ یقین نہیں — کیا گردش آسماں کی زیر زمیں نہیں

خوش قطع کس قدر ہے قبا سے رہیں گی — دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں

دل دیا اللہ نے صدمے اٹھانے کے لیے — ہم فقط پیدا ہوئے تھے آزمانے کے لیے

راحت کی خوشی رنج کا کچھ غم نہیں رکھتے — طالب ہو کسی شے کا وہ دل ہم نہیں رکھتے

چلتے تھے تو مڑ کر ادھر دیکھ لیتے — کہ ہم اور اک نظر دیکھ لیتے

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے — تہ قبر ہم تو اکیلے رہے

گزار و ناتواں تھے لیکن نہیں گراں تھے — اک مشت استخواں تھے اور لاکھ امتحاں تھے

دنیا کو چھوڑ بیٹھے ہیں کوچے میں آپ کے — آکر کبھی تو سیر لب بام کیجیے

گردش چرخ سے تنگ آیا ہوں دم گھٹتا ہے — آخر اس گنبد بے در کی کہیں راہ بھی ہے

ہم بے بلائے تو نہیں جاتے خدا کے گھر
تب فرقت میں اٹھائے ہیں وہ ایذا ہم نے
زندگی ہے تو بہر طور گزر جائے گی
حشر میں حشر قیامت میں قیامت ہوگی
کچھ زمانے سے طبیعت بھی ہٹی جاتی ہے
پیہم جو تازیانہ تار نفس کے لگے!
راہ دکھلائی خوب وقت اخیر
پاس آ بیٹھے تو دل اٹھ گیا اک عالم سے
بہت پچھتائے تم کو پیار کر کے
میں پہروں تختۂ نرگس کو دیکھا ہوں سحر
فقط مقسوم سے اپنے گلا ہے
دل کا آئینہ اگر ہم نہ دکھاتے تم کو
کوہ و صحرا کے بھی وحشت میں نہیں کچھ پابند
آج جو کچھ کہ ہوا کل بھی وہی ہونا ہے
غریبوں کا کیسا مزاج مبارک
صدمے فرقت کے نہ اٹھے ہیں نہ اٹھیں گے سحر
ہے سامنے مرقع یاراں رفتگاں
عجیب لطف تھا کچھ ابتدائے وحشت میں
دل نے پھر دل سے راہ پیدا کی
آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے واسطے
کسی کی گور میں سونا نہیں ہے

جانا کہیں بغیر طلب کیا ضرور ہے
شکر کرتے ہیں تو ہوتی ہے شکایت تیری
کٹ چکی ہجر کی شب صبح بھی ہو جائے گی
فیصلہ اپنا اسی دن پہ اٹھا رکھا ہے
زندگی موت کے دھڑکے میں کٹی جاتی ہے
کوسوں سمند عمر گریزاں نکل گیا
آنکھوں کی راہ دم مرا نکلا!
اب جو اٹھ جاؤ گے اے رشک قمر کیا ہوگا
گناہ عشق کی پائی سزا خوب
بندھی ہوئی ہے عجب انتظار کی صورت
کسی سے کچھ نہیں شکوہ شکایت
آنکھ ہوتی نہ محبت کی نظر سے واقف
کر دیا عشق نے ہر قید سے آزاد ہمیں
کب یہاں مانتا ہے وعدۂ فردا کوئی
یہ پوچھو کہ بگڑی طبیعت تمہاری
صبح کے ہوتے ہی اپنا خاتمہ بالخیر ہے
روؤں بھلا سحر میں کس کس کو یاد کر کے
وہ ولولہ وہ جنوں اب کی سال بھی نہ ہوا
چھپ کے جانے کا راستہ نکلا!!
دیکھیں گے جو کچھ خدا دکھلائے گا
ہمیں کیا یار کے مذہب سے مطلب

آتش اور ان کے تلامذہ

آتش

بھڑکا کیا مرقع عالم کے حسن پر — ہر روز عشق اک نئی تصویر سے ہوا

جوش جنوں میں دیکھئے پیچھے نہ مڑ کے پھر — منہ جس طرف کو صورت دریا اٹھائیے

ہم کو در پردہ محبت غائبانہ عشق ہے — لن ترانی ان سے ہو سائل جو ہوں بدذات ہے

کرکے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل — بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیران ہو گیا

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

اس بلائے جان سے آتش دیکھئے کیونکر بنے — دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خو ہے دوست

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا!

فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب — بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر — دل سے دشمن کی جفاؤں کا گلہ جاتا رہا

کوئی زمانہ سے جاتا ہے کوئی آتا ہے — کسی کو کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

وہی سر کا پٹکنا ہے وہی رونا ہے دن بھر کا — وہی راتوں کی بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کیا کہوں وعدہ خلافی سے تری احوال شب — کھول کر دروازہ کو کرتا ہوں سو سو بار بند

تمام رات ہوئی کر گیا کنارا چاند — اتریئے بام سے تم جیتے ادھر ہارا چاند

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا — سلام جھک کے کرونگا جو پھر حجاب آیا

شیشہ میں جو ہے روشنی بادۂ گلگوں — فانوس میں یہ شمع کا عالم نہیں ہوتا

موسم گل کی ہوا نے کئے ساغر بیکار — بط مے اڑ کے لب جست کو چھو آتی ہے

سبوئے غنچہ ہے معمور و جام گل لبریز — ٹپک رہی ہے شراب ابر نوبہاری سے

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید | سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

آئینہ میں پری سے چہرہ کو دیکھتے تو | کیونکر بھلا محبت تم سے بشر نہ کرتا

منہ نہ دیکھا ہوتا اس رشک سے جلتا ہو شمس | اے صنم جب پوچھتے ہیں گیسو ترسا آفتاب

ایک گل ایسا نہیں ہو نہ خزاں جس کی بہار | کون سے وقت ہوا تھا یہ گلستاں پیدا

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا! | بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ قبر سکندر ہے نہ ہے گور دارا | مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی | گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

باغ جہاں کو یاد کریں گے عدم میں کیا | کنج قفس سے تنگ رہے آشیاں میں ہم

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے | سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ | ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں گر پڑا

کام کرتی رہی وہ چشم فسوں ساز اپنا | لب جاں بخش دکھایا کئے اعجاز اپنا

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو | گل تازہ کوئی اس باغ میں پیدا ہوگا

کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل پہ داغ ہیں | اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا

طلب دنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی | خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

تماشا گاہ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو | کسے اس انجمن میں یاد خلوت خانہ آتا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا | کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر | دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال | ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے | ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش | گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں کے نہ تھے | زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے نہ تھے

سعی لاحاصل مداوا اے مریض عشق ہے
تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

ناگفتنی ہے حال بہار و خزاں باغ
اک زخم ہے کہ خشک ہوا اور نم ہوا

صورت شمع ہوں ہر چند فروغ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

موسم گل کر دیا ان کی قبائے سرخ نے
چاک تا دامن ہزاروں ہی گریباں ہونگے

تم اندھیری رات میں الٹو جو چہرے سے نقاب
روئے رشک مہر ذروں کو جگائے خواب سے

وہ آب و رنگ کہاں روئے یار کا گل پر
ہزار آنکھ ہو نرگس کی وہ نگاہ نہیں

وہ رخسار ہے جو ہوتے ہیں مقابل
نکل جاتے ہیں دب کر چاند سورج

آئینہ نے کیا ہے جو صورت سے آشنا
گردن میں ان کی ہاتھ ہیں ان کے پڑے ہوئے

کرکے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل
بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیران ہو گیا

شوق ہے دل میں تو آنکھوں میں تصور اس کا
منزلیں جلوۂ محبوب کی آباد ہیں سب

آئینہ خیال کو منظور تو رہا!
جب سامنا ہوا تری تصویر سے ہوا

ہر لحظہ دگرگوں ہے مرا حال پریشاں
صورت نہیں ملتی مری تصویر میں میری

ہو گیا عشق حسن سے آگاہ!
پوچھتے کیا ہو ناگہانی کی

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامان یار
کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا

کارواں تک گرد واماندوں کو پہنچا گیا
اے جرس شاہد ہوں تیرے نالہ کی تاثیر کا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
اس بت کے آستانے کا پتھر رگڑ گیا

خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے
ارادہ کون سے در پر کروں میں دادخواہی کا

غنیمت جانئے دل جنبش ابروئے قاتل کو
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

دم آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے
رقیبوں نے محل باقی نہ رکھا عذر خواہی کا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

نہ چھوٹے گا چھڑائے سے ارے قاتل ترے تن کا
وفاداروں کے خوں کا داغ کیا دھبا ہے کچھ ہلکا

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کے نماز

بتوں کے قہر و غضب کا کسے ہے اندیشہ

نہ تجھے دماغ نگاہ ہے نہ کسی کو تاب جمال ہے

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں

نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا

ترک الفت کا ارادہ نہ کر آتش زنہار

خون ہوا جاتا ہے دل کیا دیدۂ تر خشک ہے ہو

ذات باری کو کیا ظلم بتاں نے ثابت

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر

گور میں بھاگ اہل دنیا سے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے

کرتا ہوں جو میں حسرت پرواز میں نالے

شرط وفا کی کسی بے وفا سے کی

نہ کسی کو کڑی کہی ہم نے

موسم گل میں جو ہوتا ہے زیادہ سودا

آتش آغاز محبت کا ہوا انجام بخیر

نہ روز حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے

رفیق حال برے وقت میں نہیں کوئی

کس طرف جا کر گروں میں سجدہ شکرانہ آج

خدا نہیں یہ پیغمبر نہیں امام نہیں!

انھیں کس طرح سے دکھلاؤں میں وہ جو کہتے ہیں کہ نہیں سحر

لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

دل دھڑکتا ہے جدائی کی شب تار نہ ہو

دل سے بیزار تو ہے جان سے بیزار نہ ہو

روز ناخن کے ٹوٹتے ہیں زخم کیونکر خشک ہو

عدل کرتے یہ اگر ان کی خدائی ہوتی

ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

خلوت اس انجمن سے بہتر ہے

تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے

صیاد کو غم ہے مری بے بال و پری کا

آتش سا عارف آگاہ بھولا

نہ کسی کی کڑی اٹھائی بات

دوڑتے پھرتے ہیں ہم باغ کی دیوار و در پر

خاک پر تیری قدم رنجہ گل اندام کرے

جفا سے یار کے آڑے مری وفا آئی

میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

شریک جنگ ہیں شمشیر کا نیام نہیں

نواب سید محمد خان رند

نبیرۂ نواب نجف خان وزیر اعظم ہند

۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا آتش کے شاگرد تھے ان کے بہت سے شعر اور مصرعے ضرب المثل بن گئے ہیں۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

بیٹھے تجھ سے بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

دیدۂ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

آنکھ لا سکتی نہیں تاب تجلائے جمال
عالم نور ہے اے حور سراپا تیرا

چشم وا رہ گئی اگر تیرے سامنے ہوئے اُس کے
ہو چکا ہوتا اگر رخ خوش رو پہ دھوکا تیرا

اختیار اتنا نہیں ہر بار بنے ایسی شکل
کھینچ گیا صانع ایجاد سے نقشہ تیرا

وقت شب تنہائی کی ٹل جائے تو اچھا
گھبرا کے یہ دم آج نکل جائے تو اچھا

کئے جو نالے تو نکلا بخار سینے سے
بھرا ہوا تھا ہمارے دل میں یہ دھواں کب کا

غرض نہ دیر سے مقصد نہ کعبے سے اے دوست
تجھی کو ڈھونڈھ رہا ہوں کہاں کہاں کب کا

جنون اب اور بتا کوئی شغل بیکاری
اڑا چکا ہوں گریباں کی دھجیاں کب کا

جو جس کے حق میں سمجھا وہ بہتر بنا دیا
مجھ کو فقیر تجھ کو تو نگر بنا دیا

غافل مقام رشک نہیں جائے شکر ہے
سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا

جام کو منہ سے لگانے کی نہ پہنچی نوبت
چشم مخمور نے ساقی کی یہ بیہوش کیا

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر
اور دو روز ہوا باغ کی کھالے بلبل

کیا ملا عرض مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

پھینک دوں گا میں ابھی چیر کے پہلو اپنا
تم پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

رہے گی کب تلک شبنم تر جائے گی
یہ ندی چڑھی ہے اتر جائے گی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

نہ تڑپے ترا دل یہ ممکن نہیں
محبت ہے کام اپنا کر جائے گی

ہجر میں کٹتی کیسے امید سحر
رات کالی خدا خدا کر کے!

بت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

یکساں ہے دم کی آمد و شد ہجر یار میں
آیا تو کیا ہوا جو نہ آیا تو کیا ہوا

نہ کھلواؤ میری زباں جب نہ ہو
کوئی بات منہ سے نکل جائے گی

بلبل کو سوئے رنگیں اپنا دکھا کے آئے
تو باغ کو گئے تھے یہ گل کھلا کے آئے

طبیعت کو تسکین دم بھر نہیں
الٰہی یہ کیونکر سنبھل جائے گی

(ص ۱۰ [illegible])

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

اجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

خبر نہیں کسے کہتے ہیں گل چمن کیا ہے
قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد

اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

قفس کو شام سے لٹکا کے فرش خواب کے پاس
سنا کیا میری تا صبح داستاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد

ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے

کس طرح ڈھونڈھ نکالیں تجھے جویائے ترے
نہ نشاں ملتا ہے تیرا نہ پتا ملتا ہے

پڑتی ہے آکے جان پر آخر بلائے دل :
یارب کسی بشر کا کسی پر نہ آئے دل

([illegible])

دل ہدفِ تیرِ نگہ پھر کیا تو نے
ہر آنہ ہے سوزِ جدائی سے سراپا
دل سینہ میں بیتاب ہے جان آئی ہے لب پر
دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست
پائی خبر جو آمدِ فصلِ بہار کی
شبِ فراق میں ہم سے تو نالہ کر نہ سکا
پوچھو نہ جلن کا دل کے احوال!
سُنا کہ آتشِ گُل نے جلا دیا گلشن
گلشن بغیر یار ہے کنجِ قفس سے تنگ
ناز و انداز و حسن و خوبی میں
خود بخود دل مرا افسردہ ہوا جاتا ہے
دل کو کس کس طرح بہلاتا ہوں میں
ہجر کی شب کروٹیں کیونکر نہ لوں
آشیاں کنجِ قفس میں نہ کبھی یاد آیا
پھر بھی بادیہ پیمائی کی پاؤں کو حسرت باقی ہے
مجنوں ہے کہیں کہیں ہے فرہاد
ناداں ہیں جو رکھتے ہیں امید کسی سے
کبھی خوفِ خزاں ہے اور کبھی صیاد کا دھڑکا
درد و غم و یاس و داغِ حرماں
دو دن کی حیات میں فلک سے
لب خشک ہیں ہمارے منہ زرد ہو گیا ہے -

اگلے ہی مرے زخمِ جگر تھے ابھی آئے !!
دیکھے تو کلیجے کے دکھاؤں تجھے چھالے
اب جان کو رو کے کوئی یا دل کو سنبھالے
ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آ کر کہاں تھکے
کیا پھڑپھڑا کے مرغِ گرفتار رہ گئے
وہ کون لوگ ہیں جو ضبطِ آہ کرتے ہیں
اک آگ پڑی دہک رہی ہے !
بجا کہ خاک ہوا آشیاں نہیں معلوم
ہم تو پڑے عذاب میں اے ہم صفیر ہیں
کون ہے تم سا اس کا نام تو لو
کچھ سمجھ میں نہیں آتا مرا کیا حال ہے آج
پر تصورِ یار کا جاتا نہیں
کوئی پہلو دل کو چین آتا نہیں
بند آنکھیں تھیں جو لیکر مجھے صیاد آیا
جنگل جنگل پھر آیا پھر بھی حسرت باقی ہے
اُلفت کی عجیب صورتیں ہیں
جز ذاتِ خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا
بناؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں
اک دل ہے ہزار آفتیں ہیں
کیا کیا شکوے شکایتیں ہیں
اب دل نہیں سراپا اک درد ہو گیا ہے

میری طرف سے کوئی صانع ازل سے کہے
بگاڑتا ہے جو مجھ کو بنائے گا پھر کیا

کھلکھلا کر نہ ہنسو میں نے کہا تھا ہم سے
قہقہہ سیکھ لیا کبک دری نے دیکھو

کیا جانیے کیا گیا دل عاشق سے کر گئی
ہر بار کی شوخی تیرے بے ساختہ پن کی

خیال یار میں جھپکی نہیں پلک تا صبح
تمام رات میں جاگا ہوں خواب لے گئے

مست کیا جانیں کہاں دیر ہے کعبہ ہے کہاں
عمر ساری تیری بھٹی پہ گذاری ساقی

آج تک دوسرا نقشہ نہیں کھینچا
محو حیرت ہے ترا صانع ایجاد ابھی

لطف یہ داد گلستاں ہے مجھے یاد ابھی
دل قفس میں نہیں لگتا مرا صیاد ابھی

المدد جوش جنوں وقت مددگاری ہے
سلسلہ چھٹتا ہے زنجیر کا دیوانوں سے

ہر روز ایک وادی نو سیر گاہ ہے
وحشت دکھا رہی ہے بیاباں نئے نئے

نہ غرض دین سے نہ دنیا سے سروکار مجھے
یاد میں تیری دو عالم کو فراموش کیا

رقص کے معنی کھلے اس بت کو رقصاں دیکھ کر
نامہ کی رفتار کا رکھا ہے اس نے نام رقص

کر دیں دل میں بھی پیدا خواص شیشہ کے
ذرا سی ٹھیس میں بس چور چور ہوتا ہے

دیکھیے چل کے ذرا عالم وحشت کی بھی سیر
بیڑی کٹ جائے اگر پاؤں سے دیوانوں کی

دن تو مر مر کے کٹا ہجر میں اس کے لیکن
جھیلنا ہے ابھی آفت شب تنہائی کی

رو کے رنگینی عرق فشاں ہے
شبنم گل سے ٹپک رہی ہے

فصل گل ہے کہ جو چلا رہے ہیں مے نوش
بادۂ رنگین پیا دو ساقی کوثر نوش

پوچھیے رند سے کیا ہو سبب مدہوشی
چشم مخمور نے اک مست کو بیہوش کیا

رند حاضر ہے شیشہ و ساغر
مے نہ سمجھو اگر حرام تو لو !!

گل کھلے بادے چھلکنے لگے پیمانوں سے
مست پھر نکلے بہکتے ہوئے میخانوں سے

تو نے کیا آتش حل کردہ پلا دی ساقی
پھونک ڈالا ہے جگر آگ لگا دی ساقی

درد دل دور کیے ساغر کی تاثیر
تیرے ہی ہاتھ سے اللہ شفا دے ساقی

میر وزیر علی صبا

تعارف:۔ ولادت معلوم نہیں سنہ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کے انتقال ہوا آتش کے مشہور شاگرد تھے۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے دو سو اور محسن الدولہ کے یہاں سے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا ایک دیوان (غنچۂ آرزو) یادگار چھوڑا صنعتوں کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھتے تھے خود کہتے ہیں ؎ اے صبا آپ رعایت نہ کریں لفظوں کی۔ زرِ گل پایا جو گلچیں نے تو کیا مال ہوا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اللہ رے ان کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے — کیونکر کوئی جئے گا جب یوں عتاب ہوگا

جائے عبرت ہے جہان بے ثبات — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا!

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں — وہ دن گذر گئے، وہ زمانہ گذر گیا

نہ کہئے نالۂ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر — سنی ہے تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آئے ہیں دم نزع وہ اغیار کو لیکر — کیا کہئے کہ کچھ کہنے کا ہنگام نہیں ہے

اک رشتۂ جاں سیکڑوں پھندوں میں پھنسا ہے — دنیا کے بکھیڑوں سے فراغت نہیں ہوتی

آئی بہار ہوتے ہیں دیوانے سنگسار — لڑکوں کی جھولیوں میں ہیں پتھر بھرے ہوئے

وہ زمیں پر قدم نہیں رکھتے — حسن کا کیا غرور ہوتا ہے

اے صبا جب بہار آتی ہے — ہم کو سودا ضرور ہوتا ہے

آغاز عشق ہی میں ہمیں موت آ گئی — آگاہ بھی نہ حال سے وہ بے خبر ہوا

یہ جوانی تو عجب سر پہ قیامت لائی — یاد ایام کہ گذرا ہے لڑکپن کیسا

لے اڑا تجھ کو ترا حسن شباب — اب تو عالم ہی نرالا ہو گیا

عازم دشت جنوں ہو کے میں گھر سے نکلا — پھر بہار آئی قدم پھر نئے سر سے اٹھا

نادان ہیں جو رکھتے ہیں امید کسی سے — جز ذات خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا

اٹھ کے پہلو سے کدھر آپ ہیں جانے والے — جگر و دل ہیں تڑپ کر نکل آنے والے

آپ اپنی بے وفائی دیکھئے ہم سے اور اتنی برائی دیکھئے

ذکر رقیب عاشق شیدا کے سامنے اچھی نہیں یہ آپ کی تقریر دیکھئے

اچھا نہیں ہے طور نگاہِ حضور کا ہو جائیگا کوئی نہ ہدف تیر دیکھئے

پیادہ پا ہیں رواں ہوئے لالہ زار ہوا بہار آتے ہی سر پر جنوں سوار ہوا

مثل حباب بحر جہاں میں نہ دم لیا اک موج تھا کہ میں ادھر آیا ادھر گیا

کسی کے وعدے کا وہ دھیان آتا ہے اٹک اٹک کے نکلتی ہے انتظار میں روح

سو بار مجھ پہ ہجر میں صدمہ گذر گیا اب تک نہ آیا خبر مرا نامہ بر گیا

تو عمر بھر دکھاؤں میں نقشہ جہاں کا اب دل عدم کی سمت سے آنا اگر ہوا

نہ روز حشر بھی جب اپنی داد کو پہنچا خدا کے سامنے اس بت سے شرمسار ہوا

جنوں کا ولولہ ہو قوت ہے بے سر بیاباں پہ الٰہی چھت نہ پڑے سقف فلک زنگار

وہ حال دل کا ہے جو صبا ہم بیاں کریں اللہ جانتا ہے بتوں کو یقیں نہ ہو

کبھی خزاں کبھی فصل بہار میں گذری کب ایک سی چمن روزگار میں گذری

بتوں کے عشق میں مجھ کو ہلاک کر ڈالا یہ کیا مشیت پروردگار میں گذری

جنوں کا داغ لگا گھر چھٹا اسیر ہوئے ہزار طرح کی آفت بہار میں گذری

مثال دیر بھری ہیں بتوں کی تصویریں الٰہی قصر دل خانماں خراب گرے

تا روز حشر یاد رہے گا یہ سانحہ نکلی ہے جان ہجر کی شب کس عذاب سے

کبھی رسائی آہِ جگر نہیں ہوتی ہمارے دل کی انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی

درازی شب تار لحد معاذ اللہ بغیر صبح قیامت سحر نہیں ہوتی

فراق یار میں یہ دیکھتے ہیں وہ ناصح ہے تسلی دل غمگیں مگر نہیں ہوتی

عجب نہیں مرے مرنے پہ آپ کا ہنسنا کسی کے دل کی کسی کو خبر نہیں ہوتی

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے امتحاں ہیں ایک مشت خاک کے

آدمی دعوے انا الحق کا کرے
دلو لے دیکھو تو مشتِ خاک کے

توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو
کھول دے پر طائرِ ادراک کے

سنا جو واعظ سے زیادہ صفت جنت کا
اٹھے مسجد سے اور کوئی بت بے پیر ہو آئے

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے
جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے

شبِ فراق سے بچ جائینگے تو جانینگے
کچھ اور زندگی مستعار باقی ہے

ہزار بار قیامت گذر گئی ہم پہ
مگر ہنوز شبِ انتظار باقی ہے

شبِ فراق میں تا صبح دیکھئے کیا ہو
ابھی تو رات دلِ بیقرار باقی ہے

کسی کو دیکھ کے قابو میں جی نہیں رہتا
یہ روگ آج تک اے جانِ زار باقی ہے

ہر گز نہ کوئی ملک عدم سے پھر آئے گا
عالم اگر یہی ہے جہانِ خراب کا

داغ جسکا چلی نسیم بہار !
یہ ہوا میں چراغ کس کا ہے

کہتے ہیں سب ترے رخِ پرنور کیلئے
زیبا تھا یہ چراغ سرِ طور کے لئے

ہلتا ہے عرش نالۂ بے اختیار سے
اتنی تو بات ہے دلِ رنجور کیلئے

بنت العنب پہ بھی توجہ نہ کی مگر
زاہد یہ جی سے وار رہا حور کیلئے

ہم عاشقوں کی خوبیِ تقدیر دیکھئے
آپ اپنی آئینہ میں تو تصویر دیکھئے

تیرے شبِ چہار دہم کے بناؤ سے
دو دن میں ماہتاب کا چہرہ اتر گیا

نکھر کہتے نہیں ہیں دیوانے
باعثِ غم شعور ہوتا ہے

ہم نہیں مجبور آپ ہیں مختار
کہئے کس سے قصور ہوتا ہے

گر محبت کا دل میں داغ نہیں
خانۂ کعبہ ہے چراغ نہیں !

کس دن شبِ غم جان کو آفت نہیں ہوتی
کب شام ہے یاں صبح قیامت نہیں ہوتی

اللہ ہمیں عشق کے پھندے سے نکالے
دم توڑتے ہیں قطع محبت نہیں ہوتی

خدا کا قہر بتوں کا عتاب رہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

نہیں ہے اہلِ ہوس کیلئے حلاوتِ عشق — نصیبِ مور و مگس نیشکر نہیں ہوتی

کس طرح ہجرِ صنم میں کوئی دل کو سمجھائے — یہ کہاں سے کوئی پتھر کا کلیجہ لائے

دل لگانا عذاب ہوتا ہے — آدمی کیا خراب ہوتا ہے

میخانہ عالم میں غنیمت ہے مرا دم — اتنا بھی کوئی رند مے آشام نہیں ہے

جو دیکھے گا اس کو وہ اسی کی سی کہے گا — تیرا کوئی اے دل نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

ملا دی خاک میں میری جوانی! — خدا سمجھے بتِ بیداد گر سے

شوقِ دیدار میں طاقت نہیں گویائی کی — حالتِ دل کا اشارہ ہی بیاں ہوتا ہے

مجرمِ عشق ترحم کا سزاوار نہیں — ہائے کس پاس سے ہر سو نگراں ہوتا ہے

اس آفتاب رخ سے جو کبھی سامنا ہوا — مہتاب چھپ گئی رخِ ماہِ تمام پر

دمِ آغازِ جنوں طوق گلوگیر ہوا — غل مچانے بھی نہ پائے تھے کہ صیاد آیا

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا — پیرہنِ گل کا نہ اترا ابھی میلا ہو کر

قدِ قیامت کا ملا چال بلا کی پائی — آفتیں ڈھائیں نہ یہ فتنہ دوراں ہو کر

ہم کو تو مل کے حسینوں سے بہت رنج ہوئے — خوش رہا کرتے تھے پریوں میں سلیماں ہو کر

جا کے مسجد کی طرف اس بتِ غارتگر نے — لوٹ لی زاہدوں کی دولتِ ایماں کیونکر

حسیں کوئی نظر آیا ہوا ہے آپ سے باہر — دل بیتاب ہے سینہ میں یا پارہ ہے معدن میں

یہ نشاں ہے مزارِ عاشق کا! — چادرِ گل نہیں چراغ نہیں

اٹھے خرامِ ناز کو وہ دھوم پڑ گئی — فتنہ بپا ہوا ہے قیامت کہیں نہ ہو

پھاہا رکھے کس طرح مرہم لگائے کس طرح — کیا کرے وہ جس کے دل میں عشق کا ناسور ہو

کچھ اثر آہ میں جو پیدا ہو! — قہر ہو جائے حشر برپا ہو

خاموشی میں دل سے وہ رہا کرتی ہیں باتیں — گویا کہ زباں سے ہمیں کچھ کام نہیں ہے

واعظوں سے کوئی تعریف سنے حوروں کی — مسجدوں میں تو قیامت کا بیاں ہوتا ہے

نگیر تو سے آنکھیں آدم خاکی کی روشن ہیں / شعاع مہر سے ہے نور ہر اک چشم روزن میں
جام جم ہے جو چشم بینا ہو ! / آئینہ ہے جو دل مصفا ہو
ایک ہی نور کا زمانے میں / سو طرح سے ظہور ہوتا ہے !
اتنی تو دید عشق کی تاثیر دیکھئے / جس سمت دیکھئے تری تصویر دیکھئے
دل کی صفا سے رونق بزم یقیں رہے / آئینہ جمال جہاں آفریں رہے
اور ہی حال زمانے کا نظر آئے گا / آگہی کر تو ذرا فقر و غنا سے پیدا
رتبہ دیر و حرم گبر و مسلماں سمجھے / منزلت اپنی نہ کی ذہن رسا سے جدا
تازہ دماغ جاں کلمہ فقر سے ہوا / سامان کیا گیا کہ برا درد سر گیا
کعبہ کی سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر / تو کس طرف تھا دھیان ہمارا کدھر گیا
کہیں معشوق کہیں عاشق مرا دل سمجھا / تجھ کو ہر بزم میں اے رونق محفل دیکھا
طائر عقل کو معذور کیا زاہد نے / پر پرواز میں تسبیح کا ڈورا باندھا
صبح محشر ترے عشاق تجھے دیکھیں گے / ذرے خورشید سے ہیں آنکھ لڑانے والے
جامہ یار کی بانی ز صبانے خوشبو / لپٹ غنچہ دگل باغ میں کھولا باندھا
ساقی کی چشم مست نے ایسے ہوش اڑائے / شعلہ سا ایک آتش تر سے نکل گیا
ہمیشہ کوشش دنیا میں اضطراب رہا / بہت خراب دل خانماں خراب رہا
خون کی جا ہے نہ چھیڑو دل سودا کو مرے / آگ نکلے گی جو کسی نے کہیں خنجر توڑا
نور رنج سے ہم حقیقت جو واجوئی / دروازہ کھل گیا تو میں گھر سے نکل گیا
بچ کر کہاں تھی انکی نظر سے نکل گیا / اک تیر تھا کہ صاف جگر سے نکل گیا
تو جہاں رہ گئے ہم کچھ خبر نہیں / آیا کدھر سے یار کدھر سے نکل گیا
نہ نفے سے ہجر یار میں تسکین ہو گئی / دل کا بخار دیدہ تر سے نکل گیا
بختی دہر سے کیا خوف دل عاشق کو / یہ وہ شیشہ ہے جو لڑ جائے تو پتھر ٹوٹے
زخم کھل گئے ہوئے کیف شراب سے / انگور پھٹ گئے طپش آفتاب سے

میر دوست علی خلیل

تعارف: میر سید جلال علی کے بیٹے دوست علی نام خلیل تخلص۔ واجد علی شاہ کے عہد میں چکلہ دار تھے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے غدر میں باغیوں کی فوج کے ایک حصہ کے کمانڈر تھے اور بڑی بہادری سے لڑے حضرت محل اور برجیس قدر کے ساتھ نیپال کی ترائی تک گئے کہ انگریزوں کی طرف سے عام معافی کا اعلان سنا بارہ ہزار مار کے مرنے والے جوانوں کو ساتھ لے کے معافی کے لئے آئے کہ اگر اس اعلان میں دغا ہو تو بہادروں کی طرح لڑ کے جان دیں مگر انگریزوں نے معاف کر دیا۔ ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کے ساتھ کلکتہ بھی گئے تھے۔

شاعری میں خواجہ آتش کے رشید شاگرد تھے اور ان کی خبر گیری میں پیش پیش رہتے تھے۔

ایک دیوان گلزار خلیل یادگار چھوڑا ولادت اور وفات کا رنگ کوئی علم نہیں ہوا غالب خیال یہ ہے کہ جس سال غالب کی وفات ہوئی اسی سال خلیل نے بھی رحلت کی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بحر کرم ہے جوش میں رب غفور کا — حیلہ ہی چاہیئے ہے وہ عفو قصور کا
جلوہ ہے داغ دل میں کسی ماہ نور کا — یہ تو مرے چراغ میں ہے شمع طور کا
ہوں وہ آوارہ کہ منزل میں بھی رستی گرد سفر — چھوڑتا قبلہ نما لاکھ مجھے گھر ملت
لاکھ پردوں میں بھی ہو جاتا ہے وصل حسن و عشق — شمع کی روشنی چھپا لے جو وہ پروانہ ہوا
گھس لئے ہیں جوشش وحشت نے سراپا — کیا سمجھتا تھا جنوں یوں سر دھن جانے کا
جنوں کا زور ہوا شوق سیر باغ ہوا — بہار آتے ہی گل عقل کا چراغ ہوا
خیال چہرۂ روشن ہے داغ دل چمکا — چراغ طور سے روشن مرا چراغ ہوا

نہ زندگی میں ملا چین صورت بسمل
رواروی میں جوانی کا کچھ مزا نہ ملا
ہر رنگ میں اس شوخ کا جلوہ نظر آیا
جب یار کو دیکھا نگہ دیدۂ دل سے
پرتو سے ترے دیکھتا ہوں نقش عالم
وہ رنگ ہے ترا کہ ترے رنگ کے آگے
آنسو بھرے ہیں آنکھ میں گرتے نہیں مگر
اس درجہ ہوش اڑا دیے جلوے یار نے
میر مرنے کا سبب ہجر میں کیا پوچھتے ہو
منہ نہ محشر میں بھی دکھلائے گا
فرقت میں اجل کا سامنا ہے
ہے داغ سے آپ روئے عاشق
چین دم بھر نہ مجھے صورت بسمل آیا
دل نہ قابو میں رہا متصل پہلوئے یار
دل گزرگاہ خیال بت زیبا نکلا
نہ مجھ سا بلبل شوریدہ سر عدو پیدا
راز دل کیا کہوں کاغذ ہے یہ فرشتے ہیں سواد
خود تقدیر کا شکوہ ہے عبث
بسر کی عمر عصیاں میں ہر نفس کردہ دل جھکا کر
اللہ رے اضطراب دل بیقرار کا
کیا کشمکش میں عشق نے ڈالا ہمیں کیا کروں

چھٹی جو روح بدن سے تو پھر قرار آیا
مسافروں کی طرح چار دن شباب رہا
خورشید کے مانند وہ ہر جا نظر آیا
قطرہ نظر آیا تو وہ دریا نظر آیا
نور روشنی دیدۂ بینا نظر آیا
جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا
آخر چھلک چھلک کے یہ پیمانہ رہ گیا
اٹھا جو بزم یار سے وہ بے خبر اٹھا
غم ہوا درد ہوا درد کا درماں نہ ہوا
بھیڑ میں اور بھی شرمائے گا
یہ وقت ہے سخت بے کسی کا !
تمغہ ہے یہ عشق و عاشقی کا
آگیا منہ کو کلیجہ جو کہیں دل آیا
ناؤ ڈوبی مرے نزدیک جو ساحل آیا
کعبہ سمجھے تھے جسے ہم وہ کلیسا نکلا
نہ تجھ سا گل چمن روزگار میں آیا
کہیں موقع مجھے ملتا نہیں تنہائی کا
اس نوشتہ کا ہے بیکار جواب
الٰہی توبہ الٰہی توبہ گناہ کیے ہیں چھپا چھپا کر
مر کے صبح کی ہے شب انتظار میں
یار اختیار میں نہ اجل اختیار میں

بزم بتاں میں چھوڑ دیا دل کو بے خطر — شیشہ کو ہم نے پھینک دیا کوہسار میں

زندگانی کا سبب عاشق کی ہجر یار ہے — زیست پروانے کی وصل شمع محفل میں نہیں

ہو نہیں سکتا ہے محسوس نظر نور نگاہ — کہ باطن ہیں جو ترے طالب دیدار ہیں

جوانی میں بڑھاپے میں دل بے غم نہیں ہوتا — بہار زندگی کا لطف ملتا ہے لڑکپن میں

ہوں بندۂ عشق بتاں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
مذہب ہی جدا ہے الفت کا یاں کفر نہیں اسلام نہیں

فصل گل میں مے و معشوق سے توبہ کی ہے — وہی خطا ہے میں خجل ہوتا ہوں کیا کیا دل میں

چشم دل سے جو یار کو دیکھے — پھر کوئی بیچ میں حجاب نہیں!

خاکساروں ہی سے منزل کا پتہ ملتا ہے — نقش پا رہبر دل کو راہ نما ہوتے ہیں

ہر موسم گل میں طوق و زنجیر — توبہ کی طرح سے ٹوٹتے ہیں

زباں دراز محبت بزم عالم میں نہیں کوئی — سناتا ورنہ حسن و عشق کی میں داستاں برسوں

ہجر میں موت ہیں حیات کے دن — نظر آتے نہیں نجات کے دن

ہم سن چکے ہیں طور و تجلی کی داستاں — اے بت نقاب رخ نہ اٹھانا جلال میں

روز الست سے ہے وہ میرے خیال میں — اللہ کب سے محو ہوں شوق وصال میں

عقدہ نیاز و ناز کا ہرگز نہ حل ہوا — آیا نہ حسن و عشق کا قصہ خیال میں

پھر وہی طول شب ہجر نظر آتا ہے — پھر وہی ہے مجھے دھڑکا کہ سحر ہو کہ نہ ہو

تم سنو یا نہ سنو نالے کئے جاؤں گا — درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو

جمال حور کا مٹی کی مورتوں کو دیا — کمال صنعت پروردگار کو دیکھو

جگر شق ہو گیا داغ جگر سے — یہ ٹہنی پھٹ پڑی بار ثمر سے

نہ دیکھا ایک دن بھی بھر کے ان کو — رہا دستور اپنی بھی نظر سے

الٰہی روز کا رونا کہاں تک — کلیجہ منہ کو آیا چشم تر سے

نہ موافق کبھی طبع بت نے پیر ہوئی
شب تو مر مر کے سحر کی غم تنہائی سے
اپنے نالوں سے گلستاں میں ہوا باندھ کے ہم
دیں گے ہم عشق جوانی کو بڑھاپے میں فروغ
ہوتے ہیں ہشیار جو حیراں ہیں ازل سے
بدلے یہ گلستان جہاں رنگ ہزاروں
معلوم ہوا جامہ صد چاک سے گل کے
پیدا ہزار رنگ ہیں نیرنگ حسن سے
کچھ رنگ ڈھنگ جوش جنوں کے ہیں بے طرح
ڈر سے کہہ سکتے نہیں جس بن آتی ہے بہار
ہوا شباب مرا شیب کیا قیامت ہے
یہ رہائی سے گرفتاری میں پایا ہے مزا
رہائی ہے قفس گردوں سے پائی قبر میں جا کر
کیا بتاؤں میں تجلی گاہ کہیں شوخ کی
کچھ نہ پوچھو بتا نہیں سکتا
آسماں و زمیں شکنجہ ہے
دل ہی دل میں گفتگو رہتی ہے باہم روز و شب
جوانی میں بڑھاپے میں دل بے غم نہیں ملتا
مسلماں جانتے ہیں شمع قندیل حرم تجھ کو
ڈیاں ہجر کی ایذائیں کہاں تک رگ دل
زاہد ہی ڈر سے نہیں دیکھتے اس کی بجا

یہ بھی میرے لئے گویا میری تقدیر ہوئی
دیکھئے ہجر کا دن کیا مجھے دکھلاتا ہے
ایک دن جو صلہ مرغ چمن دیکھیں گے
جو ہر نشہ صہبائے کہن دیکھیں گے
آئینہ کی حیرت کسی صورت میں نہیں جاتی
خوشبوئے گل داغ محبت نہیں جاتی
کپڑے بھی پھٹے ہوں تو شرافت نہیں جاتی
گلدستہ بہار ہے تصویر یار کی
گزرے الٰہی خیر سے مدت بہار کی
منہ کو تکتے ہیں اسیران قفس صیاد کے
تری بہار کو دیکھیں مری خزاں دیکھیں
پڑھتے ہیں کلمہ اسیران قفس صیاد کا
نکالا ہے زمیں کو کھود کے دروازہ زنداں کا
ہوش آئے کس طرح سے بے خبر کیوں ہو گیا
کس سے چھوٹا ہوں کیا نہیں ملتا
چین اس میں ذرا نہیں ملتا
میرے اس کے درمیاں تقریر کی حاجت نہیں
بہار زندگی کا لطف ملتا ہے لڑکپن میں
چراغ دیر ہے تو اے صنم چشم برہمن میں
یا الٰہی مری مشکل بھی ہو آساں کہیں
کہ تلف مفت میں ہو جائے نہ ایماں کہیں

میر سیادت حسین عرف آغا ہجو شرف

آتش کے شاگرد واجد علی شاہ کے مصاحب اور سمدھی ان پڑھ تھے مگر کلام اغلاط سے پاک اور پختہ ہے ان کا ایک خاص رنگ ہے دیر و بتکدہ۔ صنم و برہمن ناقوس و قشقہ زنار و تسبیح زاہد و مصلی موذن رند واعظ شیخ و میخانہ شیشہ و ساغر ساقی و پیر مغاں جام و صراحی کا ذکر نہیں آنے پاتا تھا کہتے تھے کہ جن شعروں میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں ان سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے
راجہ امیر حسن خانصاحب (محمود آباد) نے ان کا دیوان چھپوا دیا ہے مجھے دیوان نہیں ملا تذکروں اشعار نقل کئے ہیں اگر دیوان مل جاتا تو انتخاب کچھ اور ہوتا۔

جھپٹنا وقت سے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

منزل عشق کا حال آپ میں آلوں تو کہوں
دم ذرا لینے دو میں دل کو سنبھالوں تو کہوں

کون ہے جس سے فسانہ کہوں دل اپنا
سننے والا کوئی پہلو میں بٹھالوں تو کہوں

پوچھتے کیا ہو حقیقت مری بیتابی کی
آدمی تم کو کلیجہ سے لگالوں تو کہوں

پھڑک کے جان نہ دیتا تو وہ کیا کرتا
قفس سے دور نکلنے کی راہ کیا کرتا

چہار سمت مجھے تو ہی تو نظر آیا
اٹھا کے آنکھ جدھر انتظار میں دیکھا

اے سر دا حسن پرستی کا مزا اتنا مجھ کو
دل دیا اس کو جسے پیار کے قابل سمجھا

شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی ہوئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

واہ ری تقدیر ہم جب پہنچے بزم یار میں
شمعیں سب گل ہو چکی تھیں ختم بزم رات تھی

دے گا خاک یہی اک دن قسم دنیا کا
یہ کارخانہ ہے مشت غبار سے پیدا

بے نیازی یہ انھیں ناز مرے دم تک تھا
لن ترانی کی نہ پھر آئی صدا میرے بعد

داغ ہجراں جگر و دل میں نہاں رکھتے ہیں
آپ کا حسن نہیں ہے جو چھپا ہی دیکھیں

کام عمر نہ بیٹھے کہیں ٹھکانے سے
لیے پھری ہمیں دن رات جستجو تری

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ
اندیشۂ اجل سے نہ مہلت کبھی ملی
کمالِ ربط دلِ بے قرار میں دیکھا
دو روزہ ہے بہارِ عمرِ انساں ہائے عالم میں
گلوں کی شکل کبھی ہم نے نہ آنکھ سے دیکھی
دل کو بچاؤں یار کی ترچھی نظر سے کیا
پانی ہو جانے کو وہ ہے یہ لہو ہونے کو
کچھ بس نہ میری گردشِ قسمت سے چل سکا
لی راہ جب مجھے دریا نے ہم میں پانی سے بچے
موجد جو نور کا ہے وہ میرا چراغ ہے
روح رخصت ہے جگر خون ہے دل پرزے پرزے
یوں مجھ سا یہ سمجھا گیا ہو اسے بھی صیاد جانتا ہوں
اک بات ہمیں بانی جو شوخیِ یار کی
شمار کون کرے گا تمہارے کشتوں کا
زلف سلجھے گی تو شانہ سے الجھ جائے گی
سودا بنا جو گر کے مجھے بے نشان کیا
یہ ہمیں بند پھیر ہٹیں آ پھیر ہر طرف
نعیباں تک جیتے جی عالم ہوا اس پر اس قدر کم ہے
سینوں کو خدا نے جس کے سانچے میں ڈھالا ہے
کسی کے عشق میں یارب آنکھ ہو نیچی
اس کو حیرت ہے ادھر مجھ کو ادھر سکتہ ہے
اس مرے سجدہ کا دنیا میں ٹھکانا ہی نہیں

چمن میں رنگ نے لایا ہرا لہو کیا کیا
جو لطفِ زندگی تھا وہ حاصل نہ کر سکا
کہ عمر بھر اسے پہلوئے یار میں دیکھا
غرض یہ چلتی پھرتی چھاؤں ہے عالم جوانی کا
بہار آتے ہی ہم کو اسیر ہونا تھا
پہلو تہی کرو دل میں قضا و قدر سے کیا
نہ بھروسا ہے جگر کا نہ بھروسا دل کا
جگر میں لاکھ طرح آسماں رہا
نہ کوئی آشنا نکلا نہ کوئی ناخدا نکلا
یہ وہ ادا ہوں میں انجمن کائنات کا
آج شیرازۂ ہستی ہے پریشاں اپنا
بیمار دل نے توڑ دیا ہے گماں قفس کا ہے آشیانہ
ہم نے بھی اپنی جان لٹا دی قضا کے ساتھ
یہ بے شمار ہیں ان کا شمار کیا ہوگا!
دل جب الجھے گا تو کوئی نہیں سلجھانے کا
کیا جانے اس نے میری طرف کیا گمان کیا
محشر میں اس کو ڈھونڈنے کی راہ کیا کرو
دیکھے کسی نے ہاتھ اس کا دستِ قدرت میں
حقیقت میں یہ سب آئینہ و تصویر ہوتے ہیں
کلیم طور پہ جائیں میں عرش پر جاؤں
یار تصویر ہے آئینہ دیوار ہوں میں
جان کا کام ہی جو ہے ہیں کچھ نہیں دنیا ہو

پنڈت دیا شنکر نسیم!

تعارف:- لکھنؤ کے کشمیری برہمن علم و فضل میں مشہور ہیں۔ بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز ان میں پیدا ہوئے۔ کول۔ چکبست۔ بشن۔ نرائن کے مشہور خاندان میں نسیم کو ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس برس کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے۔ ۱۲۵۴ھ میں مثنوی گلزار نسیم لکھی ہے اس سے ایکا ایکی ان کی شہرت ہو گئی۔

۱۲۶۰ھ میں یعنی تصنیف کے چار برس بعد یہ مثنوی چھپی اسی سال ہیضہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۲ سال کی تھی۔ ۵

للہ اس بت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

جب ہو چکی شراب تو میں بست مر گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص — یہ چاند اس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا

جنوں کی چاک زنی نے اثر کیا دل بھی — جو خط میں حال لکھا تھا وہ خط کا حال ہوا

بہار رفتہ پھری اب ترے تماشا کو — چمن کو میں قدم نے ترے نہال کیا

اشک ٹپکے حالِ دل کا کھل گیا — دیدۂ گریاں سے پردہ کھل گیا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ — بند کیں آنکھیں تو رستہ مل گیا

بجز گور غریباں نقش پا ملتے نہیں آگے — یہیں تک ہر مسافر نے پتہ پایا ہے منزل کا

بت خانہ کا پابند نہ کعبہ سے تعلق — آزاد ہے قیدوں سے گرفتار تمہارا

شب فراق میں آنکھیں لگی ہیں جانب در — لبوں پہ آہ ہے دل میں خیال آہٹ کا

دل بدل آئینہ ہے دیر و حرم! — حق جو پوچھا یک در ہے دو طرف

بے حجابی پردہ در پردہ جو آ جاتے ہیں — شرم رکھ لیتی ہے آنکھوں پہ نظر کا پاس

تجھے دل دیکے میں نے آزمایا !
جنبش ہوئی مژہ کو تو برہم ہوئے دو کون
تجھے بجو زلف دیدہ تر دل بھی آ پھنسا
شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم
جوہر تیغ نگہ کھل جائے گا
جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
کچھ تو ہو گا ہجر میں انجام کار
دل سے ہر دم ہمیں آواز یہ آتی ہے
دوزخ وحشت ہے اب میری نظر کے سامنے
خواب میں شب کو خیال آیا تھا جنت کا ہمیں
نظارہ بازی سے آنکھیں تو پا چکیں تسکین
نام پر حرف نہ آنے دیجیے
کیوں خفا رشک جور ہوتا ہے
ایک اقلیم میں دو شاہ نہیں رہ سکتے
جو چپ ہوں تو جنوں دل میں جوش کھاتا ہے
سیر بیاباں چاک گریباں !
صبر رخصت ہو تو جانے دیجیے
نام پر حرف نہ آنے دیجیے
ٹکڑے جگر کے آنکھ سے باہر نکل گئے
بیدار ہیں بخت خفتہ سحر

وہ دیکھا جس نے کچھ کھویا ہے ہمارے
آہوئے چشم یار کی یہ ایک جست ہے
مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے
کہتے تھے پارسی کہ یہ آتش پرست ہے
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی
شاخ گل ایک روز جھونکا کھائے گی
بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائے گی
بند کانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے
گھر رقیبوں نے بنایا اس گھر کے سامنے
صبح دیکھا تو پڑے ہیں تیرے گھر کے سامنے
تسلی دل امیدوار باقی ہے !
جان اگر جائے تو جانے دیجیے
آدمی سے قصور ہوتا ہے
عشق جب آیا تو آرام کہاں رہتا ہے
فغاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے
وہ پائے مردی یہ دسترس ہے
بیقراری آئے تو ٹھہرا دیجیے !
جان اگر جائے تو جانے دیجیے
ارماں آج دل کے ہمارے نکل گئے
یارب آنکھوں کو خواب دیدے

مجھ سے پہلے کوئی اس شوخ پہ کب مرتا تھا
ملک الموت ہوا میری قضا سے پیدا

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے
یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

شب جو آیا بزم میں وہ شعلہ رو
شمع گل کرنے کو پروانہ جلا

صہبا کشوں کی خاک ہے ہر اک مقام پر
ساقی لنڈھا شراب کو مستوں کے نام پر

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
واللہ ہوشیار ہے وہ جو کہ مست ہے

کچھ خبر ہے شب دراز فراق
چاک پیراہن سحر کیوں ہے

عشق کے رتبہ کے آگے آسماں بھی پست ہے
سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

خم نہ بن کر خود غرض بن جائیے
مثل ساغر اوروں کے کام آئیے

ابرِ رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے

اب آپ چشم میں آ ہو بسیں
ہم سے وحشت کی کیجئے آئیے

دل لگا کر اس نے ٹھانی جی میں دشمنی
بڑھ کے ہو جاتی ہے آخر دل لگی میں دشمنی

طوفان نوح اس میں ہو یا شور حشر ہو
ہونا جو ہے وہ ہوگا جو گزرا گذر گیا

بے دل جو مجھ کو پایا تو بولا خیال یار
مہماں بلا کے صاحب خانہ کدھر گیا

کس سوچ میں ہو نسیم بولو !
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

زنجیر جنوں کڑی پڑے لو !
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

آتا ہو تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے

گل ہو گئی چراغ سحری اے بلبل
ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صدا آتی ہے

آغا حسن امانت

شاگرد دبیر

تعارف۔ ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے ۱۲۷۵ھ میں انتقال ہوا۔ لفظی رعایت میں مشہور ہیں اور اکثر بے ڈھنگا پن پیدا ہو گیا لوگ اسی کو انکا امتیاز سمجھتے ہیں اور ایسے ہی اشعار پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کے یہاں اچھے شعر بھی ہیں آج ہم آپ کو ان کے اچھے شعر سناتے ہیں ؎

روح کو راہ عدم میں مرا تن یاد آیا — دشت غربت میں مسافر کو وطن یاد آیا
جیسے بھول گئے رنج و محن یاد آیا — رو دیا میں نے قفس میں جو چمن یاد آیا
برگ گل دیکھ کے آنکھوں میں ترے بھر گئے لب — غنچہ چٹکا تو ترا لطف سخن یاد آیا
آہ کیوں کھینچ کے آنکھوں میں بھر آئے آنسو — کیا قفس میں تجھے اے مرغ چمن یاد آیا

بتوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا — یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

گلشن دہر میں ملک آئی برس دن میں بہار — اس بیکس وطن کو بھاری ہوئی منزل کیلئے

وہ بت مجھ سے ناحق خفا ہو گیا — خداوند عالم یہ کیسا ہو گیا

نکالی غنچہ نے بات اس کے مسکرانے کی — ہنسی ہنسی میں یہ مجھ کو رلائے گا پھر گیا

ہے فصل بہاری میں یہ صیاد کا دھڑکا — دل اڑ گیا بلبل کا جو پتہ کہیں کھڑکا

روشن دلوں کو بلا و حوادث سے کیا گزند — صرصر سے گل ہوا نہ چراغ آفتاب کا

کون تھا بار غم عشق اٹھانے والا — مجھ کو پیدا جو نہ کرتا تو خدا کیا کرتا

لطف اب زیست کا اے گردش ایام نہیں — مے نہیں یار نہیں شیشہ نہیں جام نہیں

فریاد ہجر میں نہ کبھی عمر بھر کریں — مر جائیں بھی تو ہم نہ کسی کو خبر کریں

فصل گل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو — ساقی مدہوش ہو مے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو

بزم عالم کے حسینوں میں عجب اندھیر ہے — جان یوں پروانہ دے اور شمع کو پروا نہ ہو

یک بیک شب کو جو وہ رشکِ قمر آ نکلا — چاندنی کھل گئی فوراً مرے سارے گھر میں

کر سبک تن کو مرے مثلِ حباب اے غمِ یار — روح کہتی ہے کہ پوشاک بہت بھاری ہے

بچا لیجئے گا بات مری مان لیجئے — میں جان دوں گا آپ پہ یہ جان لیجئے
لب خشک چشم تر ہے زباں لال چہرہ زرد — عاشق کو شکل دیکھ کے پہچان لیجئے
ہرگز لگائیے نہ امانت بتوں سے دل — کہنا مرا خدا کے لئے مان لیجئے

کس کے نالوں نے کیا بزم کو لرزش مضطرب — آج کیوں شعلۂ آواز ترا مدھم ہے
دورِ ساغر میں نظر آتی ہے ساری دنیا — جم گیا جام کا جب رنگ تو ساقی جم ہے

بہار آئی ہے گلشن میں گھٹا جاتا ہے دم اپنا — قفس کے در کو وا کرتا نہیں صیاد کیا کیجے

دل مرا اسیرِ چمن سے نہ ہوا شاد کبھی — لے گیا باغ میں بھولے سے نہ صیاد کبھی
بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز — ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

وہ دم حسینوں کا بھرتا ہے ہو چکی مری زیست — جو خود مریگا کسی کو جلائیگا پھر کیا
خط اُن کا دیکے مجھ کو نامہ بر نے بیٹھا اک گالی — کہا میں نے یہ کیا بولا کہ پیغام زبانی ہے

تارے بنا کے سر پہ رکھے آسماں نے — ذرے کچھ آ گئے جو ترے نقشِ پا کے ساتھ

آئی بہار ساقیا جام شراب دے پلا — پھول کھلنے لگے شجر ابر اٹھا چلی ہوا

آنگی بہار کے لئے اے پنجۂ جنوں — دو چار تار ہم نے گریباں میں رکھ لیے

جو غرق ہوا پھر نہ لگا اُس کا ٹھکانا — ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے

مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یار خبر لے — اب جان سے جاتا ہے یہ بیمار خبر لے
کس غم کو ہم اس دل پہ گوارا نہیں کرتے — شکوہ ترا پر اے ستم آرا نہیں کرتے

لطفِ یار ایک گھڑی ہجر کا برسوں غم ہے — فرصت عیش زمانے میں نہایت کم ہے

اللہ رے ہجومِ گل و جوشش بہار — ملتا نہیں ہے میرا آشیاں مجھے

تیری بھووں میں بل پڑا قتل ہوا یہی تیغ سے — تری اِدھر پلک جھپی مجھ پہ اُدھر چلی چھری

عریاں رہا جنوں میں مرا ہر طرح بدن　　دامن رفو ہوا تو گریباں نکل گیا

ڈھونڈھتا ہے رخ جاناں کو مرا دل کیا کیا　　داغ دیتا ہے فروغ مہ کامل کیا کیا

کسی کے غم نے رلایا مگر امانت کو　　کہ آج گھر سے بچشم پر آب نکلا ہے

جو غرق ہوا پھر نہ لگا اس کا ٹھکانا　　ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے

کہدو ظالم سے کہ عاشق کو گوارا ہے ستم　　میرے ہوتے نہ کسی اور پہ بیداد کرے

جس نے نظارہ کیا اصل علی یاد آیا　　تیرے حصہ میں صنم حسن خداداد آیا

بن میں جو آیا وہ رشک بہار　　تو رنگ رخ گل ہوا ہو گیا

مزا وصال صنم کا اٹھائیگا پھر کیا　　ڈرا جو ہجر سے وہ دل لگائیگا پھر کیا

رخ جاناں پہ نظر کرکے بندھا گل کا خیال　　قد کو دیکھا تو مجھے سرو چمن یاد آیا

زمزمہ کس کی زباں پر بدل شاد آیا　　منہ نہ کھولا تھا کہ پر باندھنے صیاد آیا

ہو گئی قطع اسیری میں امید پرواز　　اڑ گئے ہوش جو پر باندھنے صیاد آیا

ہو جائے محتسب کی جو شمع حیا خجل　　میخانہ میں چراغ جلاؤں شراب کا

شعلہ ہے یا شرر ہے چھلاوہ ہے یار کا　　بجلی چمک گئی وہ جدھر سے نکلے

دل حشر بپا کرتا ہے سر پیٹ کے کیا کیا　　جو ہجر کی ساعت ہے قیامت کی گھڑی ہے

ہوا قفس میں یہ صیاد آشنائے مزاج　　کہ عندلیب کو پانی کی جا گلاب دیا

فصل گل آئی چمن میں کہ قیامت آئی　　عندلیبوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

دم خفا ہوتا ہے کیا کیا قفس تنگ میں ہے　　دیکھیں اس قید سے کس روز رہا ہوتے ہیں

ہجر میں دل پہ امنڈتا ہے وہ غم کا دریا　　شب کو نالے مرے سوتوں کو جگا دیتے ہیں

رنگ جمتا نہیں لالے کا بھرا ہے غیرت گل　　ہوا چمن میں جو ترے عذر قبا ہوتے ہیں

وطن آوارہ دل کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو　　تیرے کس پاس سے ختم وقت سفر کی

سید مظفر علی اسیر

تعارف:- ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں انتقال ہوا مصحفی کے شاگرد تھے مگر ۱۰ برس کا سن تھا کہ مصحفی کا انتقال ہو گیا اس عمر میں انہوں نے کیا حاصل کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں جو پختگی ہے وہ ان کی ذاتی صلاحیت کا نتیجہ ہے ان کا کلام ناسخ سے متاثر ہے۔

نبض بیمار جو اے رشکِ مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

مسجد سے نکل کر میں رہِ بت کدہ بھولا
تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا

اٹھنا انھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے
حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپشِ دل

ہم اور زیست ہجر میں قدرت خدا کی ہے
انسان کے اختیار میں اپنی اجل نہیں

باقی رہی ہے ترکِ تمنا کی آرزو
کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آئی شبِ ہجر
اے فلک کوئی تو امید بر آئی ہوتی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

دیکھئے اس دل کا ٹھکانا پھر نہ ملے گا ایسا
قدم آگے نہ بڑھانا مرا ویرانے سے

وہ صنم تو ہے کہ نکلے جو کبھی جانبِ دیر
بت نکل آئے تماشے کو صنم خانے سے

نہ یہاں ہے نہ وہاں پوچھنے والا کوئی
کون ہشیار ہے بڑھ کر ترے دیوانے سے

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا
کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

سن کے باتیں اس کی پردے میں ہمیں غش آ گیا
شعلۂ آواز برقِ لن ترانی ہو گیا

کچھ تو الفت کی ترے کوچے سے بو آتی ہے
گرد اٹھ کر مرے دامن سے لپٹ جاتی ہے

ٹوٹ جائے لبِ دریا نہ کہیں توبۂ مے
موجیں اٹھتی ہیں طبیعت مری لہراتی ہے

نزع کے وقت عزیزوں کو وصیت کیسی
ہو چکی ختم کہانی ہمیں نیند آتی ہے

ہر خاکسار صاحب توقیر ہو گیا!
پارہ ہوا جو خاک تو اکسیر ہو گیا

سیر چمن نہ کی تھی کہ نخچیر ہو گیا
نکلے جو بال و پر ہدف تیر ہو گیا

حیرت ہوئی یہ اس کے نظارے سے خلق کو
عالم تمام عالم تصویر ہو گیا

رہا ہے یاد ابرو میں مجھے شغل فغاں ہمدم
وہ مومن ہوں سجدے دیئے میں نے کعبہ میں اذاں ہو کر

صبا واقف ہوئیں کبھی پتے پتے بوٹے بوٹے سے
ہمارا ابھی رہا ہے اس چمن میں آشیاں برسوں

مزا عشق جوانی کا کوئی جانتا ہے پیری میں
جو زخم اچھا بھی ہوتا ہے تو رہتا ہے نشاں برسوں

نہ کعبہ کا نہ ہم سے دیر کا ہے حال پوشیدہ
یہاں ہم نے بھی عمر کاٹی ہے یہاں برسوں

تدبیر جب کوئی نہ چلی وصل یار کی
انجام کار قائل تقدیر ہو گیا

کی یار نے جو غیر کی جانب نگاہ لطف
اپنے جگر کے پار وہاں تیر ہو گیا

قصد اٹھنے کا تو تھا اس کے ہمارے پاس سے
چار آنکھیں ہوتے ہی ذرا خوں ہوا کر رہ گیا

کیسے کیسے گل خزاں کے جور سے مرجھا گئے
پتہ پتہ اس چمن کا ہاتھ مل کر رہ گیا

نہ کیوں کر اہل دنیا ہو تبع نفس امارہ
لباس دوستاں جو اپنا شکل ہو دشمن کا

اللہ رے شوق خط بھی نہ ہم نے کیا تمام
قاصد کمر کو باندھ کے تیار ہو گیا

اپنے وطن سے شوق ملاقات رہ گیا
موت آئی جب قریب ہمارا وطن رہا

ہوں کیا شوق سے کعبہ لیے چلتا ہے مجھے
یہی جو ہے تو حال اپنا عجب کیا ہو گا

گھڑی گھڑی کی خبر ہم کو دل کی ملتی ہے
جو خط کا وہ نہ لکھیں گے جواب کیا ہو گا

شب فرقت کی کوتاہی سے دل کو سخت ایذا ہے
یہ بڑھ جاتی جو روز ہجر گھٹ کر تو کیا ہوتا

گھٹنے کے بعد کو ہر ماہ بھی ہلال گیا
تمہارے چاند سے چہرے نے بھی کمال کیا

گدا ہوئے تو گدائے در کریم ہوئے
کیا سوال تو اللہ سے سوال کیا

سجدہ بھی دہشت دربان نہ کرنے پایا
لے چلے داغ ترے در سے جبین سائی کا

ہوں وہ عاشق مجھے سوز غم و حسرت پسند
دل ہے پروانہ چراغ شب تنہائی کا

دل مضطر کہیں عاشق کا ٹھہر سکتا ہے — ماہی نام ہے بس صبر و شکیبائی کا

واہ اے دور فلک خانۂ احسان آباد — چتر بخشا سر مخمور کو انگڑائی کا

کب ملی فرصت تڑپنے کی ترے بیمار کو — کچھ کمی درد جگر نے کی تو درد دل اٹھا

جب تک جیے جہاں میں مر مر کے ہم جیے — جس خوبرو پہ آنکھ پڑی ہی دم نکل گیا

وصل معشوق میں پھر ہستی عاشق کیسی — قطرہ مل جائیگا دریا میں تو دریا ہوگا

بتکدے کی میں سیر کر آیا ! — واں خدا ہی خدا نظر آیا

ہو نہ وہ بسمل کہ ہوں میں عاشق درد — دل بھر آیا جو کھلی زخم جگر بھر آیا

ذرا سی بات میں ہوتے ہیں اپنے بیگانے — بڑا کمال کسی کو ہے اپنا کر لینا

گردش بخت زبوں جور فلک رنجش یار — درد لاکھوں ہیں کس کس کا مداوا کرتا

مطلب دل بے طلب ہو جائے گا — جب خدا چاہے گا سب ہو جائے گا

تو جو خورشید ہے تو میں شبنم — میں کہاں جب ترا ظہور ہوا

طائر بے بال و پر ہوں کیسی پرواز چمن — نام ہے بے تابی دل شوخی پرواز کا

بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہکر — جرم اس نے کئے ہیں تجھے غفار سمجھ کر

مرتبہ حسن کا تکلیف میں گھٹتا ہے کوئی — خوشنما کتنی وہ زلفیں ہیں پریشانی پر

روشن اسی سے محفل آفاق ہے تمام — رکھتا ہے مثل شمع جو سوز و گداز عشق

مزاج وہ نہ رہا وصل یار کے نزدیک — جنوں ہوا جو دن آئے بہار کے نزدیک

ابھی ہے اتنی محبت کہ راہ چلتے ہیں — ٹھہر ٹھہر کے ہمارے مزار کے نزدیک

فرقت میں شوق وصل تو وصلت میں خوف ہجر — راحت فراق میں ہے نہ ہم کو وصال میں

تمام سال تو دشوار ترک دام ہے اسیر — ہر ایک ماہ کو گھر کر کے قیام کریں

گلزار کسے کہتے ہیں گل نام ہے کس کا — صیاد یہاں ہم تو کھلی آنکھ قفس میں

پوچھا بھی کسی نے نہ ہمیں روز قیامت — دوزخ بھی گئی ہاتھ سے جنت کی ہوس میں

نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا کس کو — حسن بے پردہ ہے پر تاب تماشا کس کو
ہو نہیں بیمارِ محبت مگر اتنا نہیں ہوش — درد کیا چیز ہے کہتے ہیں مداوا کس کو

وہ دل ہی کیا کہ جو ہو داغِ عشق سے خالی — اسیر خانۂ دشمن بھی بے چراغ نہ ہو

حالِ دل قابلِ تماشا ہے! — تم جو دیکھو نیا تماشا ہو

مشتاق اور تاب تماشائے روئے یار — چمکی جو برق طور غش آیا کلیم کو

کہتی ہے قیامت میں یہ وحشتِ دل مجھ سے — دوزخ میں چلو جب تک آراستہ جنت ہو

چھپتی نہیں ہے اس سے کبھی پیار کی نگاہ — پہچانتا ہے طالبِ دیدار کی نگاہ

حسن کے طالب نہیں کچھ تمیز کفر و دیں — ایک پروانہ کو شمع کعبہ و میخانہ ہے

دیکھی ہے وقتِ زینت اپنی صنم اور شکل — آئینہ کی طرف نظر اشتیاق ہے

کعبہ چلتا ہوں پر اتنا تو بتا — میکدہ ہے کوئی زاہد راہ میں
بک رہا ہے تو میں بیٹھا ہوں خموش — تجھ کو اے ناصح ہے یا سودا مجھے

موجود ہم ہیں خاک میں ملنے کو اے اجل — لیکن یہ شرط ہے کہ وہاں آسماں نہ ہو

ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پر دمِ حشر — نازنیں غمزے پہ غمزے نے ادا پر رکھا

بیٹھے ہیں جا کے پہلوئے قاضی میں ہم سے مست — مسجد کے پاس میکدہ تعمیر ہو گیا

پھولا پھلا مرا نخلِ تمنا کس طرح — بچ رہا بجلی سے تو پانی جل کر رہ گیا

پیامِ مرگ تماشائے روئے یار ہوا — چمک گئی برق چراغ سر مزار ہوا
تھوڑی سی عمر اور سو ناز مجھے عطا — رہ جائے آسماں کو نہ بیداد کی ہوس

محشر میں کریں گے دعوے کے عفو — تحریر خطِ جبیں سند ہے

جوانی دی اگر تو نے تو یہ بھی اے خدا اس کے — شباب اتنا ٹھہر جائے کہ دل کا حوصلہ نکلے

دھوم محشر میں ہوئی جب کہ تری آمد کی — بے گنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگاروں میں
بے ہوش میں آیا تھا گیا دہر سے بے ہوش — آنے کی خبر مجھ کو نہ جانے کی خبر ہے!

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور

اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آتش کے تلامذہ کا سلسلہ ختم ہو گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ خود آتش عروض و قافیہ سے گہری واقفیت نہیں رکھتے زبان کے بارے میں بھی کچھ ایسے ہی تھے اس وجہ سے ان کا کلام مستند نہیں سمجھا جاتا تھا مگر طرز پسندیدہ تھا۔

ان کے شاگرد بھی ایسے ہی تھے جو عروض و قافیہ سے ربط نہیں رکھتے تھے سوائے نواب سید محمد خان رند کے اور اس زمانہ میں شاعر کے لیے عروض و قافیہ میں مہارت ضروری سمجھی جاتی تھی اس وجہ سے پڑھے لکھے لوگوں نے ناسخ کے سلسلہ کو اختیار کیا جس میں کا ہر ایک عروض و قافیہ معانی بیان اور تحقیق زبان میں مسلّم تھا۔

آتش زبان اور حسن بیان میں ناسخ سے متاثر تھے مگر اپنا رنگ الگ بھی رکھتے تھے۔ اس دور کے شعراء آتش سے بھی متاثر تھے اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور ناسخ و آتش کے رنگ کا گہرا امتزاج ہے۔

یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اسیر کی وجہ سے مصحفی کا سلسلہ قائم رہا مگر یہ صحیح نہیں اوّل تو خود مصحفی ناسخ سے متاثر تھے دوسرے اسیر نے کے دن مصحفی سے فیض حاصل کیا اس لئے مصحفی کا سلسلہ بھی ناسخ ہی کا سلسلہ سمجھنا چاہیئے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مصحفی کا خود کوئی رنگ نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کہیں کی بھی ہو ناسخ سے متاثر ہے اور اسی کی تقلید پاکیزگی کلام کی ضمانت ہے۔

سید مرزا تعشق

تعارف:- سید محمد مرزا انس شاگرد ناسخ کے بیٹے میر عشق کے چھوٹے بھائی اور شاگرد ۱۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔

شعلۂ حسن سے تھا دود دل اپنا اول
آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

برق رہ رہ کے چمکتی ہے تو میں کہتا ہوں
ہو غنیمت اگر اتنا بھی مرا دل ٹھہرے

دلِ حزیں پہ خدا جانے کیا بلا آئی
عجیب درد سے روتا ہے کوئے دلبر میں

وہ چشم مست ہے ایسی خمار آلودہ
بھری ہو جیسے لبالب شراب ساغر میں

دوستی میں نگہِ ناز کے روزن دل میں
ورنہ برچھی سے ہیں زخمی نہ کسی تیر سے ہم

وہ تڑپنا دیکھتا ہے کس طرح بسمل ہو سرد
رشتۂ نظارۂ قاتل رگِ جاں ہو گیا

خوشا دل منعکس ہے جس میں صورت عرش انور کی
مرے گھر سے فضا معلوم ہوتی ہے ترے گھر کی

پڑھا جو نزع میں قرآں رہی نہ جسم میں روح
زباں بند ہوئی سن کے گفتگو تیری

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

یہ اتفاق بھی دنیا میں کم سنا ہوگا
ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری

مری لحد کو نہیں احتیاج چادر گل
دماغ جاں میں ابھی تک بسی ہے بو تیری

یہ کس نے وعدہ کیا ہے تعشق آنے کا
ہر ایک وقت جو آنکھیں ہیں انتظار ہو تیری

عشق کی وہ شورشیں وہ ولولہ جاتا رہا
اک جوانی کیا گئی سب حوصلہ جاتا رہا

خاک ہو کر شمع و پروانہ ہوئے آپس میں ایک
عشق کامل کے سبب سے فاصلہ جاتا رہا

خیر گزری کیا زلف کے سودائی کا
اب خدا منہ نہ دکھائے شبِ تنہائی کا

یوں تو حرفِ خطِ تقدیر نہیں مٹنے کا
آپ کے در پہ ارادہ ہے جبیں سائی کا

دلِ پر داغ کا کیا حال کہیں ہم تم سے
پھول دیکھا ہے کہیں لالۂ صحرائی کا

دل جو مر جائے ہمارا تو کرے کون انیس
سو گیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

خموشی ہو گئی طوقِ گلو آج — کسی کی یاد آئی گفتگو آج
سرِ محفل بھر آئے ہوتے آنسو — گئی ہوتی ہماری آبرو آج
ہوا ترکِ محبت پہ نہ راضی — رہی تا دیر دل سے گفتگو آج

یہ میرے نالوں سے تھی تنگ ہجرِ یار میں روح — کہ بعدِ مرگ نہ آئی مرے مزار میں روح
ہم اس چمن میں وہ بلبل ہیں جس کا الفت — وداعِ تن سے ہوئی رخصتِ بہار میں روح
قدم قدم پہ جنازہ نہ کیوں ٹھہر جائے — کہ میرے جسم سے نکلی ہو انتظار میں روح
ہے احتضار مجھے دوستو ٹھہرنے دو — اسی طرح سے نکلتی ہے انتظار میں روح
نہ ترک ہوتی ہے الفت تری نہ مرتا ہوں — نہ اختیار میں دل ہے نہ اختیار میں روح
حیات کا ہے تعشق بھلا بھروسہ کیا — ہوا حباب میں ہے یا ہے جسمِ زار میں روح

ہر طرف شور ہے جھنکار ہے زنجیروں کی — ان کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں
پڑ گئی کیا نگہِ مست تری اے ساقی — لڑکھڑاتے ہوئے میخوار چلے آتے ہیں

کبھی نہ ہوش میں ہم اے خیالِ یار آئے — کسی کے در پہ گئے جب اسے پکار آئے
ہماری خاک پڑی ہے تمہارے کوچہ میں — ذرا نسیم سے کہدو نہ بار بار آئے
ہمارے بعد یہ ہے حال ہمسفروں کا — اس آشیاں میں صدا دی اسے پکار آئے

میں باغ میں ہوں طالبِ دیدار کسی کا — گل پر ہے نظر دھیان میں رخسار کسی کا

گر پڑے آنسو عروجِ ماہِ کامل دیکھ کر — میری نظروں میں ترا عہدِ جوانی پھر گیا
دل ہے مردہ خلد میں اپنے سے کیا ہو جائیگا — ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائیگا

تجربہ جراحتِ دل نازک مزاج کا — موقوف ہے حضور کے تارِ نگاہ پر
تلاشِ شبِ وصل میں پھر رہا ہوں — مرا آپ دیوانہ پن دیکھیے

یادِ غم دل سے کبھی جاتی نہیں — اب تو بھولے سے ہنسی آتی نہیں
کچھ خبر ملتی نہیں دل کی مجھے — آج نالوں کی صدا آتی نہیں

نہیں ٹکتیں ہوتی ایک جا پر کوئے جاناں نہیں
سحر سے شام تک ہم سو جگہ بستر لگاتے ہیں

عجب اندھیر کر رکھا ہے آج ان کی نگاہوں نے
جو کل کہتے تھے سرمہ آنکھ میں کیونکر لگاتے ہیں

فرشتوں کو ملے ہیں وہ مرے اعضا جو بے حس ہیں
دل بیتاب کا دیکھوں پتہ کیونکر لگاتے ہیں

یہ باغ گیا جہاں میں راحت کہیں نہیں
دل مضطرب ہے اس کا ٹھکانا کہیں نہیں

کہا زاہدوں کے سامنے ہو کے تارک الصلوٰۃ
کس سے کہوں کہ لائقِ سجدہ جبیں نہیں

مشقِ تصورِ دلِ صد پارہ دیکھیے
اتنے حسیں ایک جگہ پہ کہیں نہیں

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو اداس بیٹھی ہو
یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھی ہو

طوقِ منت کے گلے میں تھے وہ دن یاد کرو
تم پہ اس عہد میں بھی چاک گریباں ہم تھے

نہ جو فرقت میں زرد رہتا ہے
کچھ کلیجے میں درد رہتا ہے

نجد سے جانبِ لیلیٰ جو ہوا آتی ہے
دل مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

ہم کو مل جاتی ہے اپنے دلِ وحشی کی خبر
ٹوٹتا ہے کوئی ٹانکا تو صدا آتی ہے

یاد آیا میکہ تھا زور و نہ جذبِ حسن و عشق
وہ میرے دل کا تڑپنا بے قراری آپ کی

لیجیے روح بھی تڑپنے لگی
دل تو مدت سے اضطراب میں ہے

بیٹھے بیٹھے اپنے دل کی غیر حالت ہو گئی
دوستو جلدی خبر لینا قیامت ہو گئی

اب اگر تخفیف ہوتی ہے تو گھبراتا ہوں میں
دردِ دل اتنے دنوں سے ہے کہ عادت ہو گئی

کرتے کرتے آہیں روتے روتے آخر مر گیا
آج مجھ کو آپ کے کاموں سے فرصت ہو گئی

پوچھتے کیا ہو شبِ فرقت کی بیداری کا حال
آنکھ کیونکر بند ہوتی ہے یہ حسرت لے گئے

جب کہ یارانِ گذشتہ کی حکایت یاد کی
رات بھر بیٹھا رہا نیند اڑ گئی صیاد کی

باغ کے حسنِ گذشتہ کا اسیروں سے ہے ذکر
یا الٰہی بند ہو جائے زباں صیاد کی

دیر تک روئی خوشی حسرت سے مجھ کو دیکھ کر
جب بنا ڈالی گئی میرے دلِ ناشاد کی

وحشیوں میں آمدِ فصلِ بہاری کی ہے دھوم
بیڑیاں آواز دیتی ہیں مبارکباد کی

دم نکلنا کوئے جاناں سے نکلنا یاد ہے　ہم یہ دو باتیں نہ بھولے عالمِ ایجاد کی

ہم خونِ آرزو کا جو محضر بنائیں گے　تجھ کو گواہ اے دلِ مضطر بنائیں گے
خلخال ان کے پاؤں کی زرگر بنائینگے　طوق گلوے فتنۂ محشر بنائیں گے
افتادہ رہنے دی تھی زمیں دل کی اسلئے　اُمید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے
بنتی ہے روز زلف تو عاشق کے سامنے　دیوانہ آپ اس کو مقرر بنائیں گے

کسی سے دشت نوردی کی وجہ کیا کہیے　شکایت دلِ خانہ خراب ہوتی ہے
نہ گھر میں اور نہ آتا ہے اُس گلی میں قرار　عجیب شکل دمِ اضطراب ہوتی ہے
ایسی دلدوز حسینوں کی پلک ہوتی ہے　سانس لینے سے کلیجہ میں کھٹک ہوتی ہے
ہے یہ نزدیک قدم رنجہ کرے فصلِ بہار　سر آمادہ سودا میں دھمک ہوتی ہے

بجھ رہے ہیں داغ دل تربت میں جانے کیلئے　روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کے لئے

گیا شباب مگر رہ گیا تعلقِ عشق　دل و جگر میں چمک گاہ گاہ ہوتی ہے

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا　کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری
یہ اتفاق بھی دنیا میں کم سنا ہوگا　ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری
طبیعت سے یہ کہتا ہوں جنوں کی فصل آپہنچی　کئی دن سے رگِ جاں میں کھٹک ہوتی ہے نشتر کی

بے وفائی آپ کی غفلت شعاری آپ کی　میرے دل نے عادتیں سیکھی ہیں ساری آپ کی

یادِ رخ دیدۂ پُر آب میں ہے　بوئے گل جامۂ حباب میں ہے
پاؤں آہستہ سے رکھ اے غافل　دیکھ تو کون کون خواب میں ہے
ہاں اترتا ہے داغ سے پھایا　تھرتھری جسمِ آفتاب میں ہے
جھنجھلا کے باغباں نے مجھے ذبح تو کیا　اب رو رہا ہے منہ کو قفس پر دھرے ہوئے
سمجھا دلِ وحشی جو قیامت ہوئی برپا　اٹھا کوئی دیوانہ رفتار کسی کا
دیکھ آؤ کہ بیمار تمہارا تو نہیں ہے　رکھا ہے جنازہ پسِ دیوار کسی کا

حکیم ضامن علی جلال

تعارف :۔ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا۔ آبائی پیشہ طبابت اور داستان گوئی تھا شاعری میں نام پیدا کیا۔ رشک و برق کے شاگرد تھے۔ انداز بیان کی ندرت میں ان کا جواب نہیں۔ ساری عمر تحقیق زبان میں صرف کی۔

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا — ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا

ہم اور جاتے نہ پیر مغاں کی صحبت میں — بہت سنبھالنے والے تھے اک شباب نہ تھا

کسی نے دیکے تسلی ہمیں قیامت کی — کہ آج ہے جو تڑپ کل یہ اضطراب نہ تھا

تغافل کے گلے سن کر چھپا لیں تم نے کیوں آنکھیں — مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

تڑپ دل کی دکھانا تھا جلال ان شوخ چشموں کو — وہیں کی بخت نے سستی جہاں چالاک ہونا تھا

کہاں ان سے کہیں قصہ شب تنہائی کا! — شمع خاموش کو یارا نہیں گویائی کا

زیادہ ہم خطا سے کریں بھی تو کیا کریں! — مارے ہوئے تغافل جور بتاں کے ہیں

آنسو رکے تو کیا نہیں چھپنے کا راز عشق — حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

عشق بتاں کا جرم نہ بخشا خدا نے بھی! — ان کا گناہگار گناہگار ہی رہا

اہل دل کے لیے راحت نہیں اس سے بڑھ کر — جس کو سمجھا ہے وہ بے درد دکھانا دل کا

میری قبر کے فرشتے یہ نہ پوچھیں کیوں ہوں چپکے — کہ جواب ہی نہ سنتے جو بجا سوال ہوتا

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لیے! — اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لیے

لٹک کے زلفیں جو آپڑی ہیں کسی کی لچک ہی لچک ہے — بلا کی آئی ہیں دو گھٹائیں غضب کی بجلی چمک رہی ہے

مجھے مر کے جان اتنی بخدا خوشی نہ ہوتی — مرے مرنے کا ذرا بھی جو تمہیں ملال ہوتا

دل کسی کے عشق میں اچھا ہوا جاتا رہا — داغ تھا اک مٹ گیا اک درد تھا جاتا رہا

دل ہمارا اور دلبر ہو جائے ہم سے منحرف — آج اس کج ادائی کا گلا جاتا رہا

دل ہو وہ چشم مست ہو دورِ شراب ہو
کوئی خراب ہو تو بلا سے خراب ہو

تم تسلی میں نہ کرنا اپنی جانب سے کمی
گو تڑپ اس سے مرے دل کو سوا ہونے لگے

بند ہو کر جلوہ گاہِ یار میں آنکھیں کھلیں
ہوش جاتے ہی حواس اپنے بجا ہونے لگے

اکیلے کا کہیں دو سر کشوں سے زور چلتا ہے
دوپٹہ لاکھ سینہ پر سنبھالو کب سنبھلتا ہے

ہم بھی قدر اپنی وفا کی نہیں کھونے والے
او جفا کرکے پشیماں کبھی نہ ہونے والے

دے چکا ساتھ ہمارا شب تنہائی میں
بے مروت ہے یہ دل اس کا بھروسہ کیا ہے

بن سنور لیں گے تو دیکھیں گے وہ انداز اپنے
ٹوٹے آئینہ حیراں ابھی دیکھا کیا ہے

یاد ہے اتنا وہ آ کر کہیں رہ جانا
اور وہ پوچھنا گھبرا کے کسی کا کیا ہے

جھک کے شرمائی نگاہیں کبھی اٹھیں تو سہی
آپ کو کیا جو زمانہ تہ و بالا ہوتا

غیر کے سامنے ہنستے نہ مرے رونے پر
تم نے گرتی ہوئی بجلی کو سنبھالا ہوتا

یاس نے ساری امیدوں کو مٹایا دل کی
ورنہ اس گھر میں بہت کچھ سر و ساماں ہوتا

پہلے وفادار سے ذرا آنکھ ملاؤ تو سہی
یوں جفا کرکے نہیں کوئی پشیماں ہوتا

دیتا جو تسلی وہ ہمیں اور تڑپتے
اس شوخ کو بیتاب بھی کرنا نہیں آتا

شب فراق تڑپ کر کہیں تو گذری تھی
سنا ہے تم نے بھی آرام رات بھر نہ کیا

کلیجہ کوئی تھام کر رہ گیا ہے
ادھر جانے والے ادھر دیکھ لینا

گذرتی ہے شب یوں ترے منتظر کی
ادھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا

کبھی اس نے جو کہا او مرے مرنے والے
ہو گیا اور بھی جینا ہمیں دو بھر اپنا

آنکھ ملتے ہی یہاں قابو نہ جس دل پر رہا
آپ کے بس میں نہیں معلوم وہ کیونکر رہا

کہتی ہے تڑپ ضبطِ فغاں ہو نہیں سکتا
اب درد نہاں مجھ سے نہاں ہو نہیں سکتا

بت بن گئے کیوں عشق میں بت کے نہ پوچھو
اس چپ کا سبب ہم سے بیاں ہو نہیں سکتا

بتوں کے عشق میں انجام کار کیا ہوگا
مآل اے مرے پروردگار کیا ہوگا

تنہا شبِ غم عاشقِ کامل نہیں ہوتا ‏ تم دل کی جگہ ہوتے ہو جب دل نہیں ہوتا

دیکھتے دیکھتے وہ میں تڑپتا تھا ‏ قابلِ دید یہ تماشا تھا

سن کے نام اس کا دل کو تھام لیا ‏ نامہ بر سچ بتا کہ یہ کیا تھا

کیا دکھے دل کو پھر دکھا ئے گئے ‏ تم نے کس دن مزاج پوچھا تھا

وہ آبدیدہ جو سنکر مرا افسانہ ہوا ‏ مجھے بھی اشک بہانے کا اک بہانہ ہوا

دلِ ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے ‏ کام اس سے بھی نکل جاتے تھے بیکار نہ تھا

عشق میں دل جو مرا ہمدم و ہمراز بھی تھا ‏ وہی کم بخت تو رسوا کنِ غماز بھی تھا

یوں مری رات تری منتظری میں گزری ‏ چشم بر راہ بھی تھا گوش بر آواز بھی تھا

اگر عشق میں سب ان کی ہشیاری کی باتیں تھیں ‏ مگر قسمت میں تھا دیوانہ ہی مشہور ہو جانا

وفا مانع ہے ذکر اس کی جفا کا ہو نہیں سکتا ‏ شکایت کا محل ہے اور شکوہ ہو نہیں سکتا

قضا کہتی ہے زندہ کشتہ اس کا ہو نہیں سکتا ‏ ادا کہتی ہے کیا قاتل مسیحا ہو نہیں سکتا

جانے کیا بے اختیاری ہے جلال ‏ دل مرے بس میں نہ قابو یار پر

کیا لطف دے رہا ہے بگڑنا عتاب میں ‏ لاکھوں بناؤ ہیں تمہارے اک پیچ و تاب میں

کیوں آ کے دے گئے وہ تسلی ستم کیا ‏ اب تو بہت کمی تھی مرے اضطراب میں

جفا کر کے وہ کیوں پچھتا رہے ہیں ‏ وفاداری سے خود شرما رہے ہیں

غضب کا سامنا ہے حشر میں بھی ‏ نقاب اٹھتی نہیں شرما رہے ہیں

خدا سمجھے جلال ان ناصحوں سے ‏ نہیں معلوم کیا سمجھا رہے ہیں!

مجنوں کے غل نہ شور تھے اب کو بکو کہیں ‏ ڈنکے بجے ہوئے مرے دیوانہ پن کے ہیں

چلا ہوں لے کے میں فریاد انکی وہ مری ‏ اب اس میں دیکھئے پہلے سنے خدا کس کی

نظر فریب اداؤں پہ آ ہی جاتا ہے ‏ ہزار روکتے سنتا ہے دل بھلا کس کی

تڑپ میں ہے جو مزہ وہ سکون دل میں کہاں ‏ ہم اپنے درد کی خود ہی دوا نہیں کرتے

اثر کچھ ان کے دل میں کر گئی آہ و فغاں میری
زاہد تو ہے دیوانہ حور کا وہ کیا جانے
منہ سے کچھ حشر میں بھی کہہ نہ سکوں
اُس صنم کو جو ہم خدا سمجھے
کسی بے درد کی دل آزاری!
کٹ گئی پاؤں کی بیڑی جو پہنی تھی زنجیر
شغل ہیں اپنے یہ صبح و شام کے
اُٹھ کے اس محفل سے اُٹھتا ہے وہ درد
اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کے ہم شاکی ہیں
مذہبِ عشق ازل ہی سے ہمیں آیا ہے پسند
دم بھرے جائیں گے اس سفاک کا
کچھ زیادہ ہو چلا شوق وصال
سجدہ کوئی قبول ہمارا ہو یا نہ ہو
ابھار دیتی ہے اس کی جفا کو مری وفا
بتوں کو دیکھ ہماری نگاہ سے اے شیخ
جلوہ کسی کا دیکھ کے آنکھیں سی کھل گئیں
چٹکیاں لیتے ہیں مرے لیتے ہو چپکے چپکے
چھپا لاکھ رازِ عشق افشا ہو ہی جاتا ہے
نہ ہو برہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا ہم نے
رہے گی رحمتِ حق دور زاہد و تم سے
خدا سے کہتے ہیں بت بھی کہ رحم کر اس پہ

کہ خود وہ چھیڑ کر سنتے ہیں مجھ سے داستاں میری
عالم کو ترا سودا اے رشک پری کیوں ہے
بت بنا دے خدا اگر کوئی
لوگ کیا جانے ہم کو کیا سمجھے
درد کو اپنے ہم دوا سمجھے
ہوشیاری کوئی سیکھے ترے دیوانے سے
جب آہیں کھینچتا دل تھام کے
بیٹھ جاتا ہوں کلیجہ تھام کے
کیوں بگڑتے ہیں کیا شکوہ تمہارا کس نے
وہ کوئی اور نہیں حضرت انساں ہو نگے
جائے اس میں یا ہمارا دم لے ہے
زندگی کے دن بہت اب کم رہے ہیں
لیکن جبیں ہو اپنی ترا آستانہ ہو
غرض کہ نوبتِ ترکِ جفا نہیں آتی
نظر ان آنکھوں کو شانِ خدا نہیں آتی
پردے جو غفلتوں کے پڑے تھے اُٹھ گئے
اور پھر دل میں شکایت مری فریاد کی ہے
اگرچہ بھیجتے ہے عاشق تو رسوا ہو ہی جاتا ہے
چلو جانے دو بیتابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے
گناہ ہے یہ تمہارا کہ بے گناہ رہے
نہ ہو گا عاشقوں میں ہم سا کوئی مضطر بھی

کہیں سمجھے ہیں دیوانے یہ ہر عاقل سمجھتا ہے
جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہے

سنگِ در اس کا ہے پیشانی میری
پھر رہے ہیں میری نظروں میں وہ جب

بعد ترکِ عشق کے کیسی پشیمانی ہوئی
توفیق انھیں رنج ہی دینے کی خدا دے

اک مسیحا سے جو الفت ہو گئی!
اٹھکھیلیوں کے ساتھ ہے مستانہ ادا بھی

آفت بھی کسی کی نگہِ ہوش ربا بھی
جلال آ کے کہتی ہے ہشیار رہنا

اٹھ گئیں تھیں کہیں اس شوخ کی نیچی نظریں
ہم نے کہتے تھے کہ تم اس کو نہ دینا تسکیں

دل کو کب تک دردِ دل تڑپائیگا
ہوشِ رفتہ دیکھئے جب آئیگا

سمجھے تھے کہ فرقت میں مر جائیں گے ہم جلدی
حسرت جو مری دیکھی حیران سے ہیں وہ بھی

وہ ترچھی نگاہوں سے محفل میں ادھر دیکھیں
گذرتی ہے محبت میں جو ہم پر

تم لگا دو آگے ٹھوکر ناز سے
خود پکار اٹھا جو دل میں راز ہے

مہرباں کو دیکھ دل نامہرباں دیکھا کئے
اللہ رے عاشق کی زخود رفتگیٔ شوق

محبت میں کسے سمجھائیے کب دل سمجھتا ہے
نہ یہ ناداں سمجھتا ہے نہ وہ جاہل سمجھتا ہے

اب نہ سر پھوڑوں تو نادانی مری
پھر کوئی دیکھے پریشانی مری

عقل کا کہنا گیا ہم سے یہ نادانی ہوئی
خوش جو ہیں ہوں وہ ہم کو گوارا ہے خوشی ہے

بے اجل مرنے کی عادت ہو گئی
پامال کئے دیتی ہے دل لغزشِ پا بھی

یوں ہوش گئے ہیں کہ نہیں جن کا پتا بھی
نقاب اٹھتی ہے سامنا ہے کسی کا

دیدہ ہم نے دو عالم تہ و بالا دیکھا
اور دل نے تپشِ دل کو اچھالا دیکھا

صبر ہی انجام کار آ جائے گا
تیرے بے خود کو کدھر لے جائیگا

اس میں تو قیامت کی تاثیر نظر آئی
تصویر کے پہلو میں تصویر نظر آئی

سیدھی ہمیں کچھ اپنی تقدیر نظر آئی
وہ حالت دوسرا کیا جانے کیا ہے

کون اٹھے حشر کی آواز سے
تو بھی خاموشی بڑی ہی خمازہ ہے

جو دکھایا تو نے ہم اے آسماں دیکھا کئے
یوں ہے تری محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے

نجم الدین علی عرف علی میاں کامل

تعارف :- مولانا احمد علی صاحب مجتہد کے بیٹے سنہ ولادت معلوم نہیں غدر میں جوان تھے سنہ ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ مشرقی علوم میں صاحب استعداد ممتاز تقی الدولہ سید محمد تقی صاحب کے شاگرد۔ شاعری میں ہر صنف پہ قادر تھے ان کے کمال کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا انھوں نے امیر مینائی۔ جلال ماہر اور منیر سے غزلوں میں مقابلہ کیا اور مرثیہ میں میر نفیس کے مدمقابل بنے اور برابر کی ٹکر لی اپنا کلام خود کبھی نہیں پڑھا لوگوں کو کہہ کے دیدیا۔

دولت کے معاملہ میں بھی یہی حال تھا لاکھوں ملے اور دو دن میں لگا کر خالی ہو گئے۔

ان کی پہلی شادی حکیم باقر حسین کی صاحبزادی سے ہوئی جو شاہی اطباء میں تھے اور دولت کے لحاظ لاکھوں کے پیٹے میں تھے ایک ہی لڑکی تھی جو ان کی وارث ہوئی محبوب گنج میں ایک شاندار حویلی اور باغ تھا سب کامل صاحب کی داد و دہش کی نذر ہو گیا اور فاقوں کی نوبت آگئی تو نواب سردار بہادر اور نواب نادر صاحب نے تنخواہ مقرر کر دی جو آخر دم تک بسر اوقات کا ذریعہ رہی ان کے بے شمار شاگرد لکھنؤ میں تھے باہر کے شاگردوں میں میر مصحف حسین رئیس مصطفیٰ آباد ضلع پرتاب گڈھ اور رستم علیخاں رئیس دھولپور۔ (جوش صاحب کے نانا) تھے۔

مولانا صفی کو ان کی سوتیلی بہن بیاہی تھیں جو ان کے والد کی تیسری بیوی سے تھیں اب ان کا کلام سنئے۔

نہاں ہونے پہ تیرا نور ہر شے سے نمایاں ہے ۔۔۔ جو تو اے شاہد معنی عیاں ہوتا تو کیا ہوتا
یہ کرشمے نہ تھے ہر وقت کا یہ ناز نہ تھا ۔۔۔ آپ کی آنکھوں کا آگے تو یہ انداز نہ تھا
جا کے دیکھ آئے مرقع میں شبیہ یوسف ۔۔۔ ہم جس انداز کے خواہاں تھے وہ انداز نہ تھا

ہم نے مانا کہ قیامت کی تڑپ تجھ میں تھی
آپ کے جلوۂ جاناں کا انداز نہ تھا
جا کے دیکھا تو عجب امن کا گوشہ تھا مزار
غم نہ تھا عیش نہ تھا سوز نہ تھا ساز نہ تھا
شرم کے پردے میں اب کرنے لگیں کام اپنا
آگے ان نیچی نگاہوں کا یہ انداز نہ تھا
میں نہ مانوں گا کہیں میرے جلانے کو رقیب
برق کے جلوہ میں اس شوخ کا انداز نہ تھا
جان پر اب تو بنی جاتی ہے کچھ اے کامل
آگے افسردگی دل کا یہ انداز نہ تھا
صفت عشوۂ جاناں نہ بھی تھا ناز بھی تھا
سحر بھی آنکھ میں اس شوخ کی اعجاز بھی تھا
ایک خنجر ہی نہیں قتل کا میرے مجرم
ذبح کرنے میں شریک آپ کا انداز بھی تھا
قید سے ہو گئے ہا مرغ چمن کیا کرتا
دل کے ہمراہ شکستہ پر پرواز بھی تھا

یکساں ہے ہم شکستہ دلوں کو حیات و موت
شادی نہ زیست کی ہے نہ غم انتقال کا
پوشیدہ راز ہائے جوانی نہ رہ سکے
پیری نے حال کھول دیا بال بال کا !!
کہنے میں آپ آ گئے لوگوں کے اے کلیم
کوئی محل نہ تھا ارنی کے سوال کا

اب رہائی کی تمنا نہ کر اے مرغ قفس
سوئے گلشن تو اگر بے بال و پر آیا تو کیا
ناوک مژگاں سلامت اس ستمگر کا رہے
زخم اے کامل ہمارے دل کا بھر آیا تو کیا

نیند میں ان کی مژہ کھلتی کبھی ہوتی تھی بند
مرتعش کے ہاتھ میں جام شراب ناز تھا

بام پر کل جو یکایک وہ پری زاد آیا
شیخ کو شیخ برہمن کو خدا یاد آیا
گل و بلبل کے مقدر پہ ہنسی آتی ہے
باغباں جانے نہ پایا تھا کہ صیاد آیا
کام سیکھا بھی تو وہ جس سے کلیجہ ہو لہو
دل کو آیا بھی تو کیا شیوۂ فریاد آیا
دیکھ کر گلشن فردوس میں حوروں کا جمال
یاد سے دوست ترا حسن خداداد آیا
اب مجھے ضبط فغاں کی نہیں قوت باقی
کیوں قفس لے کے مرا باغ میں صیاد آیا

حسیں کا عشق کہ سودائے زلف یار نہ تھا
ازل میں کیا دل غمدیدہ داغدار نہ تھا
جگر کو خون کیا تھا سحر کے دھڑکوں نے
شب وصال میں بھی قلب کو قرار نہ تھا

فغاں کو ضبط کیا پتھر نہ ہجر میں اشک
کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا

مآلِ آمدِ فصلِ بہار کیا ہوگا
کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

شبِ فراق میں سا ہے شام ہی سے نزع کا حال
سحر جو ہوگی تو پروردگار کیا ہوگا

خوش ہوں بے ساقی کے ہم لب لائے انجام کیا
مے نہ ہو تو شیشہ کیا سبو کیا جام کیا

جب ہوا دیں تلاطم درد کا ڈوبنے لگے
کوئی یہ بارش نہیں اس کے لیے ہنگام کیا

عیش و عشرت اہلِ دولت کو مبارک روز و شب
ہم سیہ بختوں کی راہ کا مل سحر کیا شام کیا

ابتدائے عشق ہے اس پر نہیں دل کو قرار
دیکھئے ہوتا ہے اس آغاز کا انجام کیا

بادشاہوں کو مبارک ہو فر اور سلطنت
مرد مفلس ہوں مجھے طبل و علم سے کام کیا

کیوں دعا ہوتی نہیں یا رب ہماری مستجاب
عرش سے بھی مرتفع ہے ان بتوں کا بام کیا

بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے
غربت میں جب دیارِ وطن یاد آگیا

نفسِ امارہ نے کیا سخت اذیت دی ہے
ساتھ ہے سایہ کے مانند یہ رہزن کیسا

فنا ہو روح تو آزاد ہوں عناصر بھی
ورق میں قید میں شیرازۂ کتاب کے ساتھ

مجھے مسلم نہیں معلوم تہ خاکساری کا
یہ وہ ہستی ہے جو روشن گر آئینۂ دل ہے

ہمارا ہوش میں آنا نہ آنا ایک ہے کامل
کہ ہم ہیں دل کے بس میں اور وہ دیوانہ غافل ہے

حکم سجدہ کا ہوا اس کو خدائے پاک کا
اور آگے کیا کہوں کیا ہے یہ پتلا خاک کا

سمجھ میں زردیٔ رخسار سے ہے آجاتا
بیانِ غم نہیں محتاج ترجمانوں کا

اے دل بتوں کے تیرِ نظر سے خدا بچائے
چھوٹا کمال سے اور کلیجہ کے پار تھا

ہوس نسخۂ اکسیر کا یہ جزوِ اعظم ہے
غبارِ راہ پیدا اگر جہاں میں اہلِ ہمت کا

کتابِ ہمت دل میں کہیں تو یاد آتا ہے
دیا تھا ایک نقطہ ہم صحرائے قیامت کا

اپنا ہی اگر حسنِ دل آرا نہیں دیکھا
اس شوخ نے قدرت کا تماشا نہیں دیکھا

دل پاک کدورت سے کسی کا نہیں دیکھا
اس آئینہ کو ہم نے مصفیٰ نہیں دیکھا

عبرت کے سوا کوئی تماشا نہیں دیکھا — کچھ ہم نے یہ گنبد مینا نہیں دیکھا
کھلتا نہیں کس کرب میں ہے آج دل زار — یوں سینہ میں اسکو تہ و بالا نہیں دیکھا

دیا تھا جو لطف و رحمت سے اب آج ناز پر آئی — خدا میں بندوں میں اے فرشتو حساب کیسا کتاب کیسا
کبھی وہ آئے تھے ایک شب کو قلق جدائی کا آج تک ہے — لگی نہ پھر آنکھ زندگی بھر ہم نے دیکھا تھا خواب کیسا

غور کر دل کی حقیقت میں خدا مل جائیگا — دیکھ آئینہ کو جوہر کا پتہ مل جائے گا

پیری میں بھی رہے گی جلن داغ عشق کی — دن کو بھی یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

چشم مردم میں کھٹکنے کے سوا صورت خار — فائدہ کوئی مجھے نشو و نما سے نہ ہوا

خدا کسی کی محبت کا داغ دل کو نہ دے — یہ زخم وہ ہے کہ جو مندمل نہیں ہوتا

نمود حسن میں اے جان اگر شک ہے ابھی تم کو — جھکا کر آنکھ دیکھو آئینہ چاک گریباں کا

سرکشی پھر تو فرشتوں سے بھی انساں کرتا — سجدہ اس خاک کے پتلے کو جو شیطاں کرتا

یار کے حسن سے آنکھیں کیا سیر نہیں — کام اس مائدہ پر ہے لب و دنداں نکلا
ہوش میں آئے جو موسیٰ تو یہ پوچھے کوئی — ابتو اللہ کے دیدار کا ارماں نکلا!

مٹ گئے بات سے تمہاری ہم — شکر ہے نقش بندا مکاں کا
عاشقوں کے دلوں کا نام نہ لو — ذکر کیا خانہ ہائے ویراں کا

غم دوست ہے اس قید سے آزاد نہ ہو گا — ہم خوش بھی کریں دل کو تو یہ شاد نہ ہو گا

کفر و اسلام کے یا رب ہیں یہ جھگڑے کیسے — ایک ہی رشتہ اگر سبحہ و زنار میں ہے

شام ہی سے نہ گلا گھونٹ مرا اے شب ہجر — صبح تک دیکھ تو لینے دے کہ ہوتا کیا ہے

قفس کی قید سے آزادی مرغ! — نہ ہو جب قوت پرواز پر میں
نہیں سرمہ کا چشم یار میں خط — کمند ناز ہے دست نظر میں

چشم رحمت سے نظر کر ذرہ ہائے خاک پر — ہمت عالی سے پیدا کر دماغ آفتاب

لامکاں سے تھک کے آخر کو پھرے گا شام تک — طائر اندیشہ پہنچے گا نہ اس کے بام تک

پاؤں پر میں نے جو شوقِ ذبح میں سر رکھ دیا — مسکرا کر ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھ دیا
یاد پینے میں جو آئی نرگسِ مخمورِ یار — ہاتھ سے میں نے مے گلگوں کا ساغر رکھ دیا

کم نہیں طلعت میں یہ ذرہ قمر سے دیکھنا — کون گزرا تھا ابھی اس رہگزر سے دیکھنا

قصۂ فراقِ یار کا دوستو ایک رات میں — تم نے سنا تو کیا سنا میں نے کہا تو کیا کیا

محتاجِ عشوہ کب ہیں جوانی میں خوشجمال — دل خود بخود بہار میں کھنچتے ہیں سوئے گل
بلبل کی طرح کاہے کو ہوتا میں نالہ کش — دیتا اگر خدا دل بے آرزو اے گل!

داغِ الفت سے جلے جاتے ہیں میرے استخواں — دل کے پہلو میں الٰہی کس نے اخگر رکھ دیا

تیر نے تنگیٔ دل آ کے جو دیکھی ہائے — چاک سے زخمِ تمنا کے پرافشاں نکلا

فغاں کو ضبط کیا پر تھمے نہ ہجر میں اشک — کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا

رات کچھ ایسی ادا سے وہ پری زاد آیا — دیکھنے والوں کو محفل میں خدا یاد آیا

خاموش نہ کیوں کر جوانی میں ہیں ہم — آنکھوں نے ہماری یہ تماشا نہیں دیکھا

منشی اسمٰعیل حسین منیر

تعارف:۔ منشی احمد حسین شاد کے بیٹے شکوہ آباد کے بسنے والے سنہ ۱۲۶۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ابتدائی عمر میں لکھنؤ چلے آئے وہیں نشو ونما پائی اور اس پر ان کو ناز تھا وہ خود کہتے ہیں ؎

سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں　　ہوا گلچیں ریاض گفتگو میں

لکھنؤ سے اپنے انس کی یہ کیفیت بیان کرتے ہیں ؎

لکھنؤ کا مجھ کو سودا ہے منیر　　دل حسین آباد[1] کا پروانہ ہے!

اس شیفتگی کی وجہ بھی انہوں بتائی ہے۔

مادام لکھنؤ رہے آباد اے منیر　　جمع ہے اس دیار میں اہل کمال کا

یہ شیفتگی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے شاعرانہ کمال تک پہنچنے میں لکھنؤ کو بڑا دخل ہے ؎

منیر اس شہر میں اوج کمال نظم تک پہنچا　　الٰہی لکھنؤ بھی عرش ہے مضمون عالی کا

منیر اگر باہر ہوتے تھے جب بھی لکھنؤ کا ذکر کرتے رہتے تھے اور اس سے ان کی طبیعت میں جولانی آجاتی تھی ؎

آگئی پھر شعر گوئی پر طبیعت اے منیر　　لکھنؤ کا ذکر رخش فکر کا کوڑا ہوا

شاعری میں رشک کے شاگرد تھے ۵ رمضان سنہ ۱۲۹۷ھ کو ہیضہ میں انتقال ہوا مادہ تاریخ "منیر عالی قدر ہے"۔

---

[1] اس زمانہ میں حسین آباد سے رومی دروازے آصف الدولہ کی مسجد کی پشت گول دروازے سے زنگی محل چوک اور پاٹا نالہ تک شہر کا سب سے زیادہ بارونق حصہ تھا۔

بخت خفتہ کا ٹھکانا کوئے جاناں میں نہ تھا — خواب غفلت کا گذر چشم نگہباں میں نہ تھا
تھے سبھی دنیا میں مشتاق عروسانِ بہشت — اس کے سر سہرا رہا جو فکر ساماں میں نہ تھا
ہو گئے محجوب تم کو دیکھ کر خوبانِ دہر — کون سا سہرا تھا جو آغوش گریباں میں نہ تھا
ہر گھڑی کے رنج سے اک بار تو ملتی نجات — زہر کیا پیتے لئے تلخی جو دوراں میں نہ تھا
راہ و رسم خانۂ زنجیر کس سے پوچھتے — کوئی اگلے وقت کا دیوانہ زنداں میں نہ تھا
بحر غم میں طالب راحت کی مٹی تھی خراب — ننگ کشتی تھا جو تختہ عین طوفاں میں نہ تھا
کہئے کس ہیبت سے جا کر کعبہ میں سر پھوڑتے — ایک بت بھی قبلۂ اربابِ ایماں میں نہ تھا

کعبہ کے سامنے دل خانہ خراب تھا — یہ مجھ پہ پڑا حضور تجلی کا جواب تھا
کھولی جو چشم دل تو بدن نقش آب تھا — جب تک کہ آنکھ بند رہی ہیں حجاب تھا
دنیا و دیں سے جس نے نکالا کھڑے کھڑے — یادش بخیر وہ دل خانہ خراب تھا
ہم دوش نور و نار تھے اک شباب میں — یا دل میں چاند زیر زمیں آفتاب تھا
جب خاک میں شباب ملا ہوش آگئے — ہم چونک اٹھے تو زیر زمیں آفتاب تھا
افسانۂ شباب خدارا نہ پوچھئے ! — دیکھا ہے جاگتے ہوئے جیسے یہ وہ خواب تھا
کیا کہتے مفلسی کی جوانی میں دعوتیں — مہماں اجڑے گھر میں ہمارا شباب تھا
بل تھا جو دن میں سامنے جاناں کس طرح — تو کھینچے پھرتے ہے ادل عتاب تھا
گم ! یہ کبھی حصہ میں تھا فیض عام دوست — شبنم کے قطرہ قطرہ میں رنگ شباب تھا

اس انجمن میں کوئی دل شادماں نہ تھا — تھی اجڑے گھر کی رات سواد جہاں نہ تھا
جنس شباب کا یہ کبھی قدرداں نہ تھا — گردوں کی سامنے جنت ہوئی کہ نوجواں نہ تھا
تنظیم بیخودی کی بدولت نہ دے سکا — صاحب نطق نے کہیے بندہ یہاں نہ تھا
جن روز دوں تک نہ پہنچی تھی رنگ حضور نے — واقف جناب نوح سے اب تر زباں نہ تھا
پڑھتے ہزار دن یہ آنکھوں کے کھلتے ہی — جب تھیں بند آنکھیں رخ ان کا عیاں نہ تھا

میکدہ میں جو میں غمدیدہ و مضطر آیا
چشم ساغر ہوئی تر دیدۂ دل بھر آیا

نیند کو راہ میری آنکھوں کی معلوم نہ تھی
اے خدا خواب اجل ہجر میں کیوں کر آیا

شش جہت میں تری رحمت الٰہی معمور
کونسی راہ سے گردش میں مقدر آیا

ساقیا گریۂ بے ساختہ کی کیا تقصیر
چشم نمناک ابل آئی جو دل بھر آیا

سنکے شہرہ تری رفتار کا آگے نہ بڑھا
جب دبے پاؤں کہیں فتنۂ محشر آیا

آجاتی قیامت بھی تو فریاد نہ کرتے
ناظر ہوں تمہی آگے ترا نام نہ لیتے

کرتی جو مہ مصر کی تعریف زلیخا
تصویر دکھا دیتے ترا نام نہ لیتے

کب سے دل پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں مشتاق الست
پردۂ ساز میں پوشیدہ صدا کس کی ہے

خود بخود دامن لدار کدھر کھینچتا ہے
ہاتھ پھیلائے ہوئے آج دعا کس کی ہے

یہی انصاف ہے اے فصل بہاری تیرا
خالی ہیں مرغ چمن باغ میں صیاد رہے

بادشاہ ہوں نہیں ہوں محبوب نہ درویش ہیں
یا الٰہی تری دنیا میں کیا یاد رہے

کوئی دے حشر میں کس طرح حساب [illegible]
بھولوں کے خواب کی [illegible] دیکھے یاد رہے

پنہاں نہیں ہے کوئی جگہ تجھ سے اے صنم
رو پوش ہو کے بندۂ عاصی کدھر چلے

حیرت سے سرنگوں ہیں اشاروں کی انگلیاں
ہم شش جہت میں جیب الٰہی کدھر چلے

نام اس شوخ کا سن کر یہ ملک کہتے ہیں
یہ شرر دیکھیے یہ خرمن آدم کا ہے

بال بکھرائے ہوئے آئے ہو کیوں مقتل میں
اٹھ کے دے نہ بلاؤ کہیں مرنے والے

لے کے گرد کار نہ تاب [illegible]
افسانہ [illegible] بہت [illegible]

بگڑ دی ہوئی ہے سارے حسینوں کی بناوٹ
اللہ نے عالم کیا بے ساختہ پن کا

آئینہ جس عکس کا تھی اب پتہ ملتا نہیں
آشنا کیا کہ خود آشنا ملتا نہیں

آئینہ کو اس پری کا عکس اڑا کر لے گیا
جب سے یہ دل میں یاد [illegible] ملتا نہیں

کیا جانے کیا لطافت ہے جلوہ [illegible]
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر

دنیا سے ہے باہر دل دیوانہ کسی کا
بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

ناحق دل نافہم ہے دیوانہ کسی کا
ہم سے بھی تھا یونہی یارانہ کسی کا

ساقی نگہ مست تری لڑتی ہے دل سے
کیوں چور نہ ہو نشہ میں پیمانہ کسی کا

پڑ گیا جیسے تری شوخیوں کا پچھتاواں
کبھی مچلا نہیں بیٹھا دل بیتاب اپنا

نشۂ جوش جوانی میں ہے بدمست حسین
غیروں کی آنکھوں میں ہم دیکھتے ہیں خواب اپنا

ساری خرابیاں رہیں غربت میں اپنے ساتھ
پھر کس طرح خراب ہمارا وطن ہوا!

جس دل میں ترے وصل کا ارماں رہ گیا
حسرت کا دین پاس کا ایمان رہ گیا

ہمصورتی کے رشک سے دیکھا نہ آئینہ
ان کو بھی اپنی دید کا ارمان رہ گیا

پوچھا گیا یہ حشر میں تصویر جان کر
اچھا رہا جو عشق میں حیران رہ گیا

ابروئے یار دیکھ کے اب بھولنا محال
بالائے طاق آج سے نسیاں رہ گیا

طائر جان جو سوئے گلشن ایجاد آیا
پیشوائی کے لئے دوڑ کے صیاد آیا

شاخ گل صحبت مرغان چمن فصل بہار
ہائے کس وقت مری تاک میں صیاد آیا

بتوں کے قدرداں بہر محبت عشق سے ناصح
یہ بیچارہ سیدھا مسلماں نکلا!!

دلفریبی کی ادائیں ابھی آجاتی ہیں
سامنا چاہئے پر چشم تماشائی کا

تھا وہ کعبہ ہی جو قبضے میں بتوں کے آیا
پاؤں اٹھے تو دل دوست میں دشمن تیرا

قبر شہید چھوڑ کے گھر میں جو گندھا
وہ پھول چشم عشق میں سنگ چمن ہوا

کعبہ تک یارب پہنچ سکتا نہیں تیرا خیال
ان بتوں نے طاق نسیاں پر اٹھا کر رکھ دیا

شوق ایماں سے دل دنیا طلب کو کیا غرض
کیوں نجس شیشہ میں بھر کر آب کوثر رکھ دیا

جب کہا میں نے نقاب الٹو خدا کے واسطے
آئینہ اس شوخ نے مجھ کو دکھا کر رکھ دیا

ناز کا دعویٰ مسلم پر یہ سوچو تو کہی
حسن نے قرآن دو عالم کس کے آگے رکھ دیا

رہنے دے خواب عدم آنکھوں میں اے شورش حشر
یادگار ایک یہ ہے عالم تنہائی کا

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا رنگ

محمد جعفر امید

ناسخ کے بعد غزل میں اصلاحی تحریک محمد جعفر صاحب امید نے پیش کی وہ معشوق مجازی اس کے حسن ظاہری اور سامان آرائش کا ذکر نہیں کرتے تھے محبوب کو حالت اطلاق میں رکھتے تھے اس کا مرد یا عورت ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا لفظ یار کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ شراب کباب کا ذکر زاہد و ناصح پر پھبتی حضرت خضر کی عمر یوسف کے حسن موسیٰ کے طلب دید کا مذاق اڑانا یا اس کی تخفیف کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے [1]

یہ تحریک ان کی زندگی تک تو باقی رہی ان کے کچھ شاگردوں نے بھی ان کی تقلید کی مگر ان کے بعد مرگئی اور اس کو مرنا بھی چاہیے تھا اس سے غزل کی ساری دلکشی ختم ہو جاتی۔

---

[1] مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کے لئے یہ اصلاحیں تجویز کی ہیں مگر کہیں امید صاحب کا ذکر نہیں کیا جو کھلا ہوا سرقہ ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ توارد ہے سرقہ نہیں ہے مگر یہ صحیح نہیں مولانا حالی جس زمانہ کے آدمی ہیں اس زمانہ میں دہلی اور لکھنؤ زبان کا مرکز سمجھا جاتا تھا عام طور پر لوگ لکھنؤ کی اصلاحیں جاننے کے خواہشمند رہتے تھے اسی ضرورت سے خورشید صاحب نے افادات لکھی تھی جس میں ان کا ذکر بھی ہے سنہ ۱۸۹۰ء میں یہ کتاب شائع ہوئی خورشید صاحب لکھنؤ کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور ان کی شہرت تھی شاہ ان بلگرامی وغیرہ ان کے شاگرد تھے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ مولانا حالی ان سے بے خبر ہوں خاص طور پر ان کی کتاب ہے جس کا موضوع فن شاعری اور لکھنؤ کے اس وقت کی زبان و شاعری میں اصلاحیں ہیں۔

آمید صاحب مولانا سید محمد باقر شریف الملک منصف الدولہ (متوفی سنہ ۱۲۵۸ھ) کے بیٹے اور سلطان العلماء سید محمد مجتہد العصر (متوفی سنہ ۱۲۸۴ھ) کے پوتے سنہ ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۹۳ھ میں انتقال ہوا۔ سرائے معالی خان میں مکان اور امام باڑہ تھا، یہیں سکونت تھی۔

غدر کے بعد انگریزوں نے سلطان العلماء کی دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن پشت در پشت کے لیے مقرر کی تھی مگر ان کی اولادیں بہت تھیں اور اکثر ان کے سامنے مر گئی تھیں بہت سے پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں محجوب تھیں ان کے لیے گورنمنٹ نے جین حیاتی پنشن مقرر کی تھی آمید صاحب بھی انھیں میں سے تھے جن کو سو روپیہ ماہوار جین حیاتی پنشن ملتی تھی وہی ذریعہ معاش تھا۔

تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ دبلے پتلے متوسط قد کے آدمی تھے جو گوشیہ ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے جو اس زمانے کے شرفاء کی وضع تھی۔

اولاد میں صرف ایک بیٹے محمد کاظم عرف بندہ کاظم جاوید (اپنے زمانہ کے مشہور شاعر) تھے دو مرثیے اور ایک دیوان یادگار چھوڑا مرثیے عام طور پر لکھنؤ میں سُنے تھے دیوان جاوید صاحب کے پاس تھا ان کے بعد ان کے بعد مجاور حسین صاحب تمنا کے ہاتھ لگا وہ اسے چھپائے رکھتے اور کسی کو نہ دکھاتے بس اس کی حفاظت سمجھتے تھے بڑی مشکل سے چند غزلیں مجھے دی تھیں یہ ان کی بڑی عنایت میرے حال پر تھی اب ان کے انتقال کے بعد اس کا کیا حشر ہوا نہیں معلوم۔

آمید صاحب کی اہمیت کا جب مجھے علم ہوا تو ان کے حالات معلوم کرنے کی فکر ہوئی مگر کوئی بتانے والا نہ ملا۔

خمخانہ جاوید اور آب بقا میں ان کا ذکر ہے مگر کوئی کارآمد بات نہیں۔ شاد عظیم آبادی نے ذکر شعراء میں ان کی نفاست و پاکیزگی ذوق

کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ میر انیس کے ایک بند میں تار، بار قافیہ اور پہ ڈورے ردیف نظم ہو گئی جس مجلس میں انھوں نے وہ مرثیہ پڑھا اس میں امیر صاحب بھی شریک تھے جب انھوں نے وہ بند پڑھا جس کے دو مصرعے ہیں ؎

اس طرح رگ ابر گہر بار پہ ڈورے — جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

امیر صاحب نے کہا واہ کیا ردیف ہے تعریف نہیں ہو سکتی برسوں اس کے چرچے رہے۔

مشہور ہے کہ انھوں نے بجلی کی صدا اور اس کے تار پر دوڑنے کو بھی غلط کہا تھا۔

میر انیس نے ردیف کے بھونڈے پن پر تو خاموشی اختیار کر لی مگر بجلی کی آواز اور اس کا تار پر دوڑنا کسی اور مجلس میں ثابت کیا۔

افادات مصنف مولانا سید محمد مصطفیٰ صاحب خورشید (متوفی ۱۳۱۸ھ) سے معلوم ہوا کہ علم قیافہ میں بڑی مہارت ہم پہنچائی تھی نہایت شگفتہ مزاج تھے بچوں میں بچے اور بوڑھوں میں بوڑھے جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو متوجہ کر لیتے تھے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے پرانے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ سالم کے موجد وہی تھے شاعری میں نواب عاشور علی خاں تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے جو نواب صاحب سعادت علی خاں کے پوتے صاحب علم اور مقدس آدمی تھے اپنے دور کے مسلم اساتذہ میں شمار تھا بڑے بڑے نامی شاعر شاگرد تھے جان صاحب ریختی گو اور چرکین مزاحیہ گو بھی شاگرد تھے اور ہر ایک کو اس کے ڈھنگ میں اصلاح دیتے تھے مگر خود صرف نعت و منقبت کہتے تھے ان کا سارا کلام مفقود ہو گیا صرف ایک منقبت تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے

قلمی نسخہ میں ملے ہے جس سے ان کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اب اثیمؔ صاحب مرحوم کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔

کیا ہے لن ترانی نے قوی دعویٰ بصیرت کا — وہی بینا ہے جو قائل ہوا ہے نفیِ رویت کا
جو آتا ہے تصورِ وسعتِ دامانِ رحمت کا — نسیم لطف پردہ کھول دیتی ہے عدالت کا
بڑھے ہیں جو حجابِ قدس رحمت سے بھی کچھ آگے — نہ ان پر بھی کھلا پردہ تری کنہِ حقیقت کا

کچھ رفتگانِ ملکِ عدم کا نشاں ملا — ذروں سے خاک کے جو کوئی استخواں ملا
پہنچے قلم اسی کو کیا باغباں نے — جس شاخ پر چمن میں ہمیں آشیاں ملا

امن انساں شماتت سے کہاں رکھتے ہیں — دہر میں آتے ہی نام اہلِ جہاں رکھتے ہیں
ساتھ آہوں کے جو آنسو بھی ٹپک جائیں گے — شعلے اور آہوں کے پانی سے بھڑک جائیں گے
پختہ کاروں کے مضامیں نہ رہیں گے محفوظ — وہ ثمر نخل سے ٹوٹیں گے جو پک جائیں گے
عہدِ پیری میں بھی سرگشتہ ہوس رکھے گی — سر کو ہوگی حرکت پاؤں جو تھک جائیں گے
بارِ عصیاں سے ہمیں چار ملیں سبکی ہوگی — جو اٹھائیں گے جنازہ تو وہ تھک جائیں گے

روشنی داغِ دل بزمِ دلِ مضطر میں ہے — یا چراغِ طور کا جلوہ خدا کے گھر میں ہے

ملتا نہیں پتہ در و دیوار و سقف کا — تصویر لامکاں کی ہمارے مکاں میں ہے

باحشم راہ روِ ملکِ عدم رہتے ہیں — دوشِ احباب پہ چلنے میں قدم رہتے ہیں
منتظر ہم سفروں کے ہیں بچھڑ جانے سے — اشک اس واسطے رخسار پہ تھم رہتے ہیں

شاکی ہے عبث رزق جو گردوں نہیں دیتا — کوئی بھی تقدیر سے افزوں نہیں دیتا

جھک کے ملنے کو ترقی میں نہ چھوڑو — دیکھ اس رفعت پہ گردوں خم رہا

سودا ازل سے عشقِ حقیقی کا سر میں ہے — جس جا نظر کا کام نہیں وہ نظر میں ہے
امراضِ دہر سے بنی نجات اپنی ہے محال — داخل دوا کی فکر بھی عیب و ہنر میں ہے
رکتا نہیں ہے توسنِ عمرِ رواں کبھی — گھر میں بھی بیٹھنا مرا داخل سفر میں ہے

نالۂ اے درد ہو تعریف کے قابل میرا   ناوک آہ میں کھینچ لے اگر دل میرا
ہر قدم اٹھتی ہے تعظیم کو جب چلتا ہوں   پاس کرتی ہے یہ گرد رہِ منزل میرا
جو مقدر کا ہے دیدے مجھے بے منت غیر   حصۂ غیر میں حصہ نہ ہو شامل میرا
بیٹھتا اٹھتا میری طرح رواں ہے یہ بھی   ساتھ دیتا ہے غبار رہِ منزل میرا
سانس چلتی نہیں یہ عمر رواں جاتی ہے   ہے ہر اک تارِ نفس جادۂ منزل میرا
وہ موحد ہوں کہ شرکت سے ہے تنفر مجھے   رنگ ہوگا نہ کسی رنگ میں شامل میرا
عیش دنیا کے مزے ساتھ جوانی کے گئے   اب تو امید عدم میں ہوں نہ وہ دل میرا

ملتی دوش صبا پہ مرا غبار رہا   ہوا جو خاک بھی تو آسماں پہ قادر رہا
گدا جہاں کے ہوئے ہم بھی شاہ کہلائے   نبی کو فقر کی دولت پہ افتخار رہا
ہوا بلند بھی جو ہماری سیاہ کاری کا   کبھی چراغ نہ روشن سر مزار رہا
نظر گئی سوئے صانع ہر ایک صنعت سے   ہزار پردوں میں نور اس کا آشکار رہا
جب آیا سامنے محشر میں نامۂ اعمال   امید تم سے کرم کا امیدوار رہا

چشم نے آنسو کا عقدہ حل کیا   تھا جو اک قطرہ اسے دریا کیا
آنکھ دی تو نے تو نظارہ کیا   تیری آنکھوں سے تجھے دیکھا کیا
اہل مسند خاک میں آخر ملے   دولت دنیا پہ کیوں تکیہ کیا
خامشی سے بڑھ گئی مشق سخن   چپکے رہنے نے مجھے گویا کیا
غم پنہاں کی رسائی دیکھئے   دل میں آ کر غم نے گھر پیدا کیا
ظالموں سے خلق کو پہنچا نہ فیض   خون ابر تیغ سے برسا کیا
بزم سید طاہر سے میری اٹھا   انقلاب دہر نے یہ کیا کیا

اٹھے عصا بھی نہیں اتنے بار کے قابل   عصائے آہ ہے اس جسم زار کے قابل
گھٹا دیئے مرے غم نے قمر کے ٹکڑے ٹکڑے   کمال بھی نہ رہا اعتبار کے قابل

پس فنا اثر ضعف مرے کام آیا — زمیں رہی نہ لحد کی فشار کے قابل
پس فنا دل احباب صاف ہیں مجھ سے — میں خاک ہو کے نہیں ہوں غبار کے قابل

ہنر سے ہاتھ کے ہم رزق پا نہیں سکتے — خط جبیں سے خط اپنا ملا نہیں سکتے
محال اوج نہ کیوں کر ہو خاکساروں کا — زمیں سے نقش قدم کو اٹھا نہیں سکتے

یہ نعمتوں کی حلاوت نے بند کر دیئے لب — زباں پر شکر کے کلمے بھی آ نہیں سکتے
روا ہو دل شکنی کیا ہمارے مذہب میں — خدا کے گھر کو مسلماں ڈھا نہیں سکتے
وہ دوست خاک ہماری لحد پہ بیٹھیں گے — جو فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
تمھیں چلو تو چلو دوستوں کے پاس امید — گئے جو ملک عدم کو وہ آ نہیں سکتے

شوق یہ سیر عدم کا کم نہیں — وہ چلے جاتے ہیں جن میں دم نہیں
ہر گل خنداں گریباں چاک ہے — واہ رونے سے یہ ہنسنا کم نہیں
توڑتے دیکھا ہے لاکھوں ہی کو دم — کچھ نفس کا تار مستحکم نہیں
فکر نا اید کس لیے ہے اے امید — پاؤں پھیلانے کو تربت کم نہیں

گوارا اپنا نقصان ہو تو نفع غیر ہے — جہاں میں زخم نے گھٹ کر بڑھائی قدر مرہم کی
سحر کو پھول ہنس دیتے ہیں شبنم شب کو روتی ہے — چمن کا رنگ بھی تصویر ہے نیرنگ عالم کی

دور سے دیکھنے والے جسے سمجھے تھے غبار — شامیانہ وہ سر گور غریباں نکلا

شاگردانِ اسیر

مہدی حسین ناصر

تعارف :- خاندان اجتہاد کے رکن رکین شہر کے بڑے روساء میں تھے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے عربی گھوڑوں سے اصطبل بھرا تھا چار گھوڑوں کی گاڑی پر نکلتے تھے مشاعرے اور مجلسیں بڑی دھوم سے کرتے تھے جن کے تکلفات مشہور ہیں۔ سنہ ولادت معلوم نہیں ۱۳۲۰ھ میں انتقال ہوا شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے خلاق معانی کہے جاتے تھے۔ مولوی علی میاں کامل کا دعویٰ ہے کہ ؎

سرزمین ہند میں اب تک نہیں پیدا ہوا　　آپ کا ایسا بلیغ نکتہ داں نازک خیال

پیارے صاحب رشید کا قول مشہور ہے کہ ان کے ایسے شعر کوئی کہہ نہیں سکتا۔

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے لکھا ہے کہ ان کا مرتبہ انہیں سے کم نہیں ان کا خاص رنگ یہ ہے ؎

رگوں سے سر میں مرے نشۂ شراب آیا　　طنابیں کھچ گئیں گردونہ آفتاب آیا

مگر میں تسبیح کا ہوں دانہ جو اس کو کھونا تو اس کو پانا

ہزار پھیرتا ہے زمانہ فراق دیکھا نہ ہمنشیں کا

آوارگی کے لطف کو سوزن سے پوچھیے　　لاکھوں بنائے گھر مگر اک میں مکیں نہیں

زباں سے کام کم لے گر بقائے دم کا خواہاں ہے　　کہ عمر رشتہ گھٹتی جاتی ہے زبانِ سوزن میں

حیرت مجھے روانی عمر بشر میں ہے　　لنگر پڑا ہوا ہے سفینہ سفر میں ہے

کریں کس وقت کارِ دین و دنیا اہل عالم　　نہیں ملتی ہے فرصت سانس لینے سے کوئی دم بھی

تاثیر ضعف عالم پیری میں دیکھنا　　سایہ بھی بے عصا نہ چلا ہم جہاں چلے

اس طرح کے اشعار کے علاوہ ایسے شعر بھی بہت ہیں جیسے آجکل پسند کئے جاتے ہیں ؎

تو ہی اے شوق بتا ہے کوئی منزل ایسی — داخلہ لیلے کا بانگ درا سے نہ ہوا
خاک آگاہ شکست دل نازک سے وہ ہوں — آشنا ٹوٹ کے شیشہ یہ صدا سے نہ ہوا
کیوں نہ تڑپائیں مجھے سوز الم میں آہیں — کون شعلہ ہے جو بیتاب ہوا سے نہ ہوا

ہوں وہ بے خود ٹھیس گر شیشہ کو لگتے دیکھی — جان کر اپنا دل نازک میں نالاں ہو گیا

تھی یہ صورت تو اثر کا میں گلہ کیا کرتا — ہاتھ مطلب سے اٹھاتا تو دعا کیا کرتا

وہیں ہم زباں تنگ ہو رہا ہے کچھ بیاں میرا — چمن میں جس طرف اجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

نہ دیکھیں دیکھنے والے بھی ایسے رہے جلوہ — کھلے یہ حسن کہ آخر حجاب ہو جائے

ملتے ہیں ہاتھوں سے کاغذ کو وہ یوں — چھپ رہا جاتا نہیں تصویر سے

لن ترانی سے کھلا ناز کا بھی راز مجھے — پردہ ہوتا تو سناتے نہ وہ آواز مجھے
مرض موت ہوا دہر میں آغاز مجھے — میں تو کہتا تھا ہوا یاں کی ہی ناساز مجھے

تن خاک ہے تو زیست کا کیا اعتبار ہے — جو عضو ہے غبار کا نقش و نگار ہے
رحمت سے دور ہوں تو کروں ترک معصیت — یوں بھی تو مشکل آ رہی ہے پروردگار ہے
رحمت کے اعتماد پہ جا ہر کیے گناہ — اب عفو وہ کرے نہ کرے اختیار ہے

اللہ ری شرم آئی جو تصویر بھی مری — آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیے فرط حجاب میں
گشتہ ہوی ہے کوئی تو ایسی ہی آرزو — آنسو تڑپتے آتے ہیں چشم پر آب میں
شاخیں بلائیں لیتی ہیں جھک جھک کے بار بار — عالم ہے کس کی نیند کا سبزے کے خواب میں
راضی ہوں دیکھ میرا تڑپنا جحیم میں — رحمت جو تیری دیکھ سکے اضطراب میں
رحمت کو اضطراب ہے نالاں میں اہل حشر — یوں سر کو خم کیے میں کھڑا ہوں حجاب میں

لاکھ کوئی کہے تجلی کی ادائیں ہیں گواہ — نشہ آنکھوں میں جوانی کا ہے مخمور نہیں
کوئی ہے دل میں مگر آگ لگنے والا — آپ سے آپ جلے شمع یہ دستور نہیں
جس سے دن وصل کا بن جائے مری ہجر کی شب — سحر وہ نرگس جادو کو بھی منظور نہیں

حشر میں ہوتا ہے جو کچھ وہ بجا ہوتا ہے — آپ آجائیں تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
غیر ممکن ہے کہ یوں جائے مرا سوزِ الم — شمع کو شعلہ فنا کر کے فنا ہوتا ہے

رضا کی ہو جو منافی وہ التجا نہ کرے — طلب سے ہاتھ اٹھائے مگر دعا نہ کرے
صدا جو سنتا ہے منہ پھیر کر وہ روتا ہے — کسی سے حالِ اسیرِ قفس کہا نہ کرے

بچپن کی ہے جو چال وہ اب پر نظر نہیں — کس کی خبر انہیں ہو جب اپنی خبر نہیں
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پہ سر نہیں — کیا کر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں
کچھ حالِ دل چھپائے تو ہیں اپنے زعم میں — نیچی نگاہ جو ہوتی ہے اس کی خبر نہیں

قیامت جیسے آنکھوں میں نظر آتی ہے دیر آنکھ کو — زمیں سے چلنے میں کھینچا ہوا دامن اٹھاتے ہیں

خیالِ خاطرِ نازک تھا عفو ہو تقصیر — جگر کو تھام کے اب عرضِ حال کرتے ہیں

بندھیں باندھے سے کس اہلِ وحشت غیر ممکن — ہوا کیا گر پڑی زنجیر رشتہ پائے سودا میں
ہوا کے دم سے اتنا بھی اگر ہے تو غنیمت ہے — مرے ٹکڑے پرے پر آ کے جاتے ہیں نشیمن میں
یہی تو ہیں ادائیں قتل کرتی ہیں جو محفل کو — کہ خود بیٹھے ہیں اور تصویر پوشیدہ ہے دامن میں
نظر میں کیوں نہ ان کی نشہ آتا آنکھ سے نکلا — کہ مے مستوں کے ہاتھوں سے بھی گر جاتی ہے

داغِ دل وقتِ جوانی جلوہ گر کیونکر نہ ہو — ضو فشاں ہنگامِ شب نورِ قمر کیونکر نہ ہو

کہاں وہ چال کہاں خستگی حال گئے دل — خدا کسی کو تمہاری طرح جوان نہ کرے

زیست کے دن کر کے پورے نکلی ہے تن سے روح — جس کو بھرنے لے گیا خالی ہیں وہ پیمانہ ہو

ہیں جو محتاط وہ کہتے نہیں رو کو بھی خار — ڈر یہ رہتا ہے کہ وہ بھی تو زبان رکھتے ہیں

نصف بہار آئی ہے صیاد رحم کر — قیدی کوئی قفس میں ہمارے سوا نہیں

جان ڈالے قالبِ بے جان میں گر قدرت تری — رنگ دوڑے خون بن کر پیکرِ تصویر میں

داغِ دل میں کیوں مرے ضیا دیتے ہیں — نیند کے وقت تو شمعوں کو بجھا دیتے ہیں
ہچکیاں نزع میں آتی ہیں تصور سے ترا — تو سنے یا نہ سنے ہم تو صدا دیتے ہیں

اللہ خیر بھیجو دل کی شتاب میں
تاریک شب ہے اور کوئی پاسباں نہیں

جاگے ہیں رات بھر وہ اسی اضطراب میں
وہ دیکھتا نہ ہو مری صورت کو خواب میں

قاصد کے انتظار میں آخر ہوا یہ تنگ
لکھنے لگا میں آپ خط اپنے جواب میں

محجوب کس گناہ سے یارب ہوا ہوں اس قدر
رحمت کو دیکھتا ہوں تری اضطراب میں

دیکھے رہیں نہ ہاتھ وہ پھر ہے یہ کس طرح
عادت ہے پیار کی کسی خانہ خراب میں

بے خوف زاہدی میں چلا ہوں سوئے جحیم
رحمت نہ تیری دیکھ سکے گی عذاب میں

پوچھی جو قیس سے سختیِ راہ عشق
پاؤں کے خار رکھ دیئے سر سے نکال کے

اک عاشقوں کی بات تھی اسکو بھی کہہ دیا
موسیٰ ملے جواب ارنی کے سوال کے

جوش دو دل سے اگر آہ رسا آتی ہے
ٹوٹتا ہے کوئی شیشہ تو صدا آتی ہے

گوش دل سے مری آواز کو سنتے ہیں ملک
میرے پردے میں کسی کی جو صدا آتی ہے

مجھ پہ کھلتا نہیں اے قافلۂ شب گزراں
دل دھڑکتا ہے کہ آواز درا آتی ہے

کان آواز کے وحدت سے بھرے ہیں ایسے
کوئی بولے مجھے تیری ہی صدا آتی ہے

پردۂ دید میں کیا کام نکالا موسیٰ
اب تو کانوں میں وہ مطلوب صدا آتی ہے

جلوہ گر ہو کے نکلتا ہوں جو جیب سے جاتا ہے
کچھ شرر میں نظر آتی ہے شرارت تیری

حشر میں آتے ہیں اس شان سے مجرم
قہر آگے ہے پس پشت ہے رحمت تیری

عکس آئینہ میں جس طرح نظر آتا ہے
یوں ہی گھر کے دل میں اتر آئی ہے صورت تیری

گر نہ سمجھے قدر تو نا قدر دانی آپ کی
ہر ادا ہے ناز پرور دلربائی آپ کی

دو ہی چیزیں ہیں نہیں جن کا زمانے میں نظیر
موسم گل باغ کا فصل جوانی آپ کی

کونسا انصاف ہے آئینہ رکھنا ہاتھ سے
آپ کی صورت نہ دیکھے نوجوانی آپ کی

کانوں میں مردوں کے بھی جانے لگی آواز پا
رو گئے عمر گذرتی ہے جوانی آپ کی

سبب یہ تھا کہ جو مستوں میں انقلاب آیا
جو بھر کے آنکھ بھری ایاغ شراب آیا

خدا کی شان کہ شرم آئی عکس آئینہ سے
وہ اجنبی ہے کہ خود سے بھی جب شناسا ہوا

بہ طریق ہوا عاشقوں ہی کا مطلب
وہ سو گئے چین سے مجھ کو اگر نہ خواب آیا

دھمک نے پاؤں کی تربت میں یہ کہا مجھ سے
خبر تجھے نہیں یاں عالم شباب آیا

جہاں میں ہم سے زیادہ حسین ہے شاید
پسینہ آ گیا تم کو بھی جب حجاب آیا

جب سے آئی ہے جوانی یہی دیکھا ہم نے
جاگ کر رات کٹی صبح کو آرام کیا

شوق کی نظروں نے کام اپنا جو کرنا تھا کیا
بے خبر کیوں ان سے اتنا ان کا آوازہ تھا

رہ گیا تھا کیا یونہی خالی پھڑک کر قید میں
تیلیوں کی جا قفس میں کچھ پر پرواز تھا

حسن کی نیرنگیاں دیکھیں مگر سمجھے نہ یہ
شعبدہ تھا سحر تھا جادو تھا یا اعجاز تھا

زخم اپنے دل کے بھی تو دیکھ اے ناوک فگن
میں بھی اپنی پاس کی نظروں سے تیر انداز تھا

میں تو کروں نہ درد دل اپنا کبھی بیان
ہر آہ کو مگر طول سخن میں ہے

روح کو تن میں نہ کیوں جوش الم ہو ماہر
شمع ہر بزم میں جلنے کے لئے آئی ہے

پیری میں بھی چمک ہے داغ جگر میں ہے
حیران ہوں کہ شب کی طرح ضو قمر میں ہے

روح اپنے جسم میں کیونکر رہے بعد شباب
شمع کو دیکھا تو شب بھر کیلئے محفل میں ہے

فلک سمجھا نہ کچھ بزم جم میں صحبت غم کی
اداسی ہی تو رونق تھی ہماری بزم ماتم کی

کون بڑھ سکتا قیامت تھا قد دلجوئے دوست
ایڑیوں تک آ کے آخر رک گئے گیسوئے دوست

آفت کے جذب دل نے اثر کی شبیہ لے دوست
میری نظروں سے جو آئینہ نے دیکھا روئے دوست

ہوتی زباں اگر تو میں کہتا دم ازل
دل تو نہ لوں گا لے کے میں پردہ دید کا دل

بے خودی سا بھی کوئی دہر میں ہمدم سا نہیں
غم نہیں عشق نہیں سوز نہیں ساز نہیں

گھر وحشت چشم بہکتی ہے کہ جاگے ہو تم
سونے والوں کی تو آنکھیں کھلتی دیر نہیں

ہے یہی تازہ اسیری میں پھڑکتا جو مرا
یا قفس آج نہیں یا پر پرواز نہیں

عدوئے جان سے کوئی یہ کہہ دے اے ماہر
قضا سے کام وہ لے جو تری ادا نہ کرے

ہم تو واقف بھی نہ تھے حشر سے اس سر کی قسم
آپ آئے تو یہ سمجھے کہ قیامت آئی !

کس کے مرنے کو سوائے دل ماہر نہ سنا
اک یہی تھی خبر ایسی جو سنائی نہ گئی

تجلی میں دکھایا اپنا پر تو یار جانی نے
کیا کچھ اور سنایا کچھ صدائے لن ترانی نے

قبا اسکی پسینہ آگیا گرمی سے اُف اُف کی
لگایا جب گلے اچھی طرح ان کو جوانی نے

رہا سینہ سے سر کی خبر کچھ بھی تجھے سونے میں
انھیں بیہوشیوں سے سر اٹھایا تھا جوانی نے

وہ ہوں جو روشنی شمع پردہ فانوس
تو کیوں نہ حسن کلیجے کے پار ہو جائے

دیوانے بیخودی میں پہنتے ہیں بیڑیاں بھی
عمل ہو رہے ہیں آمد فصل بہار کے

صیاد قید زیست سے مجھی میں تو چھٹ گیا
اب کیا تو دیکھتا ہے قفس کو اتار کے

مجرم بھرے بخیر تو مرسل یہ بول اٹھے
ہم بھی گناہگار ہیں پروردگار کے

کیا یونہی مر گئے تھے جوانان عشق باز
دم توڑنے کے خاک پہ بیر ہوں نشاں رہے

یہ تو کبھی میرے پھڑکنے کی بوستاں کیلئے
قفس کی تیلیاں لایا ہوں آشیاں کیلئے

اسی کو ہوش میں دیکھا اجڑتے آنکھوں سے
جہاں میں تنکے چنے تھے جس آشیاں کیلئے

اسی سے کھل گیا حال قفس مرا سارا !
بیرون میں تیلیاں اٹھی تھیں جو نشاں کیلئے

نگاہ شوخ موسیٰ نے تو کب دیکھا تھا
فروغ حسن گر پردہ نہ رکھے لن ترانی کا

خدا بخشے بہت کہا اس دل کا اپنے خاتمہ سمجھے
لہو سا کچھ نظر آیا جو باہر مجھ کو آنسو میں

یہی جو آیا تو زمانہ میں ملا بھی آئی
بزم میں شمع کے آتے ہی ہوا بھی آئی

اب ٹوٹے بازوؤں کی بھی تدبیر کیا کروں
توڑا قفس کے در کو تو سر مار مار کے

شمع وحدت کا میں بزم میں پروانہ ہوں
ہے جنوں عقل خرد جس کا میں وہ دیوانہ ہوں

روح باعث ہے سیہ کاری کا میری ہر نفس
شمع جس گھر میں ہے اندھیر میں وہ خانہ ہوں

جو آئینہ سے وہ ترا صورت نما نہیں
یکتا تو وہ ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں

فصل بہار آئی ہے صیاد رحم کر
قیدی قفس میں کوئی ہمارے سوا نہیں

منشی امیر احمد امیر مینائی

تعارف | ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا لکھنؤ کے مشہور اساتذہ میں تھے اور اسیر کے شاگرد تھے۔

ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بت دعوی خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شان کبریائی کا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
تجھی سے پھر گلا الٹا مرے چاک گریباں کا

امیر آئیں گے گیا کیا شمع اور پروانوں کو چھپ چھپ کے
نیا انداز ہوگا تیرے مدفن پہ چراغاں کا

پچھتاتے ہیں خون مرا کر کے کیوں حضور
اب اس پہ خاک ڈالئے جو کچھ ہوا ہوا

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

شیخ کو تھوڑا نہ جانو یہ بڑا مکار ہے
ساری دنیا چھوڑ بیٹھا ہے تلاش حور میں

داور محشر کو بھائی میری ان کی چھیڑ چھاڑ
چھیڑ کر پوچھا مکرر کیا ہوا کیوں کر ہوا

چالاکیاں تو دیکھو مجھے قتل کر کے خود
اوروں سے پوچھتے ہیں یہ کیا ماجرا ہوا

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو!
تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے!

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر
ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

ماں کو مثل شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے
ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری
جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری

خزاں تم خیر سے گذری چمن میں بلبل کو
بہار آئی ہے اب آشیاں [illegible]

غضب تھی قیامت تری مستانہ ادا بھی
شگفتوں نے قدم چوم لئے لغزش پا میں

امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہنچیں اڑ کے پھولوں میں
کبھی چاک قفس سے جھانک کر [illegible]

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

اے موت تجھ کو کیا ہوا کوئی بتا سکا
[illegible] آ کے کدھر دیر ہو گئی

غنچہ و گل کو تو سو بار شگفتہ دیکھا — غنچۂ دل بھی الٰہی کبھی خنداں ہوگا!
ایک مٹھی بھر نے بنائی یہ ہماری صورت — سینکڑوں پرزوں میں کیا حال سلیماں ہوگا
دست وحشت تو سلامت ہے رفو ہونے دو — ایک جھٹکے میں نہ دامن نہ گریباں ہوگا
خواہش وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح — دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا — یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا
وہ ادھر ادھر تڑپتا ہے تو آرزو ہے یارب — رہے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا
جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا
مجھے زباں ہے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہدوں — اسے کیا کروں جو دل کو نہیں اعتبار ہوتا

جمال یار کو کہتے ہو تم کہاں دیکھا — کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا
وہی چراغ وہی گل وہی قمر وہی برق — نئے لباس میں دیکھا اسے جہاں دیکھا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی — وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولے جاتے رہے
آنکھ کیا ہے جو سیہی ہے سحر ہے اعجاز ہے — اک نگاہ لطف میں سارا گلہ جاتا رہا

شکوہ کسی سے سنگدل کا کروں میں کیا — یہ شیشہ چوٹ کھانے سے پہلے ہی چور تھا

آفت کی شوخیاں ہیں تمہاری نگاہ میں — محشر کے فتنے کھیلتے ہیں جلوہ گاہ میں

صورت تری دکھا کے کہونگا یہ روز حشر — آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

گڑ کر زمیں میں ظلم سے مجھ کو دفنا دیا — دیکھا تو نیچے خاک وہی آسمان تھا

بیداد تھی شوخی تھی جفا تھی کہ ستم تھا — دیکھی جو وفا آپ میں جو کچھ تھا وہ کم تھا

دھیان کیوں لفت میں باندھا اس لب جاں بخش کا — وائے قسمت دم نکلے اے مسیحا ابھی گیا

امیر کس سے کہوں کوئی اس پاس نہیں — شریک غم جو تھا اک دل اسے حواس نہیں
کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر — خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

ناز ہے تم کو بہت حسن کی یکتائی پر! — اک ذرا آئینہ خانہ میں تو چل کے دیکھو!

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی — کاروان عمر گزرا آگ باقی رہ گئی!

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا دور

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی

تعارف: ١٢٧٠ھ میں پیدا ہوئے ١٩٣٣ء میں انتقال ہوا ان کی ادبی و شاعرانہ عظمت مسلم ہے۔

ادا میں سادگی ہے کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا — شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں — ستم کیسا کیا شرمائے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے — تجلی بڑھ گئی موباف جو پہلے پہل ڈالا

خوشبو سے یوں ہی ہوش رُبا وصل کی شب تھی — گیسو ہوئے برہم تو کھلا نافۂ چیں اور
اللہ رے ساقی کا بضد ہو کے پلانا ! — کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ — تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

اُڑ کے جاتی ہے مری خاک اِدھر گاہ اُدھر — کچھ پتہ دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں — نفس کو خوں فشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا — بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر — کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر — چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے پہ رنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہے فسانہ — یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اُڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دیے دیتے ہیں پروانے — انھوں نے شمع کے شعلے کو شاید تاج زر جانا
ذرا سی ابر کی جو قطرۂ شبنم سے بھی کم تھی — سنا جوہر شناسوں نے اُسے آبِ گہر جانا

سارے عالم کو بنایا ہدفِ تیر اجل — قادر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
آج گم درد میں کیا شہرۂ آفاق جسے — کل اُسے محفلِ احباب کا افسانہ کیا
الحذر نظم بہت جھک کے فلک ملتا ہے — خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

ادھر جوانی کی شام آئی۔ ادھر ہوئی صبح عہد پیری — یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو اے شبنم — ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا — جھوٹی خبر کسی کی اُڑائی ہوئی سی ہے

منزل اسے سمجھ کے کمر کھولتے ہیں ہم — بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

مجھے دوڑا رہا ہے شوقِ منزل کا یہ کہہ کہہ کر — کہ گرنا بار بار اچھا نہ ٹھہرنا دم بدم اچھا

مرزا محمد ہادی مرزا رسوا

تعارف: ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔

حسن شاہد ہے مری نیرنگیٔ تحریر کا
اک ادا نے شوخ ہے جو رنگ ہے تصویر کا

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی!

تم کو الفت نہ ادا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی!

ہجر کی رات گزر ہی جاتی
کیوں تری زلف رسا یاد آئی

لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

کیا غزل کوئی کہی ہے مرزا
آج کیوں باد صبا یاد آئی

وہ بھی دن ہوں گے کہ ہم باغوں میں پینے جائیں گے
دیکھیے فصل خزاں کے کب مہینے جائیں گے

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج
دشت میں جا کے گریباں آپ سینے جائیں گے

زندگی، دولت، جوانی، بے خودی، شوق وصال
پھر ملیں گے بھی جو یہ سامان چھینے جائیں گے

موت ہی کو زندگی کہنا اگر ہے رسم عشق
مرنے والے آپ کے قبروں میں جینے جائیں گے

اپنی قسمت رہ پر آئے تو مرزا دیکھنا
کربلا ہوتے ہوئے اس کے مدینے جائیں گے

مشکل ہے ضبط گریۂ بے اختیار کا
کب تک نگاہبانیٔ دریا کرے کوئی

گو ادعائے شوق کے بالکل خلاف ہو
لیکن یہ مصلحت ہے کہ پردہ کرے کوئی

ہاں اے نگاہ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

ہاں دیکھنا ہے اس کے جنوں کا بھی امتیاز
مجنوں سے جا کے شکوۂ لیلیٰ کرے کوئی

دل بے نیاز اور طبیعت حیا پسند
وہ کیا کریں جو خواہش بے جا کرے کوئی

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں

ہم نشیں وہ بھی نحوست داستان ہجر کی
محفلیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

ہم کو بھی کیا کیا نئے کی داستانیں یاد تھیں ؛ لیکن اب تمہید ذکر درد و ماتم ہو گئیں
دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر ؛ ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کو برہم ہو گئیں
آئینے سے ہے ان کا ردو بدل ؛ تنگ ہیں شوخی، مقابل سے
شمع فانوس اس کی محفل میں ؛ جیتی کیوں ہے اہل محفل سے
اور تو سب تری محفل میں جمے بیٹھے ہیں ؛ بار بار اٹھنے کو کہتا ہے ہمیں کیا کوئی
سائلوں کے لئے اب کوئی سزا ہو تجویز ؛ جانتے ہو کہ نہ مانے گا نہیں سے کوئی
بے خودی میں بھی ہر ایک سے کہہ دیتا ہوں ؛ پوچھ لے جا کے مرا حال انھیں سے کوئی
خاک میں تو نے ملایا ہے کہاں مرزا کو ؛ حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی
حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج ؛ دشت میں جا کے بیاباں اب بسنے جائیں گے

سمجھا ہوں جو مراد ہے اس پھیر پھار سے ؛ ناصح کو بھی ہوس ہے کہ رسوا کرے کوئی
کیا ہنسی کھیل دل لگانا ہے ؛ دل کا آنا قضا کا آنا ہے
دل ناداں سے کیا فریب کرو ؛ اس کے پہلو سے اٹھ کے آنا ہے
دشت میں بھی تو دل نہیں لگتا ؛ اس جنوں کا کہیں ٹھکانا ہے

شعر گوئی فقط بہانا تھا ؛ حال دل کا انھیں سنانا تھا
تجھ سے کیا ہو کہ ہو گئی قاصد ؛ ساتھ ہی اس کو لیکے آنا تھا
کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم ؛ کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا
کچھ دنوں ہم سے دستکش رہیے ؛ دشمنوں کو بھی آزمانا تھا
وضع کے پابند ہم دیوانگی جن کو پسند ؛ پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا
شور فریاد تا فلک پہنچا ؛ مگر اس کو خبر نہیں ہوتی
تیرے کوچے کے بے نواؤں کو ؛ ہوس مال و زر نہیں ہوتی
جان دینا کسی پہ لازم تھا ؛ زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

کسی امید پہ نظر میری — شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی
ہم اسیران عشق کو صیاد — ہوس بال و پر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر — کیوں مرے حال پر نہیں پڑتی
اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے — دل لگی کی خبر نہیں ہوتی

سر سے ٹلتی ہیں شب غم کی بلائیں کیونکر — یا خدا ہوتی ہیں مقبول دعائیں کیونکر
دیکھو دیکھو مرے لٹنے کا تماشا دیکھو — اور ساون میں برستی ہیں گھٹائیں کیونکر
نہ سہی عشق و محبت بھی ہے آخر کوئی شے — رسم بڑھ جائے نہ کسی سے تو گھٹائیں کیونکر
وصل کی رات ہے پہلے سے بتا دو ہم کو — تم کسی بات پہ روٹھو تو منائیں کیونکر

عین وحدت خلاف کثرت ہے — لطف خلوت بھرا ہے محفل سے

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں — دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ — اسی آئینے میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

ہم ہستی سے گزر جانا تھا — موت کے قبل ہی مر جانا تھا
موت کیا چیز ہے؟ ترک لذات — ہے اسی موت سے مقصود حیات

رنگ و بو سے نہ رکھو کچھ مطلب — بجز خدا اور نہ ہو کچھ مطلب

اک مرے یار جیسے بال رسوا — وحشی، آوارہ، خانماں رسوا
مست، آشفتہ حال و آوارہ — بے دل و بے قرار و بے چارہ
ہرزہ گرد طریق گم نامی! — رہرو شاہ راہ ناکامی
دل پریشان و مضطر و بے تاب — زار، بے حال، بے خود و بے خواب
کشتۂ تیغ الفت جلاد — بسمل تیر حسرت بے داد
چشم بے خواب، خواب سے محروم — دل بے تاب، تاب سے محروم
قطرۂ اشک ارغوانی رنگ — چہرۂ زرد زعفرانی رنگ

خشک ہو ہونٹوں پہ آہ شعلہ مثال
اک پری وش کا نام ورد زباں

حیا کی شوخیوں سے آگے اٹھے جھک گئی نظر
مری قسمت سے ان کے تیر بھی آئے کماں ہو کر

غزل اس بحر میں ایک اور بھی لکھنا تھی ضرور
نہیں رکتی طبیعت اہل معنی کی رواں ہو کر

ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کی جو بنی
دوپٹہ اوڑھ کر آیا جو چلنے میں ابھرتے ہیں

تماشا ہو جو ان کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں
بہت جو چلتے ہیں داؤں کا دل لیکر مکرتے ہیں

جو ان چلتے ہی وہ لو اور ہی کچھ ہو گئے دلی
کہاں کی پاک بازی ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

آج اس بزم میں یہ وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

نالہ رکتا ہے تو سر گرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

پھر نظر چھپتی ہے آنکھ جھپکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

ہٹ کے ہستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام
چھپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے

حال دل ایسے نہ کہتا تھا ہیں جو کہ گئے
اب کے بات بیاں کی پوچھی تو گلا ہوتا ہے

تالب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

ہو ہوا بھی گھٹا اور بھی شراب بھی ہو
یہ سب بھی ہو مگر اک گلا ساوہ شباب بھی ہے

بعد توبہ کے بھی دل میں یہ ہے حسرت باقی
دیکھ تھیں کہہ کے اک جام پلا دے ہم کو

نہ پوچھ ہم سے کیوں کر زندگی کے دن گزرتے تھے
کسی بیدرد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہو گئی
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

بیہودہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں
ان مولویوں سے عقل مری زیر ہو گئی

اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا آ
ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی

میری تباہیوں کی تمہیں اب خبر ہوئی
کیا پوچھتے ہو عمر تو یونہیں بسر ہو گئی

آج اس نے ہم سے ملنے کا وعدہ کیا تو ہے
دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی

پیارے صاحب رشید

تعارف:- سید مصطفٰے مرزا نام پیارے صاحب عرف رشید تخلص میر انیس کے نواسے سید مرزا انس شاگرد ناسخ کے پوتے احمد مرزا صابر کے بیٹے عشق اور تعشق کے بھتیجے سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶) میں ولادت اور سنہ ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۷) میں وفات ہوئی۔

سید اصغر شاہ صاحب نے صرف و نحو اور مرزا محمد اخباری سے فقہ اور مولوی انور علی حنفی سے معقولات کی تحصیل کی شوق مطالعہ نے استعداد علمی بڑھائی شاعری میں اپنے چچا میر عشق اور تعشق کے شاگرد تھے دبلے پتلے میانہ قد لکھنؤ کی تہذیب و شرافت کا پتلا خوددار نازک مزاج کم سخن مرنجان مرنج انسان تھے معاصرین میں کبھی کسی سے سخن گسترانہ چشمک کبھی نہیں ہوئی غزل اور مرثیہ میں اپنے وقت کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور شہرت تھی شاگرد آغا شمیر نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب حیات رشید کے نام سے لکھی ہے:-

شروع عشق میں صبر اس دل مضطر سے کیا ہوگا
ابھی نا آشنا ہے رفتہ رفتہ آشنا ہوگا

ہے بے خود وصل میں دل ہجر میں مضطر سوا ہوگا
خوشی جس گھر کی ایسی ہے وہاں کا رنج کیا ہوگا

ابھی تو یاد ہے کہنے کی باتیں دل میں لاکھوں ہیں
نہ کچھ یاد آئیگا اس وقت جس دم سامنا ہوگا

انھیں عشاق کی گستاخیوں کا خوف رہتا ہے
کبھی غافل نہیں سوتے کہ کوئی جاگتا ہوگا

وہ گیسو بڑھتے جاتے ہیں بلائیں ہوتی ہیں نازل
قدم تک آ گئے جب حشر عالم میں بپا ہوگا

غضب کرتے ہو میرے دل کو ابرو سے چھڑاتے
بھلا سوچو تو کیونکر گوشت ناخن سے جدا ہوگا

عدم میں کیسا کیسا دم رکے گا ایک مدت تک
نئی بستی نئی پوشاک ہوگی گھر نیا ہوگا

رقیبوں کی امیدوں کو جگہ دیتے ہیں ہم دل میں
کہاں میں سے کوئی آخر ہمارا مدعا ہوگا

بیاں ہوتا ہے دل کا راز جب ایسی ہو بیتابی
ترا شکوہ کرونگا میں فقط جب دل خفا ہوگا

نہیں ہے جس میں ترا عشق وہ دل ہے تباہی میں
وہ کشتی ڈوب جائیگی نہ جس کا ناخدا ہوگا

اپنے گناہ دیکھ کے دفتر میں روز حشر
ہنگامہ ہائے بوس یاد آگیا

صد پارہ ہو کے پھیل گیا ہے ہمارا دل
شیرازہ کھل گیا ہے وفا کی کتاب کا

تنگ آکے میں نے حال نکالا جو وہ کیا قبول
انجام یہ ہوا ہے تمہارے حجاب کا

صبر لازم تھا مجھے ظلم کرنا تھا تمہیں
یہ لباس عشق تھا وہ حسن کی پوشاک تھا

محشر میں ہے سوال گناہ و ثواب کا
یہ ذکر ہو رہا ہے ہمارے شباب کا

نالے کی جارت اور تری آنکھوں سے لی مدد
عالم نے جب ارادہ کیا انقلاب کا

نیند بھر کے بھی نہ پائی تھی کہ آیا وقت کوچ
کھول کر آنکھیں جو دیکھا قافلہ تیار تھا

دکھ وفا جو اے ستم ایجاد آگیا
بھولے ہوئے تھے قصۂ غم یاد آگیا

رستہ گیا ہے سوئے حقیقت مجاز سے
بت یاد آگیا تو خدا یاد آگیا

دنیا کے سب امور فراموش ہوگئے
کیا جانے دفعتاً ہمیں کیا یاد آگیا

ہم زمانے سے گئے ہجر تن و جان ہوگیا
آج بالکل فیصلہ اے شام ہجراں ہوگیا

غش پڑے بیٹھے سا کہ سر بستر خوشاں تم آئے
تب نے آنکھیں کھول دیں گویا چراغاں ہوگیا

اب ہوا ثابت کہ ہمرنگی ہے حسن و عشق میں
آپ کا گیسو ہمارا دل پریشاں ہوگیا

دست وحشت نے بڑھائی اور بھی دیوانگی
جادۂ دشت جنوں ہر تار داماں ہوگیا

محو وہ زلفیں بنانے میں ہیں پروا بھی نہیں
کس کا بگڑا حال کس کا دل پریشاں کیا

لائے ہمراہ چھری دوسری قاتل میرا
خوں اغیار میں ہو جائے نہ شامل میرا

گو برا ہے دل مگر ہنس دیا ہے اسلئے
عشق کی خو گر طبیعت ہے کبھی کام آئے گا

قاصد مرگ آئے یا آئے تمہارا نامہ بر
کہہ رکھا ہے دل کہ کوئی آج پیغام آئیگا

روح کا تن سے نکلنا آپ کا جانا ہے ایک
کچھ عجب ہنگام ہوگا جب وہ ہنگام آئیگا

دونوں آنکھیں دل جگر میں عشق ہوئے ہیں شریک
یہ تو سب اچھے رہیں گے مجھ پہ الزام آئیگا

ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا — نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھا ہے گریباں پر

ہاتھ کھینچے ہوئے بیٹھے ہیں پئے سیرِ قفس — کہ نہ داماں قفس ہے نہ گریباں قفس
کب رہا ہو کے اسیری کا مزا دل سے گیا — آشیاں بھی جو بنایا تو بعنوانِ قفس

جوش میں دیکھئے صحرا میں بھی دیوانوں کی — وضع اک بعد بدلتے ہیں گریبانوں کی
کیجئے سالگرہ فصلِ بہار آ پہنچی — بیڑیاں پھر سے بدلوائیے دیوانوں کی
آج ہم روئے بہت دیکھ کے تصویرِ شباب — یاد تازہ ہوئی بھولے ہوئے افسانوں کی
سنگ گرتے تھے کبھی اشک نہ آنکھوں سے ٹپک — ابر دیکھی جو چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

دل ہی سے بھی ڈبوئے گا [illegible] — یہی کشتی یہی دریا ہے یہی لنگر ہے
مثل بو ہے وطن سے میں پریشاں نکلا — جامۂ تن کو وہیں چھوڑ کے عریاں نکلا
کس قدر جلد ہمیں بھول گئے اہلِ وطن — کوئی ہو کر نہ سوئے گورِ غریباں نکلا
دل کی بستی کا بہت ہم نے سنا تھا شہرا — شہر سمجھے تھے جسے ہم وہ بیاباں نکلا
تجھ سے اے جسم ہوئی روح جدا اسیری میں — ہو گئے بے قدر تجھ سے گو یہ مہماں نکلا
کچھ ہے شبنم و گل عالمِ نیرنگ کا حال — کوئی ہنستا ہوا نکلا کوئی گریاں نکلا
بام پر شب کو جو سرکی رخِ روشن سے نقاب — کاٹ کر راہ ادھر سے مہ تاباں نکلا

بجلی تڑپ تڑپ کے گری بھی کہاں کہاں — تنکے تو باغ بھر میں مرے آشیاں کے ہیں
کیا آپ جوڑتے ہیں دل پارہ پارہ کو — معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

خدا وحشت میں برکت دے سلامت ہم ایسوں کو — کہ بسم اللہ کہہ کر چاک کرتا ہوں گریباں کو
مدد دینے لگی ہے ہر قیامت خیز طوفاں کو — غضب ہو جائیگا کیا ہو گیا ہے چشمِ گریاں کو

1293
582
1875

بندہ کاظم جاوید

محمد کاظم نام بندہ کاظم عرف جاوید تخلص محمد جعفر صاحب اُمید کے م سنہ ۱۲۹۳ھ بیٹے مولانا محمد باقر صاحب منصف الدولہ بہادر م سنہ ۱۲۷۶ھ کے پوتے سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب م سنہ ۱۲۸۴ھ مجتہد العصر کے پڑپوتے۔

زین العلماء عضد الدین مولانا علی حسین م سنہ خلف سید العلماء سید حسین م سنہ ۱۲۷۳ھ کے نواسے سنہ [illegible]ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی کہاں تک ہوئی یہ نہیں معلوم۔

گیارہ برس کے سن میں والد کا انتقال ہو گیا ماموں (مہدی حسین ماہر م سنہ ۱۳۲۰ھ) نے پرورش کی ملاذ العلماء مولانا ابو الحسن عرف بچھن صاحب م سنہ ۱۳۰۹ھ نے وظیفہ معین کیا اس طرح جاوید کی ابتدائی زندگی خوشحالی میں بسر ہوئی۔

شادی خاندان ہی میں صادق علی عرف چھنگا صاحب م سنہ ۱۳۵۱ھ کی بہن سے ہوئی جو سید صادق صاحب م سنہ ۱۲۵۸ھ پسر سلطان العلماء کے نواسے تھے۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جب بیوی کا انتقال ہو گیا تو دوسری شادی نہیں کی۔ کتابی چہرہ۔ میانہ قد۔ گدبدا جسم وجاہت اور شان چہرے سے نمایاں تھی چوگوشیہ ٹوپی انگرکھا اس پر کوتاہ دومالی مشرو پاچہ الٹین کا پجامہ اور ڈربی کا پمپ پہنتے تھے ایک ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی خشخشی داڑھی تھی جب سے بال سفید ہونے لگے تھے خضاب پابندی سے لگاتے تھے۔

اختلاجی مزاج تھا ہیضہ سے بہت ڈرتے تھے گرمیوں میں اور خاص طور پر فصل کی خرابی کے زمانہ میں استخارہ دیکھ کے کھانا کھاتے تھے۔ اکثر فاقہ کرتے تھے۔

سفر سے بھی بہت گھبراتے تھے جب بضرورت کہیں جانے لگتے تو کوئی شاگرد قرآن کے نیچے سے نکالتا اور وہ دعائیں پڑھتے دونوں بازوؤں پر دم کرتے گھر سے نکلتے تھے۔

خلیق متواضع منکسر مزاج اور صاف دل آدمی تھے سیکڑوں لطیفہ یاد تھے جہاں بیٹھ جاتے تھے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ شیرازی کبوتروں کا شوق تھا نہایت عمدہ قسم کے رنگ برنگی کبوتر پلے تھے جب ان کی ڈھابلیاں کھلتی تھیں تو ایک چلتا پھرتا باغ نظر آتا تھا۔ دنگل کے بہت شوقین تھے پان کثرت سے کھاتے تھے۔ شاعری کا بچپن سے شوق تھا محمد مصطفیٰ عرف لڈن صاحب خورشید کے شاگرد تھے۔

شاعری میں ان کی شہرت غزل گوئی سے ہوئی اور اپنے زمانہ میں لکھنؤ کے سب سے بڑے غزل گو کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان کا مزاج عاشقانہ تھا غزل سے فطری مناسبت تھی اوائل عمر ہی سے انہوں نے شہرت حاصل کر لی۔

مہدی حسین صاحب ماہر کے انتقال کے بعد وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے اور غالباً اسی زمانہ سے مرثیہ کہنا شروع کیا جو اس زمانے میں باعزت ذریعہ معاش تھا اس میں بھی انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی اور لکھنؤ کے چوٹی کے مرثیہ گویوں میں شمار کئے گئے۔ حضرت انجم لکھنوی نے اس زمانے کے اکابر مرثیہ گویوں کا ذکر ایک رباعی میں اس طرح کیا ہے۔

اس عہد کے بس یہی ہیں پانچ شاہانِ سخن
حقا کہ انھیں کے دم سے ہے شانِ سخن

جاوید، عروج و عارف و اوج و رشید
یہ پنجتن پاک ہیں ایمانِ سخن

وہ مرثیے پڑھنے کے لئے دور دور بلائے جاتے تھے دو مرتبہ نواب کلن (؟) ملک کی دعوت پر حیدرآباد گئے۔ اصغر آباد پنڈراول جانسٹھ ضلع مظفر نگر

ہر سال بلائے جاتے تھے اور ہر جگہ سے معقول رقم ملتی تھی جب واپس آتے تھے تو خوشحال ہو جاتے تھے مرغ تیتر بٹیر دونوں وقت پکتے ڈھیوڑھی پردوں سے بھری رہتی تھی کھانے میں اکثر شاگرد بھی شریک رہتے تھے۔ جب پیسہ ختم ہو جاتا تو وہی عسرت کا عالم ہو جاتا لیکن غیور ایسے تھے کہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے نہ کسی شاگرد سے کبھی طالب ہوئے کبھی کوئی چیز گروی رکھدی یا بیچ ڈالی اسی سلسلہ میں اپنا آبائی مکان جو سرائے کسحالیخان میں تھا بیچ ڈالا اور بھوئی ٹولہ میں کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے جہاں مرتے دم تک رہے کسی حال میں ہوں فکر سخن سے غافل نہیں رہتے تھے اور مشق سخن جاری رہتی تھی۔ پیتل کا جالی دار قلمدان سامنے رہتا تھا جس میں قلم دوات رہا جس کا جا تو الائچیاں اور عطر کی شیشی ہوتی تھی۔

برجستہ گوئی۔ وہ بڑے برجستہ گو تھے شعر کہنے میں ان کو فکر کی ضرورت نہ تھی غزلوں کی غزلیں اس طرح کہہ ڈالتے تھے جیسے باتیں کرتے ہیں انھوں نے اپنی بعض غزلوں کے مقطع میں اس کا ذکر بھی کیا ہے صفدر مرزا پوری ان کے تلامذہ میں تھے انھوں نے ایک کتاب بزم خیال لکھی ہے جس میں ان شعراء کا ذکر ہے جن کو انھوں نے دیکھا ہے جاوید صاحب کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے کمال فن سادگی مزاج اور برجستہ گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"جب میں لکھنؤ میں آیا یہاں کے اکثر شعراء کاملین فن سے ملتا رہا جس وقت میں بندہ کاظم صاحب جاوید سے ملا تو جس قدر میں نے شہرت سنی تھی اس کا کوئی اثر طریقہ بسر سے نہیں پایا۔

اتفاق سے ایک دن ساتھ سبزے کی سیر ہو رہی تھی کہ ایک صاحب

سیاہ شیروانی پہنے ہوئے نمودار ہوئے آپ نے کہا — صبح سے شام تک اصلاحیں دے دے کے یہاں آیا تھا یہ بھی مرے ماتم میں سیاہ پوش ہیں انھوں نے قریب پہنچ کر فراشی سلام کیا اور شعر اصلاح کے لیے سُنایا۔ جاوید صاحب سنتے جاتے تھے اور اصلاح دیتے جاتے تھے۔

اتنے میں ایک دوسرے صاحب نازل ہوئے انھوں نے ایک شعر اور ایک مطلع اصلاح کے لیے پیش کیا مطلع تو مجھے یاد نہیں رہا شعر یہ تھا۔

؎ نہیں ہے اب کوئی جوان کو دیکھے ؛ حسین اب کیا کریں سُرمہ لگا کے

اصلاح

دمِ زینت خیال آتا ہے کس کا — حسین رو دیتے ہیں سُرمہ لگا کے

ایک دن جاوید صاحب میرے گھر سے جا رہے تھے پانی برس کے نکل گیا تھا راستے میں کیچڑ بہت تھی پاؤں کیچڑ میں پڑا اور چھینٹیں اڑیں مولانا عشقی اور عزیزی طرب ساتھ تھے آپ نے برجستہ کہا ہے

جو چھینٹ پاؤں سے اڑتی ہے سر پہ آتی ہے ؛ فلک کی طرح زمیں بھی ہمیں ستاتی ہے

۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ مطابق پندرہ نومبر ۱۹۲۱ء کو انسٹھ برس کی عمر میں دو دن سانجر کے مرض میں مبتلا رہ کے انتقال فرمایا۔ جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا شہر کے تمام روسا، علما، اور شعرا، شریک تھے غفران مآب کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔

ہندوستان کے تقریباً تمام شعراء نے وفات کی تاریخیں کہیں کسمنڈوی نے "اُدخلوها طبتم فادخلوها خالدین" سے مادہ تاریخ نکالا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔

احباب و معاصرین:۔ ان کے احباب میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے جو

۱؎ بزم خیال مطبوعہ صدیق بکڈپو امین آباد لکھنؤ ص ۱۲۵ تا ص ۱۲۷

ان کے بڑے قدر دانوں میں تھے جب لکھنؤ آتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے اور اکثر مصرع طرح بھیج کر غزلیں بھی منگواتے تھے ایک غزل کے مقطع میں جاوید صاحب نے اس کا ذکر بھی کیا ہے ؎

ایک ہی دن میں غزل بھیجدی کہکر جاوید
پاس تھا حضرت آزاد کے فرمانے کا

امیر مینائی ان کے اساتذہ کے ہمعصر تھے مگر ان سے برابر کا برتاؤ کرتے تھے اور اکثر غزلوں کی طرح بھیج کے ان سے غزلیں کہلواتے تھے اس کا ذکر بھی جاوید صاحب نے ایک غزل میں کیا ہے ؎

آپ جاوید بجا لا چکے ارشاد امیر
طرح گر خوب ہو تو فکر بھی بیکار نہ ہو

ریاض خیرآبادی ان کے معاصرین میں تھے ان سے بھی عزیزانہ تعلقات تھے ایک مقطع میں اس کا ذکر بھی ہے ؎

یہ کہہ ریاض سے جاوید ہو جو لمیں گشت
کہاں وہ جائیں جو دوست لکھنؤ آ کے رہ گئے

گلے ملا نہ مجھے حشر میں جو نالوں کا!
کمال ہو گیا چہرہ چھپانے والوں کا

کہیں بھی کام نہ رہیں گے جو لوگ جیسے ہیں
حضور غم نہ کریں آپ مرنے والوں کا

چپ رہوں گا تو ستائیگا تجھے دل میرا
کچھ کہوں گا تو مزاج آپ کا برہم ہوگا

پہلے تو اس نے قتل مجھے بے سبب کیا
اب ہاتھ مل رہا ہے کہ یہ کیا غضب کیا

کام اپنا اپنا سب کی نگاہوں نے کر لیا
اک بھیڑ کی تیغ نے یہ کیا غضب کیا

آئے ہیں لیکے غیر کو وہ پوچھنے مزاج
کیونکر کہوں کہ شکر ہے پروردگار کا

جہاں میں کوئی نہ معشوق تھا شباب آیا
زمانہ یاد ہے اس بیوفا کا خطاب آیا

نہ یاد بادہ سر بزم آئینہ دیکھو!
بتے جا رہا ہوں کسی کا نہیں شباب آیا

یہ کس نے چاہنے والوں پہ سرگرانی کی
یہاں تک آئی ہے آواز لن ترانی کی

جو چھپنا ہے تو میری طرف پھیر لو منھ
یہ کوئی کھیل نہیں موت ہے جدائی کی

انھوں نے دیکھ کے تسلی پہ کیا کیا اے ہجر — ہمارے دل کو نہ پہلے کبھی تھا اضطراب ایسا
قدم قدم پہ ترے بس مچے ہیں دل کیسے — ہوا کسی کو نہ عالم میں دے شباب ایسا
اب ایک نرم کی انھیں کیا میں گھبراؤں — ہزار بار ہوا ہوگا اضطراب ایسا

اس قدر چپ چپ نہ دیکھا تھا کبھی — دیکھ کر تصویر کو پیار آگیا
دے کوں مجھے خود ہی تسلی کے جواب — حال کہتے کہتے دم گھبرا گیا
بات کھولی عشق کی یہ کیا اے کلیم — جس کی صورت دیکھ لی غش آگیا

عاشقی کو ترے جی سے گزر نہیں آتا — سبب یہ ہے کہ محبت کو مرنا نہیں آتا

یہ نکات مجھ سے ہے کہ ہیں وہ داغ جگر میں — اک ہجر کی شب کا ہے تو اک وصل کی شب کا
اب یہ حسرت کہ دل ان کا بھی تو اٹھائیں — دل کو مرنے سے پہلے مرنا تھا
گئے اپنے لگایا انھیں آنکھ جوانی نے — مزاج اب آج سے کچھ اور ہے اس

ہے جن کو درد غیر کے غم میں شریک ہیں — تڑپی جو موج ٹوٹ گیا دل حباب کا

دل سے رخصت ہو گیا خوف و خیال ناز بھی — مسکرا کر حال دل کا پوچھ اور کہہ دیا
یاد تھا پوری طرح افسانۂ ہجر و وصال — کچھ گھبرا کر کہہ دیا اور کچھ شرما کر کہہ دیا

کوئی کہدے کہ جو آئے ہیں تو دم بھر بیٹھیں — ایسی کچھ دیر نہیں ہے مجھے مر جانے میں
نشہ آنکھوں میں بل ابرو پہ ہے اور نہ ہنسی — ہے سلیقہ انھیں تصویر کے کھنچوانے میں

کسی دامن کی بھی جنبش کو یاد کرتے ہیں — ہم اپنے اشک کی امید پر بھی جیتے ہیں
بہت رلا دیے ہیں قسمت کو تم کو دیکھتے ہیں — جگر کے زخم پھوٹ جاتے ہیں جب فریاد کرتے ہیں

یادید اتحاد عناصر ہے یادگار — یہ اک سرا ہیں جہاں صبا فرکیاں کرے ہیں
یہ آرزو ہے کہ اٹھ جائے طاقت پرواز — پھڑک رہا ہوں کہو بانٹے کبوتر

مسکرانا بھی اور انکا سا — کھلتی کلیوں کو آگیا کیونکر
عشق سے نہ پشیمان ہوں کلیم اب مر کر — ہوتا ہے یہی عاشق دلگیر کا انداز

داستاں وصل کی چھیڑوں کہ شب فرقت کی
لطف دو رنگ کے اور ایک ہے افسانہ عشق

آج کے دن کی خبر دل کی دھڑک نے دی تھی
بچپنے میں کبھی سنتے تھے جو افسانہ عشق

ابھی یہ حشر ہے لاکھوں ہی ہیں مر مٹنے کو
یہاں یہ ہم بھی ہیں نہیں رہی نقاب ڈال کے جا

تمھیں ہے نشہ جوانی کا ہم کو غفلت عشق
نہ اختیار میں تم ہو نہ اختیار میں ہم

ہے مذاق عاشقی میں موت اک امر محال
تم پہ جو مرتے ہیں ان کے دم نکل سکتے نہیں

وصل کے اقرار کے حشر میں نادم ہیں وہ
اب یہ دیکھے آج کے وعدے پہ کل سکتے نہیں

ان کی حسرت ہے کہ اے کاش اجل بھی آجا
ان پہ جو مرتے ہیں جینا انھیں منظور نہیں

وہ کیا خوب کہ لاش بھی آکر وہ لے گئے
جانتا ہوں کہ حسینوں کا یہ دستور نہیں

ان کے کوچہ میں کوئی دفن نہیں ہو سکتا
اب کہوں خاک کہ جینا مجھے منظور نہیں

پاس آتے ہیں وہ ہمراہ رقیب اپنے جا دو
اب اگر آج اجل آئے تو کچھ دور نہیں

دیکھ ہی لیتے ہیں ان کے دیکھنے والے کہیں
ان سے تو خود بھی سر محفل چھپا جاتا ہے اثر

سنبھالا ہے خودی کو تو سمجھے وہ سنبھالے ہیں
نکالے ہیں کبھی ہم نے تو یوں اور ان نے نکالے ہیں

ثابت ہے نہ کچھ ہوگا نگہ ان کی ہے نیچی
اب کھینچے ہے تصویر وہ شرمائے ہوئے ہیں

اب چاہنے والوں کے کلیجوں کا خدا ہے
آئی ہے جوانی تو وہ اترائے ہوئے ہیں

عشاق کی ضد سے وہ نگہ اٹھتے ہیں نیچی
بیدرد یہ سمجھے ہیں کہ شرمائے ہوئے ہیں

جی چاہے تو خود دیکھ لو آنکھوں سے جنازہ
ہم در پہ اسی طرح سے آج آئے ہوئے ہیں

دامن کی وہ ہوا جو دیتے ہیں بار بار
مطلب ہے اپنے ہم کو بھی غش آئے جاتے ہیں

رات کو دریا میں موجیں کس طرح بے چین تھیں
اک کنارے چاند ہے اور اک کنارے آپ ہیں

سوتا الجو قتل ان کی نزاکت دیکھ کر
کھینچی نہیں ہے ہاتھ سے تلوار کیا کریں

دیکھیں تو جان جائے نہ دیکھیں تو جان جائے
آخر کسی کے طالب دیدار کیا کریں

شکوے جو کچھ کئے ہیں چھوٹا یہ کہہ ہی چکا ہے
یا ہیں بنا رہے ہیں کچھ دل سے جوڑتے ہیں

شمع نے رو کے یہ پروانے کی میت پر کہا : آنسو اب کوئی جلنے کے سوا ارماں نہیں

بجھ کے خون گرم پھر کسی گوشہ میں رہ گیا
روشن ترا داغ ہے دل اپنا جہاں میں

دل کو چھپا ہوا ہے تو جلتا ہے رات بھر
دل میں جو سوز ہے وہ نہیں سر پہ نہیں

اب کیا یہ چاہتے ہو کہ عشق سے کوئی اٹھا
ہوس یہ کیا سمائی ہوئی ہے جلانے میں

درماں پھر ہوا ہے کوئی ارمان دل
پھر اک چمک اٹھی ہے پھوڑے کے دکھنے میں

شام کو آئے تو اُن اُن کی مسافتی اب
صبح کو نکلے تو دل تھام کے گھر سے نکلے

کسی پہ آئے کہیں ہو غضب کی شمع شباب
وہ پھول جو کہ کھلے تھے چمن کی جگہ لے

یہ بچپنے کی ہنسی گر نہیں تو اور ہے کیا
کہو تو چھوٹ یہ کہہ دوں کہ تم جوان

درازی شب فرقت کا ذکر کیوں پوچھو
کبھی سدا نہ پڑی کہ تم جوان کے

یہ کیا سبب ہے کہ تصویر کے بھی چہرے پر
ہنسی کچھ آ گئی جو وقت وہ جواں ہوئے

ہر ایک نفس نے گریہ میں محو ذات کیا
اب اور یاد نہیں کس قدر ملال ہوئے

ہیں تو سرمہ دنبالہ دار ہے وار
یہ وہ چھری چلتی ہے دیکھ کر حلال ہوئے

جس کی باتوں سے ستاتے ہو بس جا بیٹھو
ہوش تم کو ایسے کو آئے گر تو دیوانہ رہے

موت اور غش میں کوئی فرق کیسا ہوتا ہے
دیکھ کر وہ دل کی صورت کر یہ پہچان گے

گماں غلط ہے کہ یہ وعدہ وہ ہوا ان سے
مہکے جس کے بکھرے ہوئے غنچے بوسے

ان کو تو سہل ہے وہ میرے گھر جائیں گے
ہم جو اس کوچہ سے نہیں جا گے تو کدھر جانا ہے

کیا کہیں کیا نہ ہیں ہجر کی ایذاؤں کو
اب اگر موت نہ آئی تو مر جانا ہے

روز ہم ہجر میں مرتے ہیں غضب ہے تو بھی
اب یقیں ان کو نہ آئے گا جو اب اس ہے

اک نقطہ حسرت و جاوید ہم مرتے ہیں
گر وہ کبھی نہ ملے تم تو ادھر جا کے چھوڑے

بکھرا کے زلف کو نہ جھٹکا تو لے پر آئیے
اس رستے کی میں لاش نہ اٹھنے کی پڑے

بجلی گر گئی آج کسی بد نصیب پر
ہم نے کلیجہ تھام لیا کر جا ہے

زمانہ اپنی آزادی کا شاید یاد کرتا ہے — گرفتارِ قفس کس درد سے فریاد کرتا ہے
کلیجہ کھلتی کلیوں کا بھی شق ہوتا ہے گلشن میں — یہ کون اس درد سے اے باغباں فریاد کرتا ہے

اب تو ڈرتے ہیں عیادت کو بھی وہ آئے ہوئے — جب سے دیکھا ہے کسی کا دم نکل جاتے ہوئے
ہے گماں مر گئے اچھے ہیں جو گھر آتے ہوئے — آنکھ سے دیکھا نہ تھا کیا غش کبھی آتے ہوئے
کس نے بے سمجھے ہوئے تعریف کر دی چاند کی — لیجئے آئے نقاب رخ وہ سرکائے ہوئے
ان کی ایسی ہو جوانی تو نہیں رہتے ہیں ہوش — خود نقاب رخ کو دیکھا ہے سرک جاتے ہوئے

جاں کنی کا وقت ہے کروٹ بدل لیجئے — آپ کی حسرت نہیں دم ہے نکلنے دیجئے
مہربانی آپ کی پہلو لئے ہے ظلم کا — درد دل کا حال کہتا ہوں سنبھلنے دیجئے

تھی حشر میں بھی چال قیامت حضور کی — سچ پوچھئے تو چھپ گئی آنکھ حور کی

ہے مصلحت وقت جو غصہ نہیں آتا — ہنستے ہیں کہ کہیں میرے لہو کا اثر جائے
ہاں گور غریباں میں وہی میری لحد ہے — بے قصد جہاں پر وہ ستمگار ٹھہر جائے

ہاں آرزو کسی نے نکالی شباب کی — یاں آگئی قضا دل خانہ خراب کی
ساقی کے رخ سے گھٹ گئی رنگت گلاب کی — چہرے پہ کھنچ کے آگئی سرخی شراب کی
بجلی تڑپ تڑپ گئی گردوں پہ بار بار — تصویر کھنچ سکی نہ تمہارے شباب کی
کیا مل گیا طلسم تصور کو توڑ کے — تصویر کھنچ رہی تھی تمہارے شباب کی

داغ دیتی ہے جوانی آپ کی — یاس ہے سب کے نشانی آپ کی
بچ گیا تھا آپ کا ہر دل عزیز — دیکھنے آئی جوانی آپ کی!
مٹنے والا جب کوئی ملتا نہیں — دل سے کہتے ہیں کہانی آپ کی
ساتھ ہی اس کے ہوئے ہم بھی تمام — کیا اثر بھی کہانی آپ کی
دید کی امید بھی جاتی رہی — جب سے سن لی لن ترانی آپ کی

ریاض خیرآبادی

تعارف:- ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا ریاست [illegible] سے وظیفہ ملتا تھا لکھنؤ کی ادبی چہل پہل میں شریک تھے اسیر اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔

کچھ شوخی رفتار میں بھی کم ہے قیامت
کچھ قد بھی نکلتا ہے بت شوخ ادا کا

لاکھ پردوں میں کوئی ڈالے نگہ شوق تو ہے
دیکھ لیگا جو کوئی دیکھنے والا ہوگا

ذرا جو ہم نے انھیں آج مہرباں دیکھا
نہ ہم سے پوچھیے کیا رنگ آسماں دیکھا

بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم
لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

وہ دل مرا ہو کہ دل کی ہو آہ کوئی ہو
کبھی کسی آگ کا اٹھتے ہوئے دھواں دیکھا

ہنگام نزع گریہ بیاں بیکسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

جب حال دل کہا تو یہ سننا پڑا ہمیں
تم تو سنا رہے ہو فسانہ سنا ہوا

جھگڑے وہ گلرخوں کے الٰہی کہاں گئے
کیا ہو گیا گلاب کا تختہ کھلا ہوا

[illegible] کیوں یاد خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکر مے و مینا نہیں ہوتا

کوئی مست میکدہ آگیا ہے کہ بیخودی وہ پلا گیا
نہ صدائے نغمہ دیر سے کبھی اٹھی نہ حرم سے شور اذاں اٹھا

رہ گیا پردہ ترے چاک گریبانوں کا
حشر میں کوئی بھی پرساں نہیں دیوانوں کا

آنکھ سے دیکھ لیا خون ٹپکتا سو بار!
دیکھیے پھر بھی ٹپکتا ہے نظر سے کیا کیا

آپ آئے تو خیالِ دل ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

کچھ بھی ہو ریاض آنکھ میں آتے نہیں آنسو
مجھ کو تو کسی بات کا اب غم نہیں

اک ذوقِ نالہ ضبط سے وہ بھی مٹا ہوا
میں کیا بتاؤں کیا دلِ اندوہگیں میں تھا

مزا دیتی ہیں گھڑیاں انتظار یار کی کیا کیا
کبھی سر درد ہو جانا کبھی رنجور ہو جانا

اب خدا جانے بہار آتی ہے آئیں کہ نہیں
میرے دم سے کبھی آباد تھا گلشن اپنا

باغباں کام ہمیں کیا ہے وہ اجڑے کہ رہے
جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

آفتاب حشر کیا چمکا ریاض ! — داغ مے دامن سے جب میں دھو چکا

بہار آئی تھی گلشن میں وہ دن بھی یاد ہیں ہم کو — کسی کے ہاتھ میں مینا، فرشتہ کوئی گل بداماں تھا

قریب بحر ہے جنگل نہ بستیوں نزدیک — یہ کون تھا مجھے صحرا میں جو پکار گیا

بتوں کو دیکھ کے اللہ یاد آتا ہے — وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ کعبہ گیا

اڑانے پھول حسیں آئے ہیں بہار میں کیا — لگی ہے آگ سی یہ آج لالہ زار میں کیا

مرے ہاتھ سے پہننا انھیں اور بار ہوتا — گراں ہو کے بھی کھلتی جو گلے میں ہار ہوتا

ناز ہی کرتا تھا، دم عشق کا بھرتا تھا — رنگ سے مرتا تھا، ہر رنگ سے بہتر دیکھا

ایک جلوے نہیں کوثر و تسنیم ریاض — خاک اڑتی جو لب خشک مرا تر ہوتا

عالم ہجر میں کچھ آواز سی آ جاتی ہے — چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

ہم تعلق کے کرے گر کے بھی اٹھ بیٹھے ہیں — تجھ پر اثر لے دوری منزل نہیں ہوتا

کوئی جا کر ریاض کو سمجھائے — کچھ خفا ہیں وہ اپنی جان سے آج

رٹنے کا ریاض اپنے ذرا نام رکھ لیا — چھپتا ابھی مر مر کے تجھے ہے مری جان اور

ملایا خاک ہو کر حسرتوں کو اپنی مٹی میں — چھپایا کارواں کو ہم نے گرد کارواں ہو کر

ہم بیٹھے جو جلسے کے شب میں مے کوثر نے پی — ہم حرم میں آئے ہیں میخانے ویراں کر کر

بڑھی اس دل کی بینائی یہاں تک — ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

کہیں چھپتا ہے عتاب کا رنگ — کہ بدلنے لگا نقاب کا رنگ

رنگ کا اس کے پوچھنا کیا ہے — جس کا سایہ بھی ہے گلاب کا رنگ

پایا جو تجھے تو کھو گئے ہم — بیدار ہوئے تو سو گئے ہم

اب دشت نورد عشق ہو جو ہو — اس راہ میں کانٹے بو گئے ہم

اس بزم میں وہ بت بھی ساتھ ہو گا — یہ سچ ہے ریاض تو گئے ہم

نشہ سا ہے شراب گل ہر چند پی نہیں — یہ رنگ ہے شباب کا توبہ ابھی نہیں

کوئی ناخوش ریاض سے کیوں ہو — اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں
بہت شکر خدا نا نہیں تو جھوٹے ہی عاشق رہی — کام کے جب تھے وہ ہم تم نہیں تو کچھ نہیں
کرن سورج کی نکلی جام سے ہے — یہ چمکا دختِ توبہ سینہ چاک رہتے
وہی ہم ہیں نہ چھوڑا یار تم سے ہم نے گر گیا — وہی ہم ہیں کہاب مرتے لے اور یہ
ہنستیں جالیے مرے تیا کے فلک پر ہیں کرنے — کچھ تو تم کچھ اور گئے سیارے ہیں
رنگِ دل کا داغ عجب چاندنی ہے — اس چمن کا پھول ہو چھپاتا نہیں
جدھر پھرتے رہتے ہیں نقشِ قدم — تو کہیں آتا نہیں جاتا نہیں
سیر کو جلوہ گاہ طور کہاں — دیکھ ہے پاس جائیں دور کہاں
نشہ اٹھانے میں ساتھ دے ہمدم — گم ہوئی ہے صدائے صور کہاں
کوئی کبھی دل کے بحبوں کی پیاس نہیں بنتا — چمن کے تشنہ ہم اپنی گالے جلاتے ہیں
داورِ حشر سے کیا شکوہ ہمارا تم ہی — ہاں نہیں اہی تو کچھ آپ سے فریاد کریں
مدت ہوئی رسائی قسمت کو رو چکے — وہ سنگِ در کہاں یہ ہماری جبیں کہاں
ساغر ہے آنکھ پڑ رہی ہے بزمِ غیر میں — کھل کھیلنے کو ہے نگہِ شرمگیں کہاں
ٹوٹی ہے آ کے توبہ پیمانہ میں آج اس — اب دیکھیں ٹوٹتے ہیں دمِ واپسیں کہاں
رام ہے دست یار ہیں یاد ہے ظالم کیا — پھول آ گرے بہار میں کھل نے دیے ہیں
کس قدر گورِ غریباں کے ہرا کر دیں گے — جس قدر سبز گرہ اور نجھے جاتے ہیں
فرخانہ سبزہ کو ہو ہی جاتی ہے لغزش — مستی ترے بہار ہما دیکھ سب ہیں
دیکھا نہیں ہم نے ابھی دنیا کا بدلنا — بدلی ہوئی دنیا ہی ہوا دیکھ رہے ہیں
نشہ رطوبت جو موج ہے پیمانے میں — بجلیاں کوندتی ہیں آج ابر اچھلتا ہیں
الگ ہے خدا سے کچھ ساخت ان کی — یہ بت اور سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں
دل تو ہے کیونکہ کہیں ہو میرا سینے میں نہیں — ہے وہی محفل مگر اب گرمِ محفل نہیں

نوبت رائے نظر

تعارف:۔ لکھنؤ کے کائستھ علم و فضل میں فخر لکھنؤ میں ان میں ایسے ایسے ادیب و شاعر پیدا ہوئے جن کا مثل مشکل سے ملے گا ان میں ایک منشی نوبت رائے نظر بھی تھے یہ کائستھوں کے پرانے خاندان سے تھے ان کے آباؤ اجداد سلاطین اودھ کے یہاں معزز عہدوں پر فائز تھے۔

منشی نوبت رائے نظر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اردو فارسی اور انگریزی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے شاعری کا ابتدا سے شوق تھا آغا صاحب لکھنوی کے شاگرد تھے شاعروں میں لکھنؤ کے اساتذہ سے ٹکر لیتے تھے بڑے بڑے شعرا۔ ان کے کمال کے معترف تھے ایک رسالہ خدنگ نظر بھی نکالتے تھے ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔

گردش دہر بھی ایک گردش پیمانہ ہے ذرہ ذرہ میں ترا جلوۂ مستانہ ہے
اک طبیعت کی اداسی کا اثر اتنا ہے ساری دنیا نگہ یاس میں ویرانہ ہے
حالت محفل عشرت ہے قریب اسمیں ایک دفتر کے برابر پر پروانہ ہے
پرتو مہر کجا ذرۂ ناچیز کجا کیوں یہ دل حسرتی جلوۂ جانانہ ہے
تیرے ملنے کی وہ تقریب جو ہے یاد اب تک جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہے کہ افسانہ ہے

نظر اب چل کے کرنا چاہئے آباد مرقد کو بہت ہے منتظر اپنی زمیں گور غریباں کی
موت سے کیا ساز کر رکھا ہی اس نے اے نظر مدعی گو دیں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

یاس و ناکامی سے یہ جوش قلب مضطر جو تھا اب نہ ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا
وہ نگاہ شرمگیں ہو یا کسی کا انکسار جھک کے جو مجھ سے ملا وہ ایک خنجر ہو گیا
اس سے بڑھ کر اور کیا ہے سادگی حسن کی آپ نے وعدہ کیا اور مجھ کو باور ہو گیا
خاک رہی کی جو مٹا دی تھی تو آخر اے نظر خاک میں ملنے کے قابل تم بالآخر ہو گیا

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی — اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی
حسرتیں دل میں گھٹ رہی ہیں ہنوز — راہ نکلی نہ کچھ نکلنے کی
دلِ سوزاں کو شمع کیا کہیے — اُس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی
ہم ہیں مجبور زندگی معذور — دم میں طاقت نہیں نکلنے کی
میں کہاں اور خیالِ دوست کہاں — ایک صورت ہے جی بہلنے کی
جل گئے ہم بھی صورتِ خرمن — انتہا یہ تھی ہاتھ ملنے کی

راحت کی جگہ کشمکشِ امکاں نہیں دیکھا — کس گل کو یہاں خندہ بداماں نہیں دیکھا
بیساختگیٔ جوشِ جنوں دادطلب ہے — چلنے نکلے ہیں گو ہم نے بیاباں نہیں دیکھا
جس بحر میں ڈوبی دلِ مایوس کی کشتی — اُس میں کبھی اٹھتے ہوئے طوفاں نہیں دیکھا
بے چارگیٔ عشق یہ بھی دل کو ہوا ناز — ڈھونڈھا ہے جسے درد کا درماں نہیں دیکھا
اس ہستیٔ موہوم کی تعبیر عدم ہے — دنیا میں بجز خوابِ پریشاں نہیں دیکھا
جس رخ سے نقاب اُس نے سرِ بزم اُلٹ دی — پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا
جتنی ہیں گھر سے ترے وحشی پہ بلائیں — کھلتے ہوئے پر قفلِ درِ زنداں نہیں دیکھا
ہر سال نظر فصلِ جنوں آتی ہے لیکن — مدت سے تجھے چاکِ گریباں نہیں دیکھا

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے — وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی — زندہ ہوں اب کدھر ہوں مجھ کو خبر نہیں ہے
آنکھیں بجھی ہیں بہت کچھ دم توڑتا ہے جی بھی — اس آہ میں ابھی کچھ بل ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہے دنیا ہی سب نظر میں — پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے
دنیا سے جا رہے ہو کیا لے کے اے اختر تم — زادِ سفر نہیں ہے رختِ سفر نہیں ہے

ہر قدم پر اک نیا نالہ ہر نفس پر ایک داد — زندگی کیا ایک شرحِ حسرتِ جاں ذوق ہے
ہے کمر دنیا اسیرِ سیاں ہستی ہے نظر — لیکن اپنے جام میں آنسو ہی پانی بھر

زندگی کی کشمکش سے تھک کے باقی کچھ تھا — اس سے پہلے اے نظر دست کبھی ایسی تھی

بے مہ موں دوستاں سے کیا پرسش از دوست — یہ محبت اک خداوت تھی زرے یہ سے

اب بھی آزماتا ہے مجھ کو زندگی میں ہنس — تیز جاتا ہوں میں اپنی عمر کی لنڈگی سے

کچھ ہوا ایسا نہیں واعظ کے ترک ذکر سے — زہر مل جاتا ہے لیکن تشنگی گھٹا ہے

کر رہے صحرا نوردی آ گئے بھی کھو بیا — وہ جو اک لطف علش جاتا تھا ایک بار

دل میں کتنا خون تو نے بھر رکھا تھا اے ابر — کم نہیں ہوتی روانی ہر روز ہوتا ہے

اب نہیں معلوم کیا دھیان میں رنگ بہار — اک زمانہ ہو گیا چھوٹے ہوئے صحرا سے

باغ عالم میں رہے بے وشت ہم سب نظر — سیر گلشن کی اگر دامن جا کھا ساتھ

جلیل حسن جلیل

تعارف۔ ۱۸۶۶ء میں مانکپور اودھ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی ادبیاتی فضا میں ان کا ذوق شعری پروان چڑھا امیر مینائی کے شاگرد تھے ان کے بعد نظام حیدرآباد کے استاد ہوئے ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔

فغاں میں درد دعا میں اثر نہیں آتا ۔۔۔ جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا
شراب عشق کی مستی عجیب مستی ہے ۔۔۔ گیا جو ہوش تو پھر عمر بھر نہیں آتا

رنگ گلاب کی کلی کا ! ۔۔۔ نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی ۔۔۔ یاد آگیا روٹھنا کسی کا
دیکھو نہ جلیل کو مٹاؤ ۔۔۔ مٹ جائے گا نام عاشقی کا

کوئی حسیں ہو یہیں اک نگاہ کر لینا ۔۔۔ جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا
نیاز مند ہوں کافی ہے اتنا کرنے کو ۔۔۔ سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا
کوئی سنے نہ سنے تم کو درد دل کہنا ۔۔۔ اثر کرے نہ کرے تجھ کو آہ کر لینا

موسم گل میں عجب رنگ ہے مےخانے کا ۔۔۔ شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا
خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے ! ۔۔۔ شمع کا رنگ ہے اور خون ہو پروانے کا
میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی ! ۔۔۔ کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

جب سے عشق کا پھندا مری گردن میں رہا ۔۔۔ پھر برابر ہے قفس ہو کہ نشیمن میں رہا
لوگ آرام کی خاطر رہے دنیا میں خراب ۔۔۔ اور آرام چھپا گوشۂ مدفن میں رہا
چاک دامانیٔ یوسف تو کوئی بات نہ تھی ۔۔۔ ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا

قیس و فرہاد کا بھرتے رہے بہروپ جلیل
یہی سودا تھا، یہی کھیل لڑکپن میں رہا!

دامن ہے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار
اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا
آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیلؔ
اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

***

یار تک پہنچا دیا بے تابیٔ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ ممکن ہے یہ
میں جلوں اور کلیجہ رہے ٹھنڈا تیرا

روئے رنگیں پہ پسینے کا عجب عالم ہے
آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا

***

وہ شوق بھرا دل تھا حسرت سے تڑپ اٹھا
ثابت نہ ہوا مجھ پہ ناوک کا خطا کرنا
جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گذارش ہے
جب یاد ہم آ جائیں ملنے کی دعا کرنا

***

گلہ نہ مانو اگر ذکر حور ہم نے کیا
غرور ہم نے کیا تھا قصور ہم نے کیا
اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور سمجھو
تمہارے حسن کا چرچا ضرور ہم نے کیا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

***

منتظر موسم گل کے ہیں یہ سب دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

***

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

***

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں
واعظ چھیڑ دے نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پیے بیٹھے ہیں
دست وحشت کو خبر کر دے کوئی
ہم گریباں لیے بیٹھے ہیں

***

آج سنتے ہیں وہ اپنا عدو کہنے کو ہیں
کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ
یہ سمجھ کیا ہم آئے ہیں خدا کہنے کو ہیں
ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیلؔ
جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

***

رو دیے آنکھ چرا کے جانے والے
ہم بھی کھٹکے کبھی تری نظر میں

***

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں
وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں
نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

لے گئے پاکے میں چلتا ہوا میخانے کو
ایک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو

کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی
رکھ لوں میں دل میں اٹھا کر ترے پیمانے کو

دم زینت انھیں کیا جانئے کیا یاد آیا
آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو

بے سبق یاد ہو عالم کی فراموشی کا
ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے پلاتے ہوئے ساغر
رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو

وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو
اب کیا جواب دیں نگہِ نظارہ کو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

آتے آتے ان کو آئے گا خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

بے سبب اپنی جگر کاوی نہیں
عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی

فصل گل آئی جیوں اچھلا جلیل
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے
دشت مجنوں میں بہار آئی ہے

باغ ہستی سے بہت دور تھے ہم
بو کسی گل کی لگا لائی ہے

داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو
وہ چراغِ شب تنہائی ہے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے !
دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے

یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا ہے !
ہوئے دامن تو جدا دیدۂ تر سے پہلے

شام غربت کا فسانہ نہ ابھی چھیڑ دے دل
پوچھ لوں حالِ وطن بادِ سحر سے پہلے

کہہ گیا آج وہ بیدرد گلے مل کے جلیل
ہم نہ واقف تھے ترے درد جگر سے پہلے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

اچھا ہے وہ جو مجھ کو پھراتے ہیں دربدر
آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے

سیر چمن کو آپ گئے تھے یہ گل کھلا
پھولوں میں آگ لگ گئی برق نگاہ سے

لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دور

علی نقی صفیؔ

تعارف:- علی نقی نام صفیؔ تخلص ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں تقریباً ۸۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا ان کی شاعری کی عمر ۷۰ سال ہے حقیقت میں یہ دور سوم کے شاعر ہیں مگر ایک مدت تک بحیثیت شاعر کے نمودار نہیں ہوئے دور چہارم کے شعراء کے ساتھ نمایاں ہوئے اس لئے ہم نے ان کو دور چہارم میں رکھا ہے۔

تو بھی سازِ سخن مرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد بھرا تیری آواز میں ہے

بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج ہم
کل یہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل گر گیا

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بادل گرجا بجلی چمکی رو دی شبنم پھول ہنسے
مرغِ سحر کی ہجر کی شب کے افسانے مشہور ہوئے

جام ہلکے ساتھ گردش میں مقدر آ گیا
آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آ گیا

گل کی آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کارواں عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے

وہ اور کچھ نہ سہی لطف انتظار تو ہے
کہ عمر کو ترے وعدے کا اعتبار تو ہے

وہاں بارہا ایسی لگی ہو جیسے تم کو سکتہ ہے
یہاں ایک رات نہ گزری کہ بیمار دم نکلتا ہے

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے غم جھیلا ہو تو نکلا دم نکلتا ہے

چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہ خدارا چھیڑو
آنسو آتے ہیں ہنسی بھی ہے ابھی تصویر کسی

پر تولتے ہی صفت گنہگار ہو گئے
اٹھنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے

راہ عمل میں نفس سے لفافہ ساتھ ہے
رشتہ ہے اک ذرا رگ دیوانہ ساتھ ہے

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح　　بیٹھے رہیں وہ زلف پریشاں کیے ہوئے

پھیری کسی نے یوں پلٹ لیا شب غم کہ شام سے آ ہی سحر ہو گئی ہے

مگر نہ آنا تھا وہ نہ آئے ادھر کی دنیا ادھر ہو گئی ہے

گلشن میں بہار آئے خزاں آئے ہو بھی گیا　　ہے ایک کلی دل کی وہ مرجھا گئی ہوئی ہے

سخن واعظ شگفتہ بیاں کیا سنئے　　دل پریشاں بھی نہ ہوتا ذرہ پریشانی ہے

اف ری ناسازی دل گو کہ زمانہ تند را　　ضعف ابر کے ہی دبی ہوئی آواز ہے

بے خطا کم ہوئے ہدف ناوک ظلم　　ایک دعشہ ما کماں قدر انداز میں ہے

ہے کعبہ سرائے ہستی مسافران عدم کی بھی　　ہزار چاہیں کہ جم کے بیٹھیں ملا ہے آکام ہی ہے

جو وہ حسن عالم آرا کہیں بے نقاب ہوتا　　تو زمیں کا ذرہ ذرہ بھر اک آفتاب ہوتا

رہی نشۂ جوانی ہے بلائے زندگانی　　جو شباب ہی نہ ہوتا کوئی کیوں خراب ہوتا

[illegible]　　دلکش انداز کسی شوخ کی انگڑائی کا

دل جو ٹوٹا تو اک آنسو سر مژگاں نکلا　　صبح محشر کا ستارہ شب ہجراں نکلا

کل خدا جانے کہ بیمار کی حالت کیا تھی　　شب کو اس گھر سے جو نکلا وہ پریشاں نکلا

جب صبح شب وصل ہوا شام کا وعدہ　　پھر ہوش مجھے صبح سے تا شام نہ آیا

دل چھوٹ گیا ہم سے حسرت منزل میں گیا　　تنہا غریب وادی مشکل میں وہ گیا

سوئے رقیب کس نے کیا قصد نا تمام　　در وا کھلے اٹھے آج مرے دل میں رہ گیا

نقطہ دل میں نہ تھی گنجائش نقش جمال　　مشکل سے ذرے میں لیکن آفتاب آ ہی گیا

سنبھلے تو تھے کہ آ گیا موسم بہار کا　　اب کیا بھرے گا زخم دل بیقرار کا

خوشگوار رنگ نہایت نظر فریب　　پھل تلخ ہے مگر چمن روزگار کا

ہوش و خرد کشمکش لذت و الم　　یہ فلسفہ ہے زندگی مستعار کا

کمبخت بڑھ گئے روز قیامت سے ملتی　　دیکھا فریب تم نے شب انتظار کا

زندہ بچا کہ راہِ طلب میں فنا ہوا
اک دل تھا وہ غریب خدا جانے کیا ہوا
بے پردہ حسنِ ذات کا ہونا محال تھا
آئینۂ صفات میں صورت نما ہوا
دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں تیارئ آفات
جو آج ہو رہا ہے وہی بار ہا ہوا
زندانئ حیات کو یہ بھی خبر نہیں
بیچارہ کب اسیر ہوا کب رہا ہوا

دل سے دل تک نزع میں کچھ نامہ و پیغام تھا
آمد و رفتِ نفس کا ورنہ پھر کیا کام تھا
کچھ نہ تھا خوابِ پریشاں تھا خیالِ خام تھا
زندگی سمجھے تھے جس کو موت کا پیغام تھا

اہلِ دنیا یہ سمجھے دوزخ میں جاتے ہیں
درِ فردوس کو سمجھے ہے ترا گھر سمجھا
قامتِ یار ہو یا فتنۂ محشر ہو صفی
اپنی دانست میں دونوں کو برابر سمجھا

سنتا ہوں ذکر تیغِ نگہ کے مزار کا
کیونکر نبھے گا ساتھ دلِ بے قرار کا
مرے چھپے سے کب سوز دل نہاں ہوگا
جہاں جلے گی کوئی شے وہیں دھواں ہوگا

پیر بنا دو کہ وہ اٹھیں تو منائیں کیونکر
جن کی عادت ہے خوشامد سے خفا ہو جانا

اچھا ہوا کہ حشر کا ہنگام ہو گیا
دھڑکوں سے روز روز کے آرام ہو گیا
دل اور دل شباب ہی میں مر کے رہ گیا
بے نور یہ چراغ سرِ شام ہو گیا
دل ٹوٹنے میں تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی
لیکن تمام عمر کو آرام ہو گیا

گرانباری عصیاں کی مرا سر اٹھنے نہیں دیتا
زمیں کہتی ہے مجھ سے اب یہ لنگر اٹھ نہیں سکتا
دلِ بیمار کچھ تیری نازک مزاجی کی
بتوں کا ناز بھی اللہ اکبر اٹھ نہیں سکتا

کیا غنچے نے کس طرح قبائے گل
حیرت انگیز ہے داستاں کا گریباں کرنا
دل کو لائے تھے صفی کہ جلوہ گاہِ ناز میں
پھر نہیں معلوم اسے لا کر وہاں کیا کر دیا

رفتہ رفتہ روح شاید کھنچ رہی ہے سوئے دوست
دے رہا ہے میرے ماتھے کا پسینہ بوئے دوست

جگہ پیدا دلوں میں کی بتوں نے بے وفا ہو کر
خدا کو بھی کہاں ہوئی یہ بات حاصل کب خدا ہو کر
بہ چشمِ فتنہ گر کے تھی نظر دل سے اشارہ ہو
رہے کیونکر نگاہِ شوق پابند حیا ہو کر

ہنس پڑے قاتل الٰہی شکوہ بیداد پر
فیصلہ محشر میں ہو جائے اسی روداد پر
وہ جفائیں سادگی میں تھا جنھیں بھولا ہوا
آ گئیں سب یاد ظالم کو مری فریاد پر

دم آخر کسی کا ہچکیاں لینا یہ کہتا ہے
کچھ آہیں دل میں شاید رہ گئیں تھیں نارسا ہو کر
سوار کشتی طوفاں زدہ کے قلب سے پوچھو
خدا ہی یاد آتا ہے بلا میں مبتلا ہو کر

قفس میں گو دل بیتاب کو بہت روکا
مگر زباں سے نکل ہی گیا کہ ہائے بہار

صلائیں دیتی ہیں غافل بلبلیں دو باغ کو
چلو زنجیر سے زنداں کی تا آئیں بیاباں کو

آہ وہ رات جو بسر نہ ہوئی
ہم تڑپتے رہے سحر نہ ہوئی
کیوں شب انتظار کیا ہوگا
اتفاقاً اگر سحر نہ ہوئی

زندگی مجھ شکستہ کی اسی دام کی
یوں تو میری جبیں ہے لیکن ہے کس کام کی
محشر میں جا کے آخر کیا داد خواہ کر لے
کہتا ہے آسی کیا آخر جس کو گواہ کر لے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

جو پیدا ہی نہ میں ہوتا وہ جاں ہوتا تو کیا ہوتا
ہوا اچھا خلق اگر دل شادماں ہوتا تو کیا ہوتا
نہیں جب طاقت پرواز ہی دل خستہ بلبل ہی
قفس پھر کیا بُرا ہے آشیاں ہوتا تو کیا ہوتا
میں کچھ کہتا نہیں اس پر تو ناصح کا یہ عالم ہے
خدا جانے جو میرا رازداں ہوتا تو کیا ہوتا
وہی مجھ کو ملاتے خاک میں آخر جو ملنا تھا
ہوا اچھا بے نشاں ہوں بے نشاں ہوتا تو کیا ہوتا
جب اس نامہرباں پہ ضعفی یوں جاں جاتی ہے
خدا جانے جو وہ بت مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا

جا کے جیتے تو وہ مزار پہ چراغاں کرنا
ایک تو کیا ہوئی تربت بھی احساں کرنا
دیکھ لوں دور سے تصویر شباب رفتہ
رُخ ادھر بھی کبھی اے عمر گریزاں کرنا

جیتے جی ہم نے لگا لی کب پہ اک مہر سکوت
خود چراغ زندگی خاموش گویا کر دیا
یوں کیا انساں کو زندان خلا میں اسیر
ہر طرف سامان دلچسپی مہیا کر دیا

مرزا محمد ہادی عزیزؔ

سنہ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۳۵ء کو انتقال کیا قصیدہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے اپنے فن پر نازاں تھے۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

صاد سرخی سے کیا کس نے سر فرد جمال
اپنے عالم میں تم اے دیدۂ مخمور نہیں

انھیں جب قدر ہوگی اپنے حسن روز افزوں کی
اگر وہ سلسلہ سی میری ہر تصویر دیکھیں گے

لذت درد رہی بعد فنا بھی دل میں
حصۂ عمر کے عشق کو کافی نہ ہوا !

دل نہ ہوتا جب بھی تیر عشق ہوتا روح کو
اس گرہ نے اور اس رشتہ کو محکم کر دیا

اشک گلرنگ بہا دیدۂ تر سے اکثر
بارہا فاش ہوا راز گلستاں ہم سے

کچھ اس میں مصلحت ذوق زندگی بھی تھی
عزیز وعدے کا اس کے جو اعتبار کیا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے جلوۂ طور
کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

عالم عشق کی فطرت میں خلل آتا ہے
ہاں یوں حضرت واعظ کا گر انساں ہونا

سرخ ڈورے تیری آنکھوں کے الٰہی توبہ
چاہیے تھا انہیں پیوست رگ جاں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں
میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

ہجوم شوق کا بس مختصر یہ قصہ ہے
کہ میں جو چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

حسرت اے دل کر گئی لذت درد
غیر کہتا ہوا فسانہ یاد آیا !!

سکون امن کی فنا کا سبب ہو آخر
کسی نے دل کو مجھے اس طرح بیقرار کیا

دل کو جہاں سکون ہوا جسم سرد تھا
وہ موت حیات تھی جب تک کہ درد تھا

گلہ کس سے جب اس کو اضطراب دل نہ آیا
خدا ہی کو ازل سے شیوۂ بسمل نواز آیا

آگے خدا کو علم ہے کیا جانیں کیا ہوا
بس ان کے رخ سے یاد ہے اٹھنا نقاب کا

کیا بتاؤں ابتدائے عشق کی مجبوریاں
لاکھ سمجھایا دل خانہ خراب آ ہی گیا

لکھ لیا سب قصہ بربادی عمر عزیز
کیا کلیجہ تھا ہمارے کاتب تقدیر کا

کیا آپ نے کبھی ہجر کے بیمار کو دیکھا
سینے میں دعا مانگتے اغیار کو دیکھا

اب زندگی و موت تذبذب میں پڑی ہے
کیوں نزع کے وقت آپ نے بیمار کو دیکھا

اب پھینکئے یہ خون بھری تیغ پھینکئے
کیا سوچتے ہیں آپ جو ہونا تھا ہو گیا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں
مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا

ذرے ذرے میں تموج دونوں عالم مضطرب
وہ بھی کیا تھا وقت جب عاشق کا دل سینے میں تھا

دل سے باتیں کر رہا ہے کچھ خبر بھی ہے تجھے
تیرے ہر انداز کو چھپ کر کوئی دیکھا کیا

میں حشر کی حقیقت اتنی سمجھ رہا ہوں
دونوں جہاں ہوں گے ان کا شباب ہوگا

سینہ میں اک جہنم آنکھوں میں ایک طوفاں
کیا جانتے تھے ہم کو جینا عذاب ہوگا

ہستی ذرہ دل میں دنیا لیے ہوئے ہے
یہ بھی کبھی کوئی ہم سا خانہ خراب ہوگا

مجھ سے قاتل کی ندامت تو نہ دیکھی جائے گی
جی میں آتا ہے بتا دوں روز محشر کا جواب

میں اور اپنی زیست سے مایوس ہو گیا
جب رو دیا مجھے کوئی غمخوار دیکھ کر

وعدہ کیا تھا پھر بھی نہ آئے مزار پر
ہم نے تو جان دی تھی اسی اعتماد پر

اٹھنے کو تیرے در سے اٹھا تو مگر نہ پوچھ
جو کچھ گزر گئی دل بے اختیار پر

کہا محاسب رحمت نے دیکھ کر فرد حساب
یہ مشغلہ ہے شب ماہتاب کے قابل

شراب عشق سے چھلکا جو دل کہا میں نے
یہ جام تھا کسی مست شباب کے قابل

فضائے وسعت دنیا ہے تنگ آنکھوں میں
جگہ نہیں دل خانہ خراب کے قابل

آئے ہیں اس ادا سے کسی کے جلوہ زار میں
بجلی چمک رہی ہے دل بیقرار میں

ہر چند ضبط باعث اخفائے راز ہو
یہ بات اب نہیں ہے مرے اختیار میں

پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا
ہوتا اگر یہ دل ہی مرے اختیار میں

ناصح تری نصیحت بے جا بجا سہی
کیونکر دکھاؤں تجھ کو کلیجہ نکال کے

وادیِ عشق میں بہلاؤں کہاں دل اپنا
ہر طرف رونے کی آواز چلی آتی ہے

ہم کسی فکر میں وہ اپنی کہے جاتے ہیں
سچ ہے ناصح کو بھی کیا درد سری آتی ہے

سچ تو یہ ہے کہ جوانی میں کسے ہوش رہا
میں نے اپنا وہ زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے

ان کو سوتے ہوئے دیکھا تھا دمِ صبح کبھی
کیا بتاؤں جو ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے

جس کے مرنے کی ہو خوشی ہم کو
ایسی میت پہ کون روتا ہے

کوئی عالم میں سو نہیں سکتا
بےخبر یوں بھی کوئی سوتا ہے

بجلی چمک رہی تھی یہ تمہید امتحاں
پردہ سرک رہا تھا کہ بیہوش ہو گیا

کیا دیکھتا ہوں کون یہ بیٹھا ہے میرے پاس
میں اپنے ہوش میں ہوں کہ بیہوش ہو گیا

ابر میں اور بجلیوں کی لہر میں کھائی ہوئی
بال بکھراتا ہوا انگڑائیاں لیتا ہوا

دنیا کو دو لو دلِ ناشاد سے ہوا
یہ طول اس خلاصۂ ایجاد سے ہوا

ہے یہ حقیقت عدم و عالم وجود
وہ خامشی سے یہ مری فریاد سے ہوا

رحمت نے بڑھ کے سرد جہنم کو کر دیا
کیا قصور یہ دلِ ناشاد سے ہوا

ناواقفِ رسوم محبت ہے کوئی چیز
انسان ہو یہ شیوۂ فریاد سے ہوا

لب تک اس کا نام آجاتا ہے اب بے اختیار
بات کرتا تھا اسی ڈر سے بہت کم کر دیا

ذرہ ذرہ خاک کا میری کہے گا داستاں
آپ سمجھے ختم میں نے قصۂ غم کر دیا

آپ کہتے تھے بتائیں گے جدائی ہم الگ
لیجئے دل نے وہ ساماں بھی فراہم کر دیا

دل کے اجزا میں نہیں ملتا کوئی جزوِ نشاط
اس صحیفہ سے کسی نے اک ورق کم کر دیا

کر دیا انکار ازل میں سب سے ہر دل گیر نے
وہ مری قسمت میں لکھا کاتبِ تقدیر نے

موت سے پہلے لکھا تھا میں نے ان کو ایک خط
کر دیا ہنگامہ اک حسرت بھری تحریر نے

دونوں ہاتھ اس نے ملا کر اس طرح انگڑائی کی
مار ڈالا کھینچ کے دوہری کیا [illegible] کی شمشیر نے

مجھ کو کافر ہی سمجھتے یہ خدا کے بندے — فاش اگر پردہ اسرار محبت کرتا
تیرا اندازہ رحمت جو بیاں کر دیتا — کوئی دنیا میں نہ پھر تیری عبادت کرتا

جتنی مصیبتیں تھیں وہ لکھ دیں گئے یہاں — بس ختم سعی کاتب تقدیر ہو گئی
دل کو جلا کے دولت جاوید پا گیا — اتنی سی بات مایہ اکسیر ہو گئی
اے سعی نامراد بتا کیا جواب دوں — تقدیر پوچھتی ہے کہ کم تدبیر ہو گئی
ہاتھوں سے میرے دامن رحمت چھڑا لیے — ہاں ہاں یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی

تیرا پرتو جو نہیں جلوہ فروز — ذرہ ذرہ میں چمک کیسی ہے

ہے طلسم تصور تو اب قدم اٹھیں — کہ ذرہ ذرہ یہ تصویر یار راہ میں ہے

اگر کوئی حالت بیمار فرقت ہو گئی ہوتی — اگر دم بھر نہ آتے تم قیامت ہو گئی ہوتی
سر محفل نگہ سرگرم تسلیم محبت ہے — یہاں ہوتے تو ناصح کو نصیحت ہو گئی ہوتی

مانا کہ کسی سے نہ کرونگا میں کوئی بات — چھپتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر بھی

یہی کہہ کہہ کے ہیں منزلوں کی ہمت افزائی — کہ اب آتا ہے ابدی اب یہ جانا بناتا

دل دل ایسا کون دل ہو کہ جسے قرار آئے — یہ جوانی اف جوانی کہ خدا کو پیار آئے

رو اور مر دیکھوں رنگ میں نئی طبیعت کا — یہی تدبیر اب باقی ہے قسمت آزمائی کی

بزم میں یہ ادا ہمیں سمجھے! — سب کو دیکھا ادھر نظر نہ ہوئی
ہم اسی زندگی پہ مرتے ہیں — جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی
دل نے دنیا نئی بنا ڈالی! — اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے — کیا کریگا اگر سحر نہ ہوئی

ہوتا نہیں ہے کوئی زمانہ میں کیا جواب — اللہ کوئی حد ہے تمہارے غرور کی بھی

دیار عشق میں اللہ رے میرے دل کی ہمدردی — ہر اک افسردہ دل کے ساتھ تھوڑی دور جاتا ہے

دم توڑتا نہیں کوئی بیمار اس طرح — شاید شریک موت کسی کی ادا بھی ہے

کس قدر ہے نالۂ مرا دلخراش — سننے والوں سے سنا جاتا نہیں
بجلی سی تھا ایک سامنے آکر نکل گئی — کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

شوقِ دل بڑھ گیا ہے حد سے سوا — فاصلہ گھٹ گیا ہے منزل کا

جیتے رہیں کیسے ایسی مثالوں کو دیکھیے — پردہ اٹھا کے جینے والوں کو دیکھیے
اب بھی بس ایسے لوگ کہ جن سے ملے سبق — دل مردہ ہے تو زندہ مثالوں کو دیکھیے

بتاؤں کیا کہ میرے دل میں کیا ہے — سوا تیرے تری محفل میں کیا ہے

نزع کا وقت ہے بیٹھا ہے سرہانے کوئی — وقت اب وہ ہے کہ مرنا بھی مقدور نہیں
دل میں پیوست ہوئی تھی جو مرے روزِ ازل — ہے وہی شوخ نظر صاعقہ طور نہیں

صیاد سر حق سے کیا کس نے سرفرو جہاں — اپنے عالم میں ترے دیدۂ مخمور نہیں

اُمیدوارِ وصل کو ان کا جواب صاف — ایک تیر تھا جو توڑ کے پہلو نکل گیا

یاد ہے پہلے پہل بجلی گرانا یاد ہے — آپ کی جب مہربانی تھی دل ناشاد پر

چمن کی سیر میں مقصود دلبستگی اپنی — خبر کیا تھی کہ ہر غنچہ کو ہم دلگیر دیکھیں گے
یہ مانا کاتبِ اعمال لکھ لیں گے مرقعے — مگر کچھ حال دل ناقابلِ تحریر دیکھیں گے
زمیں شق ہو فلک ٹوٹے پہاڑ آپس میں ٹکرائیں — مگر ہم آج زورِ نالۂ شبگیر دیکھیں گے

ذرے ذرے کو بنا دیگی کسی دن مشرق — مہر افروز تجلی ترے رخساروں کی!
آکہ سامانِ تجلی کی کمی پوری ہو! — بزم آراستہ ہے جھکتے ہوئے تاروں کی

ساز دل کو عشق کی مضراب ہی کافی نہیں — آپ کی آواز اس پردہ سے آنا چاہیے

میرے دلمیں کوئی ہمراز ادھر سے — سن رہا ہوں ایک آواز ادھر سے

شامِ فراق ذکرِ جوانی میں کٹ گئی — کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

دیدار کا لطف اے دل بیتاب وہیں تھا — ہر جلوہ مستانہ جہاں جبیں بجبیں تھا
تھی آپ کے آنے کی تمنا مرے دلمیں — مفہوم قیامت کا مگر ذہن نشیں تھا

مرزا ذاکر حسین ثاقب

تعارف:- ۱۸۶۹ء کو آگرے میں پیدا ہوئے ۱۸۹۸ء سے لکھنؤ میں مستقل سکونت رہی وہیں ان کے ذوق شعری کی تکمیل ہوئی اور وہیں سنہ میں انتقال ہوا۔

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی — ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا
سنائیں کیا تمھیں نیرنگ عشق کا قصہ — تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہل دہر کو — بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
نہ دم لے لے شریک غم، تجھے قسم عشق کی — فلک کو چھوڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا

رہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ میں — مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سمو چکا
یہ آشیانہ ستم چمن میں ہو تو خوب ہے — یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس تو میرا ہو چکا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھر آیا حسن — ایک لہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا
حسن کے ہاتھ بڑھے تو وہ ذرا دیر سہی — مجھ پہ احسان ترے آتی ہوئی انگڑائی کا

جلوۂ حسن اک اشارہ تھا بہت کچھ کہہ گیا — میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا
ان کی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی — نالہ کش برسوں کا اک تصویر بن کر رہ گیا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر — یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا! — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا
میں دنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں — کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا
شب غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا، خدا ہی خدا تھا

مری داستان غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں — کچھ انھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا
کوئی بات ہے جو دل میں ترا تیر جم کے بیٹھا — نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا
وہ حکایتیں جوانی کی میں سن رہا ہوں دل سے — جنھیں اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

تجھے اوروں کی خاطر چھوڑے جاتا ہوں میں اے عبرت — مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا
مرا دل محرمِ اسرارِ حسن و عشق تھا ثاقب — قرینِ مصلحت تھا مجھ کو دیوانہ بنا دینا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی — میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

متاعِ عشق کا ہو دل کے بعد کیا سودا — کہ گم شدہ کا بھروسہ نہیں ملا نہ ملا

اس کے سننے کے لیے جمع ہوا ہے محشر — رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا
تڑپوں تو راز کھولوں سنبھلوں تو عشق ناخوش — جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

سلسلہ ذکرِ جنوں کا آج تک باقی ہے کیوں — ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا
سب عالم کے لیے کچھ چھوڑ اے دستِ جنوں — اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

مجھ کو یقین وعدۂ فردا ضرور تھا — مشکل یہ آ پڑی تھی کہ دل ناصبور تھا

جو آنکھ ہو تو دیکھیے نہ پوچھیے کہ کیا کیا — چراغِ بزم ہو گیا جلا کیا بجھا کیا

کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شبِ فرقت — وہ جوش پہ آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں — ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر!
کہتے ہیں ڈال لگی مری شامِ فراق کو — اچھا یوں ہی سہی مگر اک بار دیکھ کر

تیرے ہوتے گل گلشن کو میں دیکھوں توبہ — ابھی ایسی تو نہیں قوتِ تسخیر بہار
ہیں تو میں گل بھی تو ہیں جامہ دری میں مشغول — سب کو دیوانہ کیے دیتی ہے تاثیرِ بہار

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں — اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر
میری طرح سے حال مرا ان کا خیر خواہ — عاشق ہے ان کی نیند مری داستان پر
آزارِ عشق سے کہیں گھبرا نہ جائے دل — آنے لگی ہیں یاس کی باتیں زبان پر
قابو میں دل نہ ہو تو غزل کیا کہے کوئی — فرمائشیں عذاب ہیں ثاقب کی جان پر

غنیمت ہے قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم — نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں
خدا آباد رکھے ہم صفیرانِ گلستاں کو — جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

عدوئے صیاد و گلچیں کیوں نہ ہو میرے نشیمن کے — یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنہیں برباد کرتے ہیں
خود اُن کا حسن میری داد خواہی آن کرتا ہے — وہ آئینہ لیے ہیں اور مجھ کو یاد کرتے ہیں

عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے — کچھ میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
پرسشِ حال اُس نے کی تو مجھے — یہی کہنا پڑا کہ اچھا ہوں

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے — سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
آئینہ ہو جائے میرا عشق اُس کے حسن کا — کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

کسی کا رخ دیکھوں نہیں ہوتا ہے میرے دل سے — نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دو عنادل سے
چل اے ہجوم ذرا سا ٹھہر جا ابھی بس نہیں — اگر دل بیٹھ جائیگا تو اُٹھ جائینگے محفل سے
اُمید و نا اُمیدی کا بہم ہونا وہی جانے — کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے
ترے تیور سے شب غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا — بتا دے نامرادی کون سی باتیں کروں دل سے
غموں کے آسرے پر ہجر میں بھی زندگی تھی تب — خلش بڑھتی ہو یہ کانٹے نکلتے دامن دل سے

مرادیں وہ شب فرقت تماشا گاہ عجم ہے — مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفاں دیدۂ دل سے
کہے جا بند وہ چپکا کہ داستاں کا رنگ محفل ہے — ذرا سمجھے ہیں لیکن یہ ہی ناں دیدۂ دل سے

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے — جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
ہجوم تمنا سے گھٹتے تھے دل میں — جو میں روکتا بھی تو نالے نہ رہتے
لہو تھا تمنا کا آنسو نہیں تھے — بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے — جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا — زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے

فضل الحسن حسرت موہانی

تعارف: یہ سنہ ۱۸۶۸ء میں موہان میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا۔

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت جاں — کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت — ان سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

جان پر غم نے بھی الزام لگایا نہ کبھی — یاس کو خوبیٔ تقدیر سے منسوب کیا
سخت محروم ادب ہے دل حسرت نے اگر — بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

شکوۂ غم ترے حضور کیا — ہم نے بے شک بڑا قصور کیا
درد دل کو تری تمنا نے — خوب سرمایۂ سرور کیا
یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے — تم کو خود بیں ہمیں غیور کیا
آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے — نہ ملے حسن کا غرور کیا
حسن بے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا — اے فریب نگاہ یاد یہ کیا!
اب وہ ملنے بھی بیٹھا تو یوں کہ کبھی — ہم سے کچھ واسطہ نہ تھا گویا

رہے محو خواب ہوس اہل ظاہر — گزر بھی گیا کاروان محبت
نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی — بیان تمنا زبان محبت
سر عجز حسرت بھی خم کیوں نہ ہوتا — ترا ناز ہے حکمران محبت

بسکہ زیب انجمن ہے جلوۂ جانانہ آج — ہے سراپا آرزو ہر عاشق دیوانہ آج
یہ ہوا بے تابیوں پر نشۂ مے کا اثر — کہہ دیا سب ان سے حال شوق گستاخانہ آج
ہے فروغ بزم یکتائی جو وہ شمع جمال — آگئی ہے دیکھنا بھی بے حجابی پروانہ آج

ہیں ہمی اب حسرت نہیں محوِ جمالِ یار (روئے)
پر دیکھتی ہیں نگاہیں اُسے مشتاقانہ آج

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اب تو اتنا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

شکوۂ جور تقاضائے کرم عرضِ جفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

حال کھل جائیگا بیتابیٔ دل کا حسرت
بار بار آپ اُنھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

لطف کی اُن سے التجا نہ کریں !
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

مل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے
لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں

صبر مشکل ہے آرزو بیکار
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت
اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

اُس بے وفا سے مصلحتِ شوق ہے یہی
اپنی ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجئے

منظور ہے جو ترکِ محبت ہی آپ کو
ہم پہ ہجومِ ناز و ادا بھی نہ کیجئے

حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بت کے عشق میں
تو چاہتا ہے یادِ خدا بھی نہ کیجئے

زہے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب
وہ ابتری جو تری زلفِ پُرشکن میں ہے

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا دہن میں رہے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے اُنھیں
کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے

جامہ زیبی نہ پوچھیے اُن کی
جو بگڑنے میں بھی سنور جائے

شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائے

گریۂ شام سے تو کچھ نہ ہوا
اُن تک اب نالۂ سحر جائے

شعر در اصل ہے وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھے ہمیں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

صحبتیں لاکھوں ہی بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا اُنکی عیادت کے مزے

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عشق کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ مشتاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

پہلے انھیں ہوئیں گردیدہ پھر آنسو کی طرح
چاہیے دل ابھی لگا آپ کو دکھا دیجیے

کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

شرحِ بے دردیٔ احباب کہوں کیا حسرت
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی
تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل

ہمہ یک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گزرا
وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

انور حسین آرزو

آرزو جوشِ طبیعت کو ہے آزادی پسند
ہم نہ غالب کے مقلد ہیں نہ پیرو میر کے

تعارف:- سنہ ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے سنہ میں کراچی میں انتقال ہوا۔ جلال کے شاگرد تھے۔ شاعری میں تو پایہ بلند تھا ہی زبان کے متعلق بھی انھوں نے ایسا کچھ لکھا ہے جو دوسرا نہ لکھ سکا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تابع شوق بھی ہیں ہم ان کے بھی ہیں مزاج داں
سوچ کے خط میں کچھ لکھا آپ ہی خود مٹا دیا

اتنا بھی بارِ گلشن خاطر نہ ہو کوئی
ٹوٹی وہ شاخ جس پہ مرا آشیاں بنا

وحشت ہم اپنی بعد فنا چھوڑ جائیں گے
اب تم پھرو کیے چاک گریباں کیے ہوئے

جوشِ جنوں میں اف تمہیں وحشی کا کھینچنا
بندھا ہے ہاتھ سے در زنداں کھلے ہوئے

مجھے بس چھوڑ میرے حال پہ اے شرم رسوائی
وہ دامن چاک کر بیٹھا ہوں جس سے منہ چھپانا ہے

زبانِ آرزو اور ماجرائے عشق کیا کہنا
فقط بے قدر ہے اس سے کہ جھگڑا ایک پرانا ہے

کچھ بات کہی ہم نے نہ کچھ اس نے سنی ہے
چتون ہے کہ تلوار لیے سر پہ کھڑی ہے

رہے دو دن کی ہم اپنی آنکھ جھپکتے دل لٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے کیا ہوتا ہے جب ہاتھ سے ناگ ڈس گیا

جس نے یہ حالت بنائی وہ بھی آج اے آرزو
چہرہ بیمار سے چادر ہٹا کر رو دیا

کہنے کی بات ہی نہیں آہ کہیں تو کیا کہیں
لب پہ ہے کیسی سکوت بیٹھے ہیں سر جھکائے یوں

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوئی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

چونک اٹھی ہوا کہ دنیا چیخ اٹھا ہے اک عالم
گھبرا کے اکیلے میں جب اس کو پکارا ہے

ادا سے بل تیوری پہ لانا بجا کہہ کے مسکرانا
شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے ان کو بھی [illegible]

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرمائے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ کہنا نہ تھا جو سب کچھ کہہ جانا

موج اٹھی ڈوبی عمر کی کشتی
آج پایا نشانِ ساحل کا

عادی بلا کے لذت آزار نے مجھے
غم کی خلش کو دل کی تمنا بنا دیا۔

جو سینے میں دل ہی تو بار محبت
اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑیگا

وحشت انگیزی میں یکرنگی گریباں گیر تھی
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش
ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارے ٹوٹے

بدلی کی چھاؤں سی ادھر آئی ادھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

بڑے مزے کے تھے الزام گرچہ جھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا اسی فسانے کا

جیسی جس کی طینت ہوگی ویسا سب کو بتائیگا
داغی آئینہ جب دیکھو دھبا منہ پر آئیگا

رسوائی مزید کا امکان نہیں رہا
ان دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

شرح بربادیٔ دل مجھ سے نہ پوچھ
ہے ترا حسن سراپا موجود!

ہے نگاہ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار

امنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک میں ہم کو گئی بہار کہاں

ان کی بے جا بھی سنو آپ بجا بھی نہ کہو
آخر انسان ہوں میں بھی کوئی دیوار نہیں

کبھی چاک ان کے ہاتھوں سے کچھ آنسو اپنی آنکھوں سے
دیا ہے جو مقدر نے لئے بیٹھا ہوں دامن میں

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

پردہ کی چلمنوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی
جو دیکھنا تھا اہل نظر دیکھتے رہے

بیٹھی ہوئی دستار کو بھی سر سے اڑی ہے
وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اڑی ہے

افشائے راز کتمان وفا، امتحان صبر
آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کیے

اسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لئے

تھا ہمیں ذکر وفا پر آہ کرنا کیا ضرور
سادگی دیکھو کہ دل کا راز خود افشا کیا

ہر سانس ایک شعلہ ہے ہر شعلہ ایک برق
کیا تو نے مجھ کو اے طپش دل بنا دیا!

اس شان عاجزی کے فدا جس نے آرزو
ہر ناز پر غرور کے قابل بنا دیا

اشکوں سے راز کھلتا کیا خون آرزو کا
آنکھوں تک آتے آتے رنگ اڑ گیا لہو کا

آرزو صاحب کی خالص اردو

رس ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
کتنے ہی ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی

دل سے لو کا جو اٹھا آنکھ سے ٹپکا پانی
آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

اس ہی کا اس جگ میں ہوا اور رسیلی دو آنسو بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

تڑپا جو لگی جوت تمہارے چاند سے مکھڑے کی
چنچل بھی ہے کہ بجلی کیا جنم اس نے لیا ہے

وہ آرزو ابتک تو کلیجہ پہ ہرا ہے
چرکا جو لگائی ہوئی تیوروں نے دیا ہے

دیکھنے کو جو ان آنکھوں کے ترس جائیگا
جی تو اک پھول ہے کمھلا کے جھلس جائیگا

لگ سرکتا ہوا پھندا ہے یہ چاہت کا لگاؤ
وہ جو پیچ سمجھتے نہیں اور بھی کس جائیگا

جل کے ہیں راکھ بھی ہو جاؤ تو کوئی نہ پوچھے
راکھ بھی آگ ہی ہے ہاتھ جھلس جائیگا

آزمانے سے تو دینے کی نہیں جی کی امنگ
پانی مرتا جو گڑھا ہوگا وہ دھنس جائیگا

سیکڑوں ڈوب گئے بوند چھلک کر نہ گری
باہر آنکھوں سے نہ ان آنکھوں کا رس جائیگا

دیکھ کر مجھ کو بناوٹ سے نہ لو ٹھنڈی سانس
بادل امڈا ہوا آیا ہے برس جائیگا

آرزو آنکھ نہیں اس کے سمانے کی جگہ
دیکھنا دھیان میں آتے ہی وہ بس جائیگا

بناوٹ کو چاہت کے سانچے میں ڈھالا
بڑی چوٹ کھائی ارے مار ڈالا

کیا کیا، ہوا کیا، بنی بات بگڑی
جب آنسو کو روکا اٹھا ایک چھالا

انھیں کیا پڑی ہے جو تلوار دھوئیں
لہو لال تھا اور دھبا ہے کالا

انہی کے نہ ملنے سے جی پر بنی ہے
یہ کاہے کو سمجھے مرا بھولا بھالا

لگاوٹ کی باتیں، بناوٹ کی گھاتیں
اندھیرے نے پھانسا دکھا کر اجالا

جو رو دو تو ہنس دے جو چپ ہو تو چھیڑے
پڑا ہوگا کاہے کو ایسے سے پالا

الٹے جو دیتے ہیں، پہلے کہاں تھے
کسی نے نہ گرتے ہوئے کو سنبھالا

چھری پھیرنے کو رہے ہی گلے پر
تجھی سے یہ کہنا کہ جا اور اچھالا
بھری آہ جب ہی، کسی نے چپکے سے سسکی
بدلنے لگا کروٹیں مرنے والا
ہر اک بات سے آرزو کیا انوکھی
کہے جا، کہے جا، ترا بول بالا

نہ سوچا، نہ سمجھا، نہ دیکھا، نہ بھالا
جیو تم کہ چاہا جسے مار ڈالا
اب ایسے نہ بیٹھے ہم کو چھیڑو تو رو دیں
بھلا ہوگا کوئی کلیجے کا چھالا
یہ آنکھ اپنی ساون ہے وہ آنکھ بھادوں
یہ ٹپ ٹپ ہے آنسو کی پانی کا جھالا
جو کہتا وہ سنتے، جو سنتے وہ کرتے
مرے بانکپن نے مجھے مار ڈالا
نہیں اور نہ بولیں، وہیں اور نہ بہکیں
ذرا سی جھجک نے بڑا بوجھ ڈالا
نہ چھوٹے اس کو جاؤ کہ مرنا ہے ہم کو
بدل لی جو کروٹ لیا ہے سنبھالا
ملاؤں ذرا آنسوؤں کی لڑی سے
ادھر لا، ادھر لا، یہ موتی کا مالا
اسے اندھیر نگری میں بھی نہ ڈھونڈو
جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اجالا
جسے آرزو کوئی تاکے نہ چھینے
تجھے راج گدی ہے وہ مرگ چھالا

باتوں میں سنبھالینا اور منہ کبھی نہ دیکھا
ان سے ہنس کے دل جانا لے دیکھے ہی بہلا
ہونٹوں پہ ہنسی جب ہے آنکھوں میں آنسو آیا
بہلائے تو بیٹھے ہو آتا نہیں بہلایا
او بدلی ہوئی چتون بھولا ہے نہ بھولیگا
ہنستے ہوئے وہ آنا روتے ہوئے وہ جانا
کام اپنا چھری اپنی، ہاتھ اپنا گلا اپنا
آنکھوں کا پھرا لینا اور میرا سمجھ جانا
ان تیوروں میں بل ہیں کس کو نہ بتائے گی
تھرا کے یہ دھمکانا دھمکا کے یہ تھرانا
سر پھوڑتے پھر پھر سے آتی ہے ہنسی انکو
اک چوٹ تو کھا بیٹھا، آتا نہیں سمجھانا
بیڑا ہو پار کیا بھلا نیّا ہے اس اسطرح
کھول کے ناؤ لے چلے دھار پہ ہاتھ کے چھوڑ

اے آرزو اتنا بھی کیسے نہیں بن پڑتا
آئے ہو تو تھم جاؤ، میں جاؤں تو پھر جانا

برج نرائن چکبست

تعارف:- کشمیری چکبست برہمن تھے اور چکبست ہی تخلص تھا لکھنؤ کے قدیمی باشندے تھے سنہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۲۶ء میں چوالیس برس کے سن میں انتقال ہوا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

درد الفت آدمی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں بن گئے

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی نظروں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

ابھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

محبت ہے مجھے کوئل کے درد انگیز نالوں سے
چمن میں جا کے میں پھولوں کا شیدا ہو نہیں سکتا

نئی تہذیب کے صدمے نہ سہتے یاد دل کو
ہے منطق کے پردے میں سمجھے بے حیائی کے

ہوس جینے کی ہے یوں عمر بیکار کٹتی ہے
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا

اہل ہمت منزل مقصود تک بھی آ گئے
بندۂ تقدیر قسمت سے گلا کرتے رہے

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آساں اس جینے سے مر جانا

جہاں میں ہوش کے یوں قائم ہوا اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن پر

کشمکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی
اپنی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آئے دامن گل میں قرار کیا

رنگ گل جہاں میں ہے پردۂ خاک چمن میں بھی
تازہ کرم ہی ان کو ہوائے بہار کیا

بلائے جان ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

اذاں دیتے ہیں بتخانہ میں جاکر شان مومن ہے
حرم میں نعرہ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے
رنگ ہندو دیکھ کر طرز مسلماں دیکھ کر

دل میں اس طرح سے ارماں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

میرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے
وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

دوست مرنے پہ مرے داد وفا دیتے ہیں
ہائے کس وقت محبت کا صلہ دیتے ہیں

دشمنوں سے بھی مجھے ترک وفا مشکل ہے
دوست بنکر مجھے تہمت دغا دیتے ہیں

جس نے دل پیدا کیا اس سے شکایت کیجیے
دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بیدار ہے

ہمالیہ اور واعظوں کے مذہب میں فرق اگر
کھینچ گئے ہم جس کو پاس انساں دو ...

خود پرستی مٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی
ماتم احباب سے تعلیم روحانی مجھے

ہائے اس دنیا کی پابندی عجب لگتی ہے
خود بنتا ہے جیسے انساں یہ وہ زنجیر ہے

دیکھا سرور بادہ مستی کا خمار
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

رنج و راحت کا سبب دنیا میں کچھ پایا نہیں
حشر میں ہم صاف کہہ دیں گے خدا کے سامنے

موج شباب میں ہے سر سے خون تمنا کا
لہو میں پھر یہ روانی ہے جوش ہے

اعمال کا طلسم ہے نیرنگ زندگی
تقدیر کیا ہے گردش لیل و نہار کیا

دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے پہ نمایاں ہونا

حور سا جمال نیا پیرہن ہستی پہنتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے ذیل سے گزر جانا

اپنا ہی دم ہوا ہے گلوگیر وقت نزع
غیر دل کا زندگی میں ہو پھر اعتبار کیا

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

جنت میں خاک بادہ پرستوں کا جی لگے
نقشے نظر میں صحبت پیر مغاں کے ہیں

اپنا مقام شاخ بریدہ ہے باغ میں
گل ہیں مگر ستم زدہ باغباں کے ہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

لکھنؤ کی شاعری کا آخری دور

تعارف:۔ مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی معزز اطباء کے خاندان سے ہیں شرافت تہذیب کا معیار اور حُسنِ اخلاق کا پتلا تھے عزیزؔ کے استاد اور خود لکھنؤ کے بڑے اساتذہ میں تھے ۔

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی
کچھ انہیں سے دلِ دیوانہ بہلتے دیکھا

کیا حسرتِ دیدار ہے ہر بار یہ سمجھا
گویا کبھی دیدار میسر نہ ہوا تھا

پوچھا اثرؔ سے میں نے جو دل کا معاملہ
اک آہِ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

جو سانس سے رکی ہے جو آنکھوں سے ڈھلکی ہے
چھیڑا یہ آج کس نے افسانہ بیخودی کا

وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار
جیسے چراغِ سحر جھلملا کے بجھ گیا

اپنی وفا نہ ان کی جفاؤں کا ہوش تھا
کیا دن تھے جبکہ دل میں محبت کا جوش تھا

لے لیا دل مڑ کے نہ دیکھا ادھر
جاؤ تمہارا ہی بھلا ہو گیا

صیاد نے چھوڑا وہیں خانۂ گلشن کے
جب مقصدِ اسیری نے کیا ترک وفا کا

کوئی موسم ہو سماں کچھ بھی تغیر ہو کوئی
تم کو جب دیکھ لیا وقت فراموش ہوا

تم نے پوچھا اس طرح حالِ دلِ خانہ خراب
یاد اب کچھ بھی نہیں اب تک جو کہنا تھا

کبھی نصیب ساحل پہ جو کشتی جب ہے
جو میرا مدعا تھا کبھی کچھ عیاں نہ تھا

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی
بہار سے جوشِ جنوں کا وہی زمانہ تھا

ہوا میں کچھ دھواں اٹھ کے فضا پھیل جاتا ہے
قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیانہ

میں اب سمجھے کیوں دل کو سمجھاؤ یار
نظر آتا ہے کیوں سب میں کسی کا آستاں مجھ کو

ہم سے رو رو کے بات کرتی ہے
آنسوؤں پہ یہ رنگ تب آیا

فریاد کا شکوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں
کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائے گا

میں نے سمجھا تجھے نہیں لے قسم ہے تمہیں
آپ ہی کچھ زیر لب کہہ کے خفا ہو گیے

چمن میں ہم سے شاخ گل پہ آشیاں ہے نہیں پھر بھی
غضب ہے طائر آزاد کا بے بال و پر ہونا

کبھی رشک نے تجھے نہ دیا کہ بے وفا ہے
وہ کسی سے وعدہ کرتا مجھے اعتبار ہوتا

اب یہ سودا ہے کہ حاصل ہوش میں آئیں گے کیا
کہہ دیا ان مد بھری آنکھوں نے دیوانے سے کیا

چہرے کا رنگ دیکھیے آئینے میں اثر
کہنے چلے ہیں درد دل اپنی جو وفا سے آپ

بھولنے والے سے کوئی پوچھتا
میں بھی تجھے دل سے بھلاؤں کس طرح

آہ کس سے کہیں کہ ہم کیا تھے
سب یہی دیکھتے ہیں کیا ہیں ہم

حیف کہیں فرصت ہی نہیں ہے ورنہ لیا کیا حسرت تھی
حال ہمارا کچھ سن لیتے کچھ حال اپنا کہتے تم

شمع بھی دل کی شے ہے آخر دل کو اثر بھانا تھا
در سے کسی کے اکبار اٹھ کر کاش دوبارہ نہ جاتے

ابھی کس لطف سے پوچھا کہ ارے کیسے ہو
بیخودی کا ہو برا کہہ دیا کچھ یاد نہیں

محبت اور اظہار محبت
یہی تو بات ہے دیوانے پن کی

وہ آئے جان تھی اٹھ گئے کہ کیسے خفا ہو کے
میں اب تک یہ سمجھتا ہوں کہ گویا ہیں سمجھے پر

کبھی تھا پاس محبت اب یہ حسرت ہے
کسی کو راز دار کر لیں کسی کو ہم راز کر لیں

کہتے ہیں حال اثر اب نہیں دیکھا جاتا
کوئی حیلہ ہے تجھ پہ ستم ہو کہ نہ ہو

نظر سے گر گئی ہے گوشہ دامن ہاتھوں سے
معاذ اللہ کوئی کیا کرے ایسے پشیماں کو

دل وہی دل ہے کہ جس کی زندگی ہو اضطراب
غم وہی غم ہے کہ تم سے بھی جو پنہاں ہو

ایسی صورت کوئی نکلے دیدۂ تر ہو جائے
دل یہ چاہے گر تو مرے چھپانے کی خبر ہو جائے

آستاں تو کوئی ڈھونڈ رہی قسمت میں
ہو اک سجدہ مرا نذر جو ہو جائے

کچھ کلام ہی نہیں رشک سے مرنا ہو نہیں
کیوں کہوں بات پہ دیکھو بھلا ماتم

پھر نہیں فرصت تو تھوڑی ہی اب میں نہ ہو
یہ بتا کے جاؤ میرے حق میں کیا منظور ہے

دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی
تم کو خبر نہیں جو تمہاری نظر میں ہے

جھلملاتے ہوئے تارے گیا ہیں
مرجھائے پھول ترے بستر کے

تم ابھی کچھ تھے ابھی ہو کچھ اور
دیکھ لیجئے دو ذرا جی بھر کے

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت تھی
اک موج تھی ہوا اٹھکر پھر مل گئی دریا سے

بسمل گر نیاز میں وہ بھی گناہ ہے
اک چھینٹا آب تیغ تمنا کہیں جسے

سخن نا آشنا رکھا کسی کی بزم میں مجھ کو
کبھی تہذیب مجلس نے کبھی ترتیب محفل نے

وہ میں نہیں رہا ہوں وہ دل نہیں رہا ہے
کیوں چھیڑتے ہو رونا بے اختیار آئے

شکوے تھے صرف لذت گفتار کیلئے
ہم جانتے رو کے نہیں بیکار کیلئے

آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
لو آئے تھے وہ پرسش بیمار کیلئے

وہ بیوفا ہیں کہ ہم بے وفا خدا جانے
خیال تم سے ہے اور ان کی آمد آمد ہے

ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں
ورنہ آلودہ جبیں بندگی ہو جائیگی

اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا اعتقاد
ہو فنا یہ تیرے وعدے ہی مجھکو تیرے ہے

اک روز دل میں تیری محبت تھی جاگزیں
اب تو ہی تو ہے تیری محبت نہیں رہی

میں کیا سناؤں درد محبت کا ماجرا
حد ہو گئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی

وہ بدگماں ہیں میری خموشی سے اور بھی
مرتا ہوں حرف شوق مکرر کیے ہوئے

اچھا ہوا غش کھا کے گرے حضرت موسیٰ
اب ہوش میں رہنے کا تو الزام نہیں ہے

ہوش رہتا ہے بس اتنا دم تحریک جنوں
جیسے چھپنے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

خاکستر پروانہ میں بھی آگ دبی ہے
اے باد صبا دیکھ کے دامن کو ہوا دے

کچھ ہوش میں آنے کی مرے شکل تھی ناصح
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

آیا تھا کچھ خیال کہ دنیا بدل گئی
کیا شرح بے ثباتی دنیا کرے کوئی

یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے
اے شوق دید اب نہ پھرا در بدر مجھے

قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر بھی سنا
رہنے دے محو لذت ذوق خبر مجھے

کلب احمد مانی جائسی

مولانا کلب جعفر صاحب کے فرزند اکبر خان بہادر کلب عباس صاحب کے برادر حقیقی جانشین ہوگئے اور لکھنؤ میں زیادہ قیام رہا اپنے زمانے کے صاحب نظر شاعر تھے مگر زمانے نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا سنہ ۱۸۸۸ء ولادت اور سنہ ۱۹۶۲ء میں وفات ہوئی

جھکے نہ ناؤ میں کسی تو پکارے کوئی ۔۔۔ خوش جیے جا امیدوں کے سہارے کوئی
حل تو جاتی ہے مرے نالۂ خاموش کی داد ۔۔۔ دل تک آواز تو آجاتی ہے بارے کوئی
التفاتِ نگہِ دوست میسر نہ ہوا ۔۔۔ زندگی یوں کبھی نہ بے کیف گزارے کوئی
متصل یار کہے حسن میں ہو عرض نیاز ۔۔۔ سمجھے اس ناز مسلسل کے اشارے کوئی
آج ہے قہر کا طوفان لبِ ساحل مانی ۔۔۔ شاید آ لگے کہیں ناؤ کنارے کوئی

ہر ادا اُن کی تھی پیامِ کرم ۔۔۔ یہ تصور نظر نہ سمجھے ہم!
موت بھی نامرادی پیہم ۔۔۔ جی رہا ہوں بہ اعتقادِ کرم
کون محفوظ ہے تغیر سے ۔۔۔ نہ یہ عالم نہ دوسرا عالم
مٹ چکے ہیں ہزار احساں ۔۔۔ دیکھنا شانِ احتیاطِ کرم
رنج و راحت سب اعتباری ہیں ۔۔۔ ہم جہاں خوش ہیں تم وہاں پُرغم
دل ہے تفصیل کے لئے بیتاب ۔۔۔ تو نے کیسی نگاہ کی مبہم
در پہ شاہی میں سر گرتا کیوں ۔۔۔ بیم یاد آتش سے ہے امیدِ کرم

اُمیدیں جو حدِ امکاں سے آگے دل میں پلتی ہیں ۔۔۔ چھلکتی ہیں تو تبسم یا آنسو کو بدلتی ہیں
محبت ہو کہ حسن اک سوزِ یکساں کارفرما ہے ۔۔۔ نہیں ہے قوتِ پروانہ تو یہ شمعیں بھی کب جلتی ہیں
رفاقت اور شے ہے دوستی یا دشمنی کیسی ۔۔۔ جہاں جاتا ہوں میں ناکامیاں بھی ساتھ چلتی ہیں
نگاہِ منتظر آخر نگاہِ واپسیں ٹھہری ۔۔۔ محبت ہی میں تمنائیں بھی کیا شکلیں بدلتی ہیں
وہ تربت آگئی ناکامیِ پیہم سے اے مانی ۔۔۔ مرادیں خندہ زن ہیں دل پہ گویا ہر گلی میں

دنیا میں کشمکش کی کوئی انتہا نہیں ہے
جبرِ مقدرات بھی قیدِ وفا بھی ہے

کیسا ہراس شورشِ طوفاں سے ناخدا
تو ہی نہیں محافظِ کشتی خدا بھی ہے

چھوڑا رہِ طلب میں جو امید نے تو کیا
میرا رفیق اک دلِ بے مدعا بھی ہے

ساقی ادھر نگاہ تو کر جام دے نہ دے
اس تیری بزمِ عیش میں اک بے نوا بھی ہے

کچھ تو ازل سے روح محبت میں مبتلا تھا
کچھ کارسازیٔ دلِ درد آشنا بھی ہے

کیا شانِ کردگار ہے ضدیں جمع ہیں
عشق ایک دردِ زیست بھی ہے اور دوا بھی ہے

تسکین یاس میں ہے مگر یاس ہی کہاں
مانیؔ ابھی تو حشر کا اک آسرا بھی ہے

دعوائے عاشقی بھی ہے لب تک گلا بھی ہے
حالانکہ شرطِ عشق محبت وفا بھی ہے

تقدیر نارسا بھی دلِ مبتلا بھی ہے
شکرِ خدا لب گلہ نا آشنا بھی ہے

آسانیاں کہاں رہِ پُرخارِ عشق میں
رہرو کا یار دوش اگر مدعا بھی ہے

یاد اُن کا دادِ غم یہ فقط آس ہی نہیں
دل کو یقینِ وعدہ و صبر آزما بھی ہے

اک میرا آشیاں نہیں برباد ہے وہی
گل بھی ہیں بوئے گل بھی نسیمِ صبا بھی ہے

تقریب کیلئے کہوں کیا داستانِ غم
کچھ تم کو دردِ دل کا اگر اعتنا بھی ہے

چھاتے ہیں بے یقین منزل ہوں گامزن
یعنی کہ مدعا بھی نہیں ہے دعا بھی ہے

دشوار ہو کہ سہل یہی ایک راہ ہے
دنیا میں زندگی کے سوا راستا بھی ہے

تو اور امتحاں ترا مانیؔ یہ وہم کیوں
بزمِ وفا میں کوئی تجھے پوچھتا بھی ہے

مے سے توبہ حرام ہے اب تک
دستِ ساقی میں جام ہے اب تک

موت کیا ختم کر سکی قصۂ غم
داستاں ناتمام ہے اب تک

کس کا اک حرف تھا وہ صبحِ ازل
وہی زورِ کلام ہے اب تک

واعظا جیب بھی رہ کر دلمیں مرے
کچھ ترا احترام ہے اب تک

پہل مٹا حسن کی روش پہ عشق
شورِ محشر حرام ہے اب تک

جلوہ یونہی رہے گا نامحدود!
جس طرح ناتمام ہے اب تک

ابھی کافر نہ کہیے ماہرؔ کو!
قصدِ بیت الحرام ہے اب تک

جنوں مجھے تو کوئی داد ہوش کی نہ ملی
وہ بے خودی بھی گئی اور آگہی نہ ملی

کجا وہ خلوتِ راز آشنائے راہِ نیاز
سرے سے ہم کو تو راہِ نیاز ہی نہ ملی

تو کیا ہوا جو کٹی زیست وقفِ غم رہ کر
جو آنِ کارِ غم ہے وہ فسردگی نہ ملی

ہزار سادہ ہو لئے ہیں بے وفائی کے
وفا کے رنگ میں تصویرِ آدمی نہ ملی

سوائے ظلمتِ آفاق کیا ہے اس کے لیے
جسے تمہاری تمنا سے روشنی نہ ملی

کچھ اپنے بس میں ہے قیدِ وجود سے چھٹنا
ہمیں تو سعی سے راہِ فرار بھی نہ ملی

رہِ حیات میں کافی سمجھ رفاقتِ غم
خوشی کا ذکر ہی کیا ہے ملی ملی نہ ملی

کبھی ادا نہ ہوئے ہم سے آستاں کے حقوق
جبیں ملی بھی تو شایانِ بندگی نہ ملی

درِ امانِ حقیقی یہ خم ہے سرِ ماہرؔ
جہاں میں اور کہیں جائے امن ہی نہ ملی

حاصل بہ فیضِ یاس وہ جذبہ ہے ان دنوں
ہر آرزو سے ماسوا ہے دل بچا ہے ان دنوں

منزل کے پاس عشق جو لایا ہے ان دنوں
دل میں بھی عزمِ ترکِ تمنا ہے ان دنوں

تکلیفِ ضبطِ راز گئی ساتھ ہوش کے
اُلفت جنوں کی شکل میں رسوا ہے ان دنوں

دیوانہ ہوں خزاں میں بھی آ دیکھ لو بہار
یعنی ترا جنوں بھی تمنا ہے ان دنوں

یہ غم ہے جس جہاں میں وہیں عشق بھی تو ہے
دامِ فریب یہ نظر آیا ہے ان دنوں

اُمید اب تو ہے کہ بھر آئے گا زخمِ دل
توفیقِ شکر صرفِ مداوا ہے ان دنوں

ماہرؔ جو وقت بیت گیا اس کو بھول جا
یہ بھی تو وقت ہے جو گزرتا ہے ان دنوں

محویت یہ ہو کہ پھر ہوش میں آ ہی نہ سکوں
سر ترے در پہ جھکا دوں تو اُٹھا ہی نہ سکوں

غم کو اندازِ تبسم میں دکھا ہی نہ سکوں
یہ تو شکوہ نہیں لب تک جسے لا ہی نہ سکوں

سجدے کرتے ہیں مجھے ورنہ ترا نقشِ قدم
نقشِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا ہی نہ سکوں

لکھنؤ کی غزل کا ایک اور طرز

(سلام)

لکھنؤ میں غزل کی ایک قسم سلام بھی ہے میر انیس نے اپنے نواسے رشید صاحب سے کہا تھا کہ ہماری غزل ہمارا سلام ہے۔

محمد جعفر صاحب اُمید نے غزل میں جو اصلاح تجویز کی تھی یعنی رندی و شاہد پرستی کے مضامین واعظ و ناصح کی تضحیک۔ حضرت خضر کی عمر حضرت عیسیٰ کا معجزہ، حضرت یوسف کے حسن کا تضعیف سے اجتناب عشق کو حالت اطلاق میں کھنا اسی کو حالی نے اپنے نام سے مقدمہ شعر و شاعری میں اصلاح غزل کے عنوان سے پیش کیا تھا مگر وہ دونوں اس رنگ میں اچھے شعر نہ کہہ سکے اور یہ اصلاح مردود و متروک ہوگئی مرثیہ گویوں نے اسے معراج کمال تک پہنچایا انھوں نے سلام کو غزل بنا لیا۔ ابتدا میں سلام کی وضع یہ تھی کہ مطلع مجرئی سلامی سلام یا السلام سے شروع ہوتا اور مقطع تک فضائل و مصائب کی فضا قائم رہتی تھی مرثیہ کی ترقی کے ساتھ سلام کو بھی ترقی ہوئی مطلع میں سلامی یا سلام شاذ رہ گیا اور غزل کے مضامین سوائے رندی و اوباشی کے داخل کر دیئے دو ایک شعر واقعہ کربلا کے متعلق ضرور ہوتے تھے اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ہر شاعر غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے۔

جو شاعر غزل اور مرثیہ دونوں کہتے رہے انھیں چھوڑ کے جن شعرا نے غزل ترک کر دی انھوں نے اپنی غزلوں کو سلام بنا لیا۔ غزل کے سنجیدہ شعر سلام میں آگئے جس طرح امید اور حالی چاہتے تھے مثال میں میر انیس کو دیکھیے ان کی غزل ہے۔

اشارے کیا نگہ ناز دلربا کے چلے
جب ان کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے

پکارتی تھی یہ حسرت لاش عاشق کی
صنم کہاں ہمیں تم خاک میں ملا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

تمام عمر جو کی سب سے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرائے آ کے چلے

رہی غرور سے نفرت سادہ کار دل کو
قلم کی طرح چلے جب تو سر جھکا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے عروج ملا !
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیس نے اس غزل کو یوں سلام بنایا۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرائے میں آ کے چلے

خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہاں سے جو اصغر تو مسکرا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

خرام اسپ شہ دیں سے دیتے گئے ہم تشبیہ
کہاں ہے کبک دری چال تو ہم بتا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

حسین کہتے تھے واحسرتا علی اکبر
بہار باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے

فلک پکارے کہ الٹا زمیں کا طبقہ
حسین فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے

اس میں تین عشقیہ شعر حذف کر گئے بقیہ تین شعر بڑھائے ہیں۔
اس غزل کو سلام بنانے کے لئے انیس بقیہ اشعار زیادہ لکھے ہیں لیکن

بعض میں ایک آدھ شعر [illegible] ہے جیسے ؎

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھتے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھتے ہیں

کبھی بڑا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا
ہر ایک ذرہ کو ہم آفتاب سمجھتے ہیں

کرم عجب کہ عطا کر دے وہ فقر دنیا میں
کہ فخر رسالت مآب سمجھتے ہیں

بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نان خشک کو وہ
اسی آبرو کو وہ موتی کی آب سمجھتے ہیں

الٰہی تیرا ابر کے در کا ہے ذرہ بقدر
ہم آسماں پہ جیسے آفتاب سمجھتے ہیں

یہ اتنک تاک سے کہتے ہیں حسن کو اب طرح
یہ عطف گل سے جیسے ہم گلاب سمجھتے ہیں

شباب میں بھی غفلت [illegible] سحر تھی
سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھتے ہیں

بھکا ئیں سر کو نہ کیوں ذکر عراق کے فصحا
سوال شاہ کو سب لا جواب سمجھتے ہیں

خدا کی راہ میں ایذا دے جن کو راحت
زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھتے ہیں

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھتے ہیں

اس سلام میں جو شعر تو ایسے بھی ہیں جیسے غزلوں میں بھی ہوتے ہیں صرف آٹھواں شعر ایسا ہے جو غزل کا نہیں ہے۔

ان کے سلام میں بہت سے شعر ایسے ہیں جن میں غزل کا رنگ پوری طرح موجود ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل کا شعر ہے جیسے ؎

بلبلیں دم بھر جدا ہوتی نہیں
کس گل تر کے گلے کا ہار ہوں

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

نہ جانے برق کی چمک تھی یا شرر کی چمک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

کور ہوتیں اسکا جلوہ دیکھ کر
شکر ہے آنکھوں کا پردا رہ گیا

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے
فقیر ہوں پہ نہیں عادت سوال مجھے

قناعت نے گھر آمد و در اپنے دی
ہم اپنے کیسہ خالی میں کیا نہیں رکھتے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیس
فقیری میں بھی عزت تو نگر رہے

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے

قطع امید ایک در سے گر ہوئی کچھ غم نہیں
اور کچھ سامان کردیگا خدا میرے لیے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب واں ہم قدم رکھتے نہیں

جو مقدر ہے وہ ملتا ہے بغیر تدبیر کے
ہم ہیں صابر جو خیال عیش کم رکھتے نہیں

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

فقیروں کی کیا موت کیا زندگی
جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

شست و شو سے گو ہوا اجلا ازل
جامۂ اصلی میں دھبا رہ گیا

اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا
اسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا

ہر نفس آئینۂ دل سے یہ آتی ہے صدا
خاک ہو جاؤ تو حاصل ہو جلا میرے لئے

بھیجیے جنت میں یا دوزخ میں یا اکرم تم تو
تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لئے

فقیر دوست جو ہے مجھ کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

انیس تحمل وہ دنیا سے کیا فقیروں کو
انہی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

خاک ساری نے دکھائیں رفعتوں پہ رفعتیں
اس میں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

رات اندھیری ہے پرسش اعمال ایذائے فشار
قبر میں بھی چین سے انسان سو سکتا نہیں

کار ذاتی سے میں عاجز ہوں اکبار آن جاں
گرد اپنے منہ کی پانی آپ دھو سکتا نہیں

سوؤ گے کب تک بس اب اٹھو انیس
دن بہت غفلت میں کھویا دن گیا

جو سخی ہیں مال دنیا سے خالی ان کے ہاتھ
اہل دولت جو ہیں وہ سخت کرم رکھتے ہیں

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے انکے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

نقد جاں تک دے کے ہم لیتے ہیں جا وقت کرم
عادت جو شے ہے آدمی کو با کرم رکھتی نہیں

عالم فانی میں کیا تم کو ملا
اور کچھ اپنی گرہ سے کھو گئے

عالم پیری میں یہ غفلت انیس
رات بھر جاگے سحر کو سو گئے

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری سے
چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

غلط یہ لفظ یہ بندش بری یہ مضمون سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

قریب ہم آئے کہاں کہاں الٰہی پھر کے
تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

کچھ انیس ہی پر موقوف نہیں تمام مرثیہ گویوں کے سلام ایسے ہی ہیں اگر ہر دور کے سلام غزل کی طرح پیش کئے جائیں تو ایک دفتر ہو جائیگا ۔ اس لئے ہم صرف انیس کا کلام پیش کرتے ہیں یہ ایک بہت اعلیٰ اور سنجیدہ غزل کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

رباعی

رباعی کی مخصوص بحریں ہیں اور مضامین بھی بہت حد تک محدود ہیں لکھنؤ میں مرثیہ گویوں نے اسے بام عروج تک پہنچایا اور اس کا بھی اتنا ذخیرہ ہے جو غزلوں سے کم نہیں ہے چند رباعیاں سنئے۔

یا رب خلاق مہر و ماہی تو ہے — بخشندۂ تاج و تخت شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق — دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں — یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے — حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے — پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے — غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا — کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس — جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں — جو دام سے بچ گیا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیس — جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو — آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
قربت رگ جاں سے اور یہ امید بعد — اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

قصیدہ

دور اول کے شعرا یعنی ناسخ و آتش نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔
دور دوم میں ناسخ کے شاگرد فقیر محمد خاں گویا نے پانچ چھ قصیدے لکھے ہیں مگر انھیں قصیدہ کہنا مشکل ہے۔
آتش کے شاگردوں میں نواب سید محمد خاں رند نے ایک بلند پایہ قصیدہ لکھا ہے جس کی تشبیب یہ ہے :-

حسن بے ساختگی سے ہے کچھ عارض گل سے معمور / رنگ رخسار بتان عنبرۂ خوبی سے معمور
فیض ہے باد بہاری کے کرم کا امسال / آہ بلبل کے بھی شجر سے گل تاثیر ظہور
قوت نامیہ کے نشو و نما کے باعث / دانۂ اشک بھی سرسبز اُگے ہو گیا دم
پشت طاؤس بنا سبزے ہوا لب کو سو / دامن باد صبا سبزہ و گل سے معمور
جو ہے جوش طراوت یہاں زمانے میں رہا / کیا عجب زخم کا بھی سبز اگے ہوا انگور
لعل نے رنگ زمرد کا کیا ہے پیدا / سبز زنگار کے مانند ہوا ہے کافور

دور سوم میں منشی اسمٰعیل حسین منیر نے ایسے قصیدے بھی کہے ہیں۔
جن کا مثل نہیں خاص طور پر ایک قصیدہ تو ایسا ہے جیسا سودا ذوق غالب اور مومن بھی نہ کہہ سکے اس کی شان نزول یہ ہے کہ مولوی فضل حق خیرآبادی اور منیر دونوں کو عبور دریائے شور کا حکم ہوا وہاں دونوں ایک ساتھ رہتے تھے
ایک دن مولانا نے منیر سے کہا کہ مصطلحات نجوم اور کتابیں فرس کیوں نظم نہیں کیے جاتے یا تو اردو اس کی متحمل نہیں یا تم میں کوئی اس پر قادر نہیں سودا نے قصیدے کہے ہیں مگر وہ بھی اس راستہ پر نہ چل سکے۔
منیر نے پہلے تو کچھ دشوار پایا نہیں مگر مولانا کی بات پر جمے رہے آخر انھوں نے انھیں اسی رنگ میں ایک قصیدہ (۱۵۰) اشعار کا [illegible] علیہ السلام کی مدح میں کہا جس کی تشبیب [illegible]

قصیدہ امام حسنؑ کی مدح میں

اشک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن — غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن

آمد روز سیاہ زیر جبیں بندہ گئی — آمد و زوال زردی تنش کمیت ہمن

چاہ سیہ میں گرا یوسف زریں قبا — دیو سیہ ہو گیا شاہد پرویں پھرن

بال پشہ نیمروز لب کہ ہوا گم ہما — زنگیوں کے بالوں سے بدلی ہنری گرن

خیمہ زر باف میں لیلی مشکیں قباس — زینت خانہ میں سیر شمع صبح لگن

پنجہ کف الخضیب شانہ گیسوئے شب — سرمہ چشم نجوم مشک غزال ختن

خندہ دنداں نمائے شب نے کیا — تخت سلیماں ہوا تکیہ گہ اہرمن

گنبد فیروزہ میں چھوڑ کے تابوت کو — دختر کان تبسم بھرنے لگیں خندہ زن

لالہ داغ پلنگ تھی شفق آسماں — دیکھا دبرج رقیب کبک ہوا سینہ زن

خسرو اقلیم جنت قصر ششم میں مکیں — ہندو بالا نشیں صرف بت دربرہمن

ترک کماندار نے تیر کیا زیب قوس — زینت دست سماک نیزہ خاور شکن

دیدہ زمرد نگار منظر اختر شمار — کرنے لگا آشکار صورت صد اوش

صوفی ازرق لباس اپنی بغل میں لئے — اوڑھ لے الماس پوش شاہد بابل ذقن

نظم نظامی ہوئی خمسہ حیرت زدہ — فلک ہلالی ہے اختر بمد بحر سخن

تیر شہاب و شعاع خوب نکلے دیر تک — ناوک ارجن ہوا مرکز کاف کرن

خوشہ کے ہر دانہ نے پائی یہ نشو و نما — برطہ کے ہوئے تحمل لحد مثل خیار ہن

تا جگر تیر سرخ ناوک دندان فیل — سرخود بیاض آگئی تا جگلی ہن

آئینہ خاوری چشمۂ بے آب تھا — حلقۂ سیمیں ہوا شمع سحر انجمن

جلوہ گر بام سبز طائر سیماب گون — زاغ سیہ کا شکار مرغ طلوع بدن

خضر زمرد لباس صاحب سبت کلیم — زیب مصلائے سبز بولی بابل وطن

دورِ سوم میں امیر مینائی نے دو قصیدے کہے انہیں نظم کہنا زیادہ صحیح ہے ہاں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی اور مرزا رسوا نے بہت زوردار قصائد کہے مرزا رسوا کا کوئی قصیدہ ہمارے پاس نہیں نظم طباطبائی کے ایک قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو۔

کیا تماشا ہے کہ رہی ہے دیکھ چشم روزگار
کیا شرارے بھر رہا ہے الجھ مطلعِ لیل و نہار

پردۂ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر
ناقۂ گردوں کی کھینچی لیلیٔ شب نے مہار

ہے شفق یا وادیٔ فیروزہ گوں میں لالہ زار
ہے سحر یا سبزہ زارِ آسماں میں انتشار

چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا نکلا ہے تار صبح کا
یا اٹھا گوشِ زلیخا میں ہے درِّ شاہوار

آفتاب آیا نظر زیرِ گریبانِ افق
ہو گئی غائب شبِ ابلق ہوا صبح آشکار

آتش افروزی جو کی مشرق میں صبحِ سحر نے
ہو گیا مغرب میں پنہاں ساقی دار

شعبدہ گر نے یہ کی افسوں گری
مہرہ مشرق میں اگل کر

یہ سحر ہے یا کہ ہے رنگِ لبِ غنچہ ہائے سرخ
یہ شفق ہے یا کہ ہے خونِ رگِ ابرِ بہار

ہو گیا فیضِ سحر سے چیر گردوں جنگجو
بن گئی لطفِ ہوا سے کہکشاں جوئے کنار

حور کا دستِ نگاریں ہے کہ ہے کف
آ رہی ہے یا نظر آیا ہے یہ رنگِ عذار

خوشۂ گندم ہے یہ یا صندل کفِ عذرا ہے صبح
گوندھنے کی ہاتھ میں لی ہے زلف

حسن کا جلوہ دکھاتی ہے یہ صبح جانفزا
جس کے گھونگھٹ سے سفیدہ صبح کا ہے آشکار

الشمس اس کے زیرِ پا ہیں مشعلِ نور کی
نکلی ہے چادر سے آبِ زر کی یہ عذار

چشمۂ خورشید میں غوطہ لگا گئی یہ بھیر
گنبدِ نیلوفری پر کوئی دم لے کر قرار

دیکھا ابھی محوِ تماشا تھی کہ کچھ کم رہ گئی
جلوۂ انجم ہو گیا یا رقصِ شرار

صبح ہوتے خیمۂ زنگار یوں آیا نظر
تھا طلسمِ سیمیائی گنبدِ گوہر نگار

ہو گیا لشکر یہ غالب ایک مہ کہ تیرہ دار

پھینکتا ہے بامِ گردوں پر کمند اپنی کرن!
کرتا ہے تیرِ شعاعی طائرِ زہرہ شکار

قصیدہ

اس دور کے شعرا میں آرزو صاحب کا قصیدہ ہمیں نہیں ملا۔ ایک صاحب نے عزیز و محشر کے قصائد کا مجموعہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر کئی تقاضوں کے بعد بھی ان کا وعدہ پورا نہ ہوا! بقول مولانا صفی ؎

وعدے میں حاتم ہیں جب دینا پڑے قارون ہیں

ایک صاحب کا میں شکر گذار ہوں کہ انھوں نے زحمت اٹھا کے اور پیسہ خرچ کر کے عزیز و محشر کے ایک ایک قصیدہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی عنایت فرمائی یہ انتخاب اُن کا ہے اگر مجھے وہ دیوان دیدیتے تو میں عزیز کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس کے مطلع کا دوسرا مصرع یہ ہے ؎

لہو کچھ بڑھ گیا جب فصد دیوانوں نے کھلوائی

اور محشر صاحب کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس میں جنگ خیبر نظم ہے اور بلاغت استدلال میں مطلع ہے ؎

رہا بیدار کس کی گرمیِ محفل سے یہ شب بھر   لیے چشم رمد آلود نکلا خسرِ خاور

یہ ان کا شاہکار ہے اور اردو میں اس کا جواب نہیں مجبوراً اپنے کرم فرما کا انتخاب پیش کرتا ہوں۔

دورِ آخر کے شعراء میں مرزا جعفر علی خاں اثر نے بھی بڑے زوردار قصیدے لکھے ہیں مگر مجھے دستیاب نہیں ہوئے۔ انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔

مولانا صفی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ میرے پاس ہے جو پیش کرتا ہوں۔

قصیدۂ مدح امیر المومنین علی ابن ابی طالب

جلوہ پرست حسن ہیں شکر ہے کردگار کا
ہم جو ٹھہرے سرک گیا پردہ حریم یار کا

پھر وہی چشم شوق میں مستی سی دوڑنے لگی
دور چلا رگوں میں خون پھر دل بیقرار کا

لطف نگاہ ناز سے مستی عشق بڑھ گئی
دل پہ فریب چل گیا نرگس پر خمار کا

موج شمیم زلف ادھر بن کے کمند الجھ گئی
کس سے کہوں کہ اب نہیں [illegible] کا

جوش جنوں کی منزلیں ہم کو ہیں طے کر برق [illegible]
[illegible] کا

منظر کو دیکھ کر بیٹھ کے کیوں نہ رو دیئے
ساز جنون عشق سے زمزمہ آبشار کا

اہل نظر کی آنکھ سے خون جگر ٹپک پڑا
نقش مزار دیکھ کر کشتۂ انتظار کا

خاک نشین راہ عشق کر اٹھے تو لوٹ گئے
ایک تتق بندھا ہوا ہے یہ فلک غبار کا

لپٹے انجیر کے گر پڑے دامن گل سے پھر چلے
چلی کے جھٹک گئے جہاں نالہ سنا ہزار کا

دیر سے تا بہ میکدہ جیتے کہاں نہیں گئے
خوب لئے پھرے ہیں شوق رخ نگار کا

صحن حرم میں شک کے بت بیٹھے بقصد میکشی
پھرنے لگا نگاہ میں میکدہ چشم یار کا

سوچے حبیب کبریا دیکھا ہے کوئی تو
آنکھوں میں خط کھنچا ہوا سرمہ انتظار کا

چوس رہا ہے دیکھنا کون زبان رسول کی
ذائقہ لے رہا ہے کون لقمۂ [illegible] کا

بعثت اسد کا لاڈلا ختم رسل کی گود میں
پھینک رہا ہے ہاتھ پاؤں جن کو نہیں قرار کا

یہ جو ہمک ہمک کے آج باندھ رہا ہے جبرئیل
فتح کرے گا کل یہی معرکہ گیر و دار کا

کھلتے ہی چشم مراد کعبہ جھک گیا تمام
کیوں ہے اس صبح کا یہ تا قدم [illegible] کا

گلشن ہاشمی کا پھول اس کے گلے کا ہار ہے
جانتا ہے جو رکھ رکھاؤ اپنے گلے کے ہار کا

جس کی ہتھیلی کو اس طرح چوم رہے ہیں مصطفےٰ
چومنے کا یہی ایک دن قبضۂ ذوالفقار کا

کھو دو عصائے موسوی بن گئے ہیبت اژدہا
عہد میں امتحان کے قوت شیر خوار کا

ہاتھوں میں بھرا ہوا دلی رگ و تیغ [illegible]
ہیبت شکنی کا ولولہ حوصلہ کارزار کا

ابرؤوں کو جو دیکھیے کہتے ہی بل پڑے ہوئے
ناخنوں میں چھپا ہوا رنگ کشود کار کا

انگلیوں کی ہر ایک پور نور میں ہے بھرا ہوا
در کو اکھاڑ لیں اگر در نہ کھلے حصار کا

شیر خدا کے سامنے لائے گی گھیر کر اجل
خیبریوں کو دو خبر حفظ کریں شکار کا

بحر کرم وہ ہاتھ ہیں جس کی سخا کے جوش کو
روک سکا نہ سلسلہ ناقۂ صد قطار کا

شان بتان آزری مائل بت شکنی ہے کیوں
دیگا انہیں یہی سبق ایک دن انکسار کا

گھر میں خدا کے بیٹھ کے کی ہے خدائی اتنے دن
بت شکن آ گیا ہے تو راستہ لو فرار کا

دیکھو یہی قدم ہیں وہ جو سر دوش مصطفےٰ
نقش جما سکیں گے یہ تم بھی سکہ اعتبار کا

جلوہ اسی ستارہ کا آئیگا جا بجا نظر
سیر فلک کرے گا جب چاند حرا کے غار کا

شجرۂ طیبہ ہے ایک جس کی ہیں جو لوف ڈالیاں
دل کی طرح ملا ہوا سلسلہ برگ و بار کا

مصلحۃ رسول جب جا بجا ہی گئے اسکو چھوڑ کر
دیگا یہی تو امتحاں ہمت استوار کا

بحث نصیریوں کی ہے کیا انہیں بھی ہے شک نہیں
ذات علیؑ ہے آئینہ قدرت کردگار کا

ماہ رجب کی تیرھویں یوم ولادت امیرؑ
کوثر نیوں میں دور ہے بادۂ خوشگوار کا

ساقی نازمست ہاں دور چلیں کہ وقت ہے
مطرب جانواز اب وہ چھیڑے بہار کا

مست بچھے پڑے ہیں باغ میں بعد جبیں یار کے
سبزے کا فرش ہے بچھا خیمۂ زر نگار کا

دام نظر وہ جا بجا گلبنوں میں ہیں جھولتی
بیچ میں اک جما ہوا آئینہ جوئبار کا

گل ہمہ تن جو گوش ہیں سنتے ہیں نغمہ طیور کے
قصہ زبان موج ہے کہتی ہے آبشار کا

دیکھئے سیر دور دیکھ کے دیتے ہیں ہمت
آگ لگی ہوئی ہے ایک نخل نہیں چنار کا

دیکھ لے اک لباس میں آتش و آب جمع ہیں
لوٹ سکے جو باغباں بجھ بھی طلسم نار کا

بادہ کشان انجمن جوش طرب سے نعرہ زن
دوڑتے پھرتے ہیں حسن حاشیۂ سبزہ زار کا

آتے ہی بنتے شیر حق مست لائیں شاہ کا نام
جھونکا ہر ایک بسر دے کے تری کنار کا

دشمن تمہارا خشک ہو ریشۂ دوانی بہار
اب جو ملے عصا بسیخ دستہ ہے ذوالفقار کا

طرزِ عمل بدل لیے نقشِ نگیں نے ترے
رنگ کچھ اور ہو گیا صفحۂ روزگار کا

ذرّوں کو جلوہ مہر کا شہرتِ عام نے دیا
تنگ نظر مگر وسیع دائرہ اشتہار کا

دیکھ چکے ہیں جو صفی معجزۂ پیمبری
ان کی نگہ میں کیا جچے شعبدہ ذوالفقار کا

کور سوادِ امتیاز ایسے بھی ہیں جہان میں
کرتے ہیں جو مقابلہ جلوۂ نور و نار کا

دوست کسے بنائیے محرمِ راز کون ہے
کس کو یہاں دکھائیے سینۂ داغدار کا

آئی خزاں بہار میں رنگ سے بس چمن گیا
سرسبز چمن تھا جو گل مری قبا خار کا

اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ کیجیے کیا سخنوری
سہل نہیں سواد ناظرۂ تابدار کا

خانۂ دیں کو جلا دیا جوشِ سکوت نے تجھے
پھر بھی چراغِ راہ ہے نقش مرے مزار کا

خمکدۂ غنچہ کا بادہ کش قدیم ہوں
دوش بدوش طور ہے پایہ نئے فار کا

لالہ گل فشاں نہیں تشنہ کو بھی سخن ہے یہ
پست و بلند شعر ہے سلسلہ کوہسار کا

حد سے ہے لیلیوں کی بھی عرش تک جھوم چلے صفی
ہوگا بلند اور ابھی کیا علم افتخار کا

پھیر گئے داستان فخر طول بہت دیجیے
سازِ سخن کی جان ہے زمزمہ شہسوار کا

دستِ دعا اٹھا ہے چشمِ کرم ہے منتظر
نقشِ اثر بٹھائیے سکۂ اعتبار کا

جب تک الٰہی ابر میں جلوہ فروز ہے کبھی
ابر ہے میرِ کارواں قافلۂ بہار کا

مخلص سبز کار کا مزرعِ دل ہرا بھرا
خرمنِ آرزو تباہ خصم سیاہ کار کا

محشر لکھنوی

در مدحِ امیر المومنین علی

نہ پوچھ اے ہمنفس ہنس ہنس کے اُس نے لذّتِ شادی
بنا رکھا ہو جس کو دل کی بیتابی نے فریادی

مآلِ کار ہم سنتے ہیں ہم اچھا ہی ہوتا ہے
مگر تا چند آخر مجمعِ حسرت کی بربادی

خدا جانے کہ ہو کب شادِ مقصد کا نظارہ
خدا معلوم کب ہم کو ہو قیدِ غم سے آزادی

ابھی تو ہم ہیں اور خونِ گشتہ دل آغوشِ حسرت میں
ابھی یہ آسمانِ پیر ہے اور زورِ جلادی

قدم جس وقت راہِ مدعا کی سمت اٹھتا ہے
دکھا دیتی ہے قسمت دور سے زنجیرِ فولادی

کہاں تک جوئے شیرِ نا امیدی کی کھدائی میں
کہاں تک بیستونِ غم پہ سر کوبی و فرہادی

قدم گھر سے نکلنا چاہیے اے دورِ منزل
بسا دو شہر پھر ہو گا ویرانوں کی آبادی

صدائے الرحیل اپنے سنیں بیتابیٔ غربت
ہمارے کان کو بانگِ جرس ہے نغمۂ شادی

خوشی دلربا یعنی رنجِ غربت نمک عاشق
نسیمِ قسمتِ طوبیٰ سے چھوٹ کر آیا جوازِ

ملال انگیز ہے صبحِ وطن اہلِ محبت کو
مزے سے بیٹھنا اچھا جو آئے شامِ بربادی

نقابِ رخ اٹھائے جبکہ مہرِ آسماں پیما
گرے بیٹھا ہوں میں تڑپ کے قلبِ فولادی

چلوں خونابۂ قلب و جگر سے ہاتھ منہ دھو کے
کروں طے شوق سے میں منزلِ الفت ہر اک وادی

شکستہ میری ٹھوکر سے ہو سنگِ راہ ناکامی
ہٹا دوں ہو اگر سدِّ سکندر کو وہ بربادی

کروں اپنی سعی کوشش پھر تو جذب ہے دل اور منزل
وہ منزل قیدِ غم سے جس جگہ ہوتی ہے آزادی

وہ منزل نقشِ اول جو نگارستانِ عالم ہے
سراسر جس سے روشن صنعتِ قدرت کی استادی

وہ منزل خلد کہئے جس کو یا عرشِ بریں کہئے
دلِ غمگین کی خاطر وقف جس جا عشرتِ شادی

وہ منزل جس جگہ دامانِ امید آکے بھر جائے
مرادیں دل کی خاطر خواہ پائے ہر ایک فریادی

وہ منزل مرکزِ امن و اماں جو دورِ عالم کی
جہاں تیرِ ستم کو دورِ آسماں کا زورِ جلادی

وہ منزل جو زمیں سے آسماں تک نور برساتی
جہاں انسان کے بدلے فرشتوں کی ہے آبادی

وہ منزل ملا تو سے آج تک جس کے تصور میں — بتاں کعبہ پتھر بن گئے یوں کھو لے گیا دی
تعالی اللہ وہ منزل جس کو لب نجف کہئے — اسیران گنہ کو جس جگہ حاصل ہوی آزادی
وہ منزل آستانہ جس کو باب علم کا کہئے — کہ جن کا گردن جبریل پر ہے حق استادی
وہ باب علم یعنی شوہر بنت رسول اللہ — کیا تجویز جس کو خود خدا نے ہر امدادی
وہ داماد قوی بازو نصیر احمد مرسل — رگی زور ملائک ہے نہ جس کی تیغ فولادی
وہ فولادی حسام برق آسا جس کی ضیا بار — بے اہل ضلالت بن گئی تھی رہبر ہادی
وہ ہادی کفر کے ظلمات سے جس نے ہزاروں کو — نکالا اور عطا کی مجلس دوزخ سے آزادی
وہ آزادی کہ جس سے اب ہزاروں کو جنت میں — تصدق انکی ہر اک آرزو پہ عشرت شادی
بنایا کل جن و انس و ملک کا آپکو ہادی — زہے قدر خوشا صنعت کہ عالم کی کہ استاد
وجود ذات حضرت سے ہوا آباد سر تا سر — طلسمات جہاں تھا ورنہ اک تصویر بربادی
اٹھادے آپ کا الطاف اگر رسم دل اللہ — نمونہ زلف حسینان جہاں سے کار صیادی
شجاعت آپکی جب یاد آتی ہے غلاموں کو — تو پھرتی ہے نگہ میں خیبر و خندق کی بربادی
دم اظہار قوت بھی مراعات کرم کی تھی — دل دشمن نہ توڑا توڑ ڈالا باب فولادی
دکھائیں آپ اگر کچھ شائبہ نور امامت کا — تو اکھڑے قلعہ ارض و سما کی خشت بنیادی
مرا ذمہ جو کوئی روک لے پھر باب جنت پر — در مشکلکشا پر ہوا گر شداد فریادی
یہ پہلی آپکے قدموں کی برکت تھی زمانے میں — کہ اجڑا گھر بتوں کا اور ہوئی کعبے کی آبادی
نجف کی خاک میں ملجائیں تو حاصل ہو جبھی — بگولوں کو اسی دشت میں ہے شوق بربادی
جوادی شحنہ عدل شہ والا کا ایما ہو — نہ لے مریخ پھر صبح ابد تک نام جلادی
ید اللہی دکھائی آپنے یوں جنگ خیبر میں — کہ توڑا کفر کے رشتے کیصورت باب فولادی
ہوا جب بند وہ سے عقد شور اٹھا ملائک میں — مبارکباد یا حیدر رسول اللہ کی دامادی
نکالیں حسرت ظالم سے جو مولا دل شکستہ کو — ہلادے گنبد دور فلک کو نعرہ شادی

محیط الفت میں کشتی شکستہ غرق ہوتی ہے
پکاری شانِ اسلام انکی پیدائش پہ کعبے میں
عدالت اس کو کہتے ہیں یہ ہے لطفِ ید اللّٰہی
طریق راستی کر دیں جو تعلیم آپ ارشاد سے
کیا جنت کو آزاد آپ نے اسلام پھیلا کر
شریک کاروانِ لطفِ حضرت ہو اگر آدم
قدم فرما کہاں تک وادیِ مدحت میں اے محشر
بامید دعا منہ میں زبانِ خامہ کی صورت سے
مبارک ہو کہ اٹھے پردہ ہائے نامرادی بھی
خداوندا مرے شوق دلی کی پھر حنا بن کر
ہوا میں اڑ کے واں کی خاک پھر کحل البصر ہو جائے
پڑھوں پھر میں قصیدہ مدحِ بابِ علم میں جیسے

ملی یونس کو بطن حوت زنداں سے یہ آزادی
اسی بچے کے ہاتھوں سے بتوں کی خاک بربادی
کہ کاٹیں دستِ ساق اور نہو اسکی کہیں بیدادی
فلک سا دشمن عالم بھلا دے اپنی بیدادی
دگرنہ پہلے دنیا بھر میں تھی تقلید شدادی
جرس وقت سفر بیتاب بن کر ہو نہ فریادی
نہیں زیبا ہے پابند ادب گو اتنی آزادی
تجھے اے شوق دکھلا دو سخن کا طرز استادی
خدا لو کشف کا نام لیکر اب ہو فریادی
زیارت ہے نجف کی پھر مجھے سو عید و شادی بھی
زمیں پر پھر دکھا دے مجھے جنت کی آبادی
صدائیں غیب سے آئیں کہ یہ ہے شانِ استادی

عزیز لکھنوی

سبحۂ نور

ضبط کی جو کوششیں تھیں سب وہ رخصت ہو گئیں
اب نگاہیں بھی مری نغمۂ محبت ہو گئیں!

پھر جو لیں شوق نے پیمائی دل وارفتہ ہے
پھر نگاہیں سلسلہ جنبانِ وحشت ہو گئیں

اک نگہ نے ہر دماغ و دل پہ قبضہ کر لیا
بلکہ یہ داخل جو چیزیں تھیں امانت ہو گئیں

بے اثر جن کو سمجھتے تھے تم اپنی بزم میں
جذبۂ دل کی وہی باتیں کرامت ہو گئیں

بے حقیقت آ گئے تھے ہم تو سامانِ نمود
پھر فراہم ہو کے یہ شکلیں قیامت ہو گئیں

خوگرِ غم یہ کس طرح ہو گئی مجھے چارہ گر
عادتیں جب بڑھ گئیں سنتے ہیں طبیعت ہو گئیں

جا کے بزمِ حسن میں کچھ آئنے حاصل کریں
وہ نگاہیں جو سبق آموزِ عبرت ہو گئیں

دیدۂ انجم نے ڈالی کیوں اسطے اب نگہیں
ساری بوندیں خون کی نذرِ محبت ہو گئیں

وہ نگاہیں جو تھیں کار بعد التفات
دل کی رگ رگ میں سمٹ کے ایسے جا ہو گئیں

دل جو باتیں ہو رہی تھیں تخلیہ میں بیٹھ کر
اب وہ شرحِ دفترِ رازِ محبت ہو گئیں

خوشی میں دل کے نکلی تھیں جو آوازیں ترنم
وہ صدائیں نغمۂ سازِ حقیقت ہو گئیں

میرے دل کا اک شگاف اور کعبہ کی دیوار کا
دونوں درزیں راہ بابِ شہرِ حکمت ہو گئیں

روی وجہ اللہ میں مخفی جو تھیں رمزِ ازل
اب وہ تنویریں فروغِ بزمِ صورت ہو گئیں

فاطمہؑ بنت اسد کو دردِ زہ عارض ہوا
آ گئے حوریں خلد سے سرگرمِ خدمت ہو گئیں

شمعِ بینائی کی لو جب سے زیادہ بڑھ گئی
رخ کی تنویریں چراغِ بزمِ قدرت ہو گئیں

جس نے دیکھا آنکھ بھر کر نورِ عین اللہ کو
دونوں آنکھیں ساغرِ صہبائے وحدت ہو گئیں

دیکھ کر رخسارہ وجہ اللہ غش آیا مجھے
رخ کی تنویریں دلیلِ ردِ رویت ہو گئیں

جو لکیریں آپکی پیشانیِ اقدس پہ تھیں
اب وہی فرمانِ تبلیغِ رسالت ہو گئیں

خسرو اسلام نے جب گود میں اپنی لیا
معبد اسلام ہے اب مسقط الراس علیؑ
پھر علی اللہ ہوتے کیوں نہ ہو معبود وہ
جتنی بیداد کی تکلیفیں اٹھائیں آپ نے
ابتدائی عمر سے لیں جتنی سانسیں آپ نے
وہ غذائیں جو جناب مصطفےٰ سے پائیں تھیں
نفس کا اپنے امین اللہ نے اُن کو کیا
شیر ہے بنت اسد کا کیوں نہ ہو شیر خدا
مختصر تاریخ حال مصحف ناطق ہے یہ
ہے ابھی سے رعشہ بر اندام مہر نیمروز
کعبے کی یہ نیکتیں اسلام کی یہ

سب ادائیں چہرہ کی جانِ سیادت ہو گئیں
جتنی راہیں کعبہ کی تھیں سب وہ جنت ہو گئیں
رفتہ رفتہ جس کی باتیں تک عبادت ہو گئیں
اب سبب ہجرت وہی سب باعثِ راحت ہو گئیں
وہ ذخیرہ ہو گئے سب نفسِ رسالت ہو گئیں
ہو گئے سب جزو بدن جزو طبیعت ہو گئیں
فاطمہؑ لو حامل بار امانت ہو گئیں
جتنی بوندیں حلق سے اتریں شجاعت ہو گئیں
جتنی باتیں اس لئے تھیں جزو امانت ہو گئیں
رنگ رنگینی گردشیں تمہید حجت ہو گئیں
اے علیؑ سب تیرے قدموں کی بدولت ہو گئیں

نظم

میر دوست علی خلیلؔ

کوئی ساٹھ برس سے ایک صنف سخن کی حیثیت سے نظم اُردو ادب میں داخل ہوئی ہے اس کی کوئی خاص ہیئت نہیں ہے نہ کوئی مخصوص موضوع ہے۔ مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس سب میں کہی جاتی ہے اور موضوع کے لحاظ سے ہر طرح کے خیالات و مناظر پیش کیے جاتے ہیں مگر حقیقت میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اُردو شاعری کے ساتھ اس کا وجود پایا جاتا ہے، قطب قلی شاہ کے دیوان میں بھی اس طرح کی نظمیں موجود ہیں اور ولی کے یہاں بھی، شمالی ہند میں میرؔ و سوداؔ، نظیرؔ اکبر آبادی سب نے نظمیں کہی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسے ایک مستقل صنف نہیں سمجھتے تھے ہیئت کا لحاظ کرتے تھے مثلاً اگر مثنوی کی طرح کے اشعار میں برسات کی کیفیت نظم کی ہے تو وہ اسے مثنوی کہتے تھے اور اس کا عنوان قائم کرتے تھے "مثنوی در موسم برشگال" اگر مسدس میں ہے تو مسدس در موسم برشگال۔ اب مثنوی یا مسدس کو حذف کر کے صرف موضوع لکھ دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ بہار، برسات، پہاڑ اور گھبری وغیرہ چاہے وہ ہیئت کے لحاظ سے کسی صنف میں ہو اتنے سے تغیر سے ایک نئی صنف بن گئی۔

لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے زمانے سے (جب سے لکھنؤ شاعری کا دور شروع ہوا) ایسی ایسی نظمیں کہی گئیں جن کا مثل اُردو میں نہیں ہے۔

دور اول کے شعراء میں میر دوست علی خلیلؔ کی ایک غیر مطبوعہ نظم ایک ہم قلمی بیاض سے پیش کرتے ہیں، جس کا موضوع گو قدیم ہے اس کا عنوان خلیلؔ نے طلسم ہوشربا رکھا ہے اس لیے ہم بھی یہی سرخی رکھ کر پیش کریں گے۔

طلسم ہوشربا

مردمِ چشمِ حسینانِ جہان ہے افیون　　غیرتِ خالِ رخِ حورِ جناں ہے افیون
طفل بھی مرتے ہیں جس پر وہ جواں ہے افیون　　زرفہ معجونِ عجب روحِ رواں ہے افیون

اس قدر عاشق شیدا ہیں جہاں میں اسکے
یہ وہ لیلیٰ ہے کہ مجنوں ہیں زن و مرد اسکے

اس پری زاد کے القاب کروں کیا میں بیاں　　حاکمِ مملکتِ ہند و حبش کی سلطاں
مستی کوہ سرورِ آتشِ موسیٰ کا دھواں　　مرہمِ زخمِ دلِ عاشقِ بیتاب و تواں

بیشتر بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے
لوگ معشوق سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے

کوئی ساون کی گھٹا کہتا ہے کوئی ظلمات　　کوئی لیلیٰ اسے کہتا ہے کوئی وصل کی رات
اس کی تلخی میں بھرا ہے مزۂ قند و نبات　　اسی معجون کی تاثیر میں ہے موت و حیات

وہ نہیں ہے کافر و دیندار کے الفت اسکی
سنگِ اسود سے سوا کرتے ہیں حرمت اسکی

لیلۃ القدر اسے کہتا ہے کوئی انساں　　کوئی کہتا ہے اسے سجدۂ عابد کا نشاں
مشک کہتا ہے کوئی کوئی دوائے خفقاں　　کوئی گلدستۂ سوسن کوئی مجلس خزاں

ہے عجب ہوش ربا خلق میں نیرنگ اس کا
سنگِ موسیٰ ہے بدن لال ہے پر رنگ اس کا

یہ وہ ہے قوتِ دل راحتِ جاں نورِ نظر　　دیدۂ عاشقِ بیتاب میں ہے اس کا گھر
نہیں چھپتا نہیں چھپتا ہے کبھی اس کا اثر　　دیکھ لو دیکھ لو پردہ جو نہ ہو آنکھوں پر

آنکھوں میں اس کی عجب جلوہ گری ہستی ہے
انھیں دو شیشوں میں یہ ایک پری ہستی ہے

ہے خجل اس کی رسائی سے کمند افکار واں پہنچتی ہے جہاں وہم کا بھی ہو نہ گزر
برق کی طرح نہیں ایک جگہ اس کو قرار خلوت خاص کی پابند نہیں یہ عیار

کون سا عضو ہے جس میں نہیں گھر کرتی ہے
روح کی طرح سے رگ رگ میں گزر کرتی ہے

ہاتھ لگ جانے سے ہوتے ہیں جو شاد اس کے مرید جانتے ہیں اسے شاید وہ ضیائے شب عید
یا سمجھتے ہیں اسے قفل در دل کی کلید آنکھیں کھل جاتی ہیں کرتے ہیں جو اس شوخ کی دید

جان کر آب حیات اس کو بشر پیتے ہیں
جو نہیں مرتے ہیں اس پر وہ عبث جیتے ہیں

اس کی گولی سر لیتاں سے حسینان جو اس کے غمزے سے ہے خجل دلبر کمسن کی ادا
ہوش اڑاتی ہے ارسطو کے جو ہو وصل ذرا ... پڑھا نہیں گیا . . . . .

ایک دم قید سے اس کی جو نہیں چھوٹتے ہیں
بے خودی کے وہی دنیا میں مزے لوٹتے ہیں

کیا پری زاد ہے کیا حور ہے یہ ہوش ربا دل زاہد میں ہے ایماں کی طرح اس کی جا
کچھ اکیلے نہیں دیندار ہی ہیں اس پہ فدا اس شب قدر کے کافر بھی ہیں مشتاق لقا

یہ حسیں وہ ہے کہ ہے غافل و ہشیار کی جاں
اس پہ جاتی ہے مر اک کافر و دیندار کی جاں

اس چھلاوے کے نرالے ہیں جہاں میں انداز کہیں جادو ہے کہیں سحر کہیں شعبدہ باز
اسی سلطان کے ہیں بگڑے دل محمود و ایاز بے خبر رہتے ہیں اس شوخ کے سب محرم راز

نہیں کھلتا ہے کہ بند آنکھوں سے کیا دیکھتے ہیں
دیدۂ دل سے مگر شان خدا دیکھتے ہیں

جام دل اس کی محبت سے اگر ہو معمور دائم الخمر رہے بادۂ گلگوں سے نفور

پاک طینت ہے یہ دنیا میں نجاست سے بہت دور   اس کے مشتاق سے ہوتا ہی نہیں فسق و فجور

اس سے گمرہ نہیں ہوتے کسی مذہب میں
صورت آب طہوراں پاک ہے ہر مشرب میں

سانولے رنگ کا جلوہ ہے عجب ہوش ربا   دم پھڑکتا ہے شب و روز سیہ چشموں کا
سحر ہے ناز و ادا قہر بلا ہے غمزہ   بد مزاجی بھی ہے اس شوخ کی خوبی سے بھرا

حسن ہے خوب تہ گنبد افلاک اس کا !
دل سے بھاتا ہے کریموں کو بھی امساک اس کا

اس کی صورت پہ جو آتا ہے ہر ایک شخص کو پیار   تیرگی اس کی ہے شاید کہ سواد خط یار
تجلی اس سے ہے چمن میں خط سوسن کی بہار   دود ماں اس کا ہے شام شب گیسوئے نگار

دل میں جا دیتے ہیں عشاق جگر ریش اسے
کالکا جانتے ہیں کافر بد کیش اسے

یہ وہ محبوب ہے اس کا ہو اگر کوئی جمال   آدمی زاد میں پیدا ہوں فرشتے کے خصال
نہ ہوس کھانے کی رہتی ہے نہ پانی کا خیال   اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں جو پائے وصال

اس سے صحبت جو تہ گنبد افلاک رہے
جُرم عصیاں سے فرشتوں کی طرح پاک رہے

مختلف عشق و محبت سے ہوئی اس کی تاثیر   نوشدارو ہے کسی کو تو کسی کو شمشیر
ہے کہیں ابر غضب اور کہیں ابر مطیر   سپر تیغ الم قوس اجل کا کہیں تیر

نہیں کھلتے ہیں کسی شخص پہ پھر رنگ اس کے
گردش چرخ سے ملتے ہیں بہت ڈھنگ اس کے

یہ وہ ہے پیر طریقت کہ جو ہو اس کا مرید   ماسوی اللہ سے اک آن میں وہ ہو جائے بعید
بسکہ رہتی ہے اسے نفس کشی کی تاکید   کیا عجب ہے جو خدا زیست میں دے اسے عید

مثلِ شمشیرِ اجل قاطعِ لذات ہے یہ
واہ کیا صاحبِ اعجاز و کرامات ہے یہ

نشۂ عشق سے اس شوخ کے جو ہیں سرشار   عابد و زاہد کے مانند ہیں شب بیدار
اول شام سے تا صبح یہ ہے ان کا شعار   خوابِ راحت کو نہ آنکھوں میں جگہ دیں زنہار
چشمِ انجم کی طرح شب کو نہیں سوتے ہیں
اس کے عشاق بھی خاصانِ خدا ہوتے ہیں

یہ عجب مرشدِ کامل ہے عجب ہے رہبر   سرکشی کا نہیں کوچے میں کبھی اس کے گزر
اس کے پیرو جو ہیں آفاق میں وہ شام و سحر   سجدۂ حق میں جھکائے ہوئے رہتے ہیں سر
اپنے دورے میں نہیں سرکشی اس کو بھائی
جام کے سامنے صراحی نہیں آنے پائی

پاکبازی میں یہ پہنچاتی ہے عشاق کا حال   حور سے بھی نہ کسی بات کا ہو دل میں خیال
قاف سے لاکھ پری اڑ کے کرے غنج و دلال   کھول کر آنکھ بھی دیکھیں نہ کبھی اس کا جمال
خوبرو ناز و ادا سامنے دن رات کریں
خواب میں بھی رغبت کی نہ یہ بات کریں

اس جفا جو سے کبھی دل کو لگائے نہ بشر   اس کے سایہ کے تصور سے کرے شخص حذر
اس کا دشمن کے بھی گھر میں نہ الٰہی ہو گزر   زہر دیتی ہے یہ جس شخص پہ کرتی ہے اثر
اور ڈستی ہے محبت میں یہ ناگن کی طرح
دوستوں کا یہ لہو پیتی ہے دشمن کی طرح

اس کی چاہت کی پڑے گردنِ دل میں جو کمند   ایک مشرب ہوں ہم بے خرد و دانش مند
اس کا جلوہ ہے غضب آنکھوں کو کر دیتا ہے بند   ہوش اڑانے میں یہ ہے نکہتِ گیسو دو چند
کالے پانی کے مقید بھی رہا ہوتے ہیں
قید میں اس کے گرفتار فنا ہوتے ہیں

قہر ہے سحر ہے جادو ہے محبت اسکی — گو رجھواتی ہے انساں کو فرشتوں کو
ملک الموت زمانے میں ہے چاہت اسکی — داغ لالے کو لگا دیتی ہے محبت اسکی

ایسے محبوب ستمگار سے اللہ بچائے!
اس ستمگار دل آزار سے اللہ بچائے

بدمزاجی کا کرے کیا کوئی اسکے بیاں — زاہد خشک سے بھی سخت طبیعت میں سوا
اس سے بالا کہیں بڑھ جاؤ تو دیکھے دریا — خاک پانی میں ملا دے جو بنے اسکی ہوا

اختلاط اس کا جو عیاں گردش افلاک سے ہو
کرۂ آب مقابل کرۂ خاک سے ہو

گرمجوشی جو کرے خواب میں بھی سو جائے — ہے مثل لب عاشق پہ تبسم نہ لگے
وعدۂ وصل جو مل جائے تو عاشق ہو چلا — جان لیکر بھی نہ چھوڑے جو بگڑ جائے عتاب

اثر اپنا جو دکھاتی ہے خوشی انداز کو
پھول گلدستے کا بنا دیتی ہے گل فانوس کو

اے جمیل اس کی جفا کی شکایت بیجا — کیسے نادان ہو کیا کہتے ہو سوچو تو ذرا
کوئی معشوق ہے دشمن جو نہیں عاشق کا — چمن حسن میں بھی کبھی نہیں بوئے وفا

پھول ظاہر میں ہیں باطن میں مگر خار ہیں سب
جتنے معشوق ہیں دنیا میں دل آزار ہیں سب

اسی دور کے شعراء میں قاضی محمد صادق اختر کی نظم ہے ؎

قاضی محمد صادق خان اختر

کل بن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا — دکھلا کے سبز باغ ثواب و عقاب کا
کہنے لگا نہ راہ تغیر مجھے بتشر — معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا
پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
لیکن نہ کیجیے مجھے مورد عتاب کا

تقوی ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقیں آپ کے اس اجتناب کا

مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو مہوش ہو
کوئی وہاں مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ سوچ
یہ ریش جبہ جلوہ ہے پر عم غضب کا

کھینچے ہنسی ہنسی میں وہ منہ کو ملا کے منہ
دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا

منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو سہی
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو
گر مجھ کو بھی خوف کیجیے روز حساب کا

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

دور دوم کے شعراء میں مولوی علی میاں کامل نے کئی نظمیں کہیں جن میں مرزا دوست کی بہت مقبول ہوئیں۔

مزار دوست

شب کو جا نکلا تھا میں کامل مزار دوست پر
اس کی حسرت سے غم سے آنکھیں مری خونبار ہیں

قبر پر الحمد پڑھ کر دوست سے میں نے کہا
ہم گریباں چاک ماتم میں ترے اے یار ہیں

ڈھونڈتی ہیں تجھ کو آنکھیں جا بجا شام و سحر
شاہد اس دعوے کے رخ پہ آنسوؤں کے تار ہیں

شاد ہے کچھ تو بھی زیر خاک اے نازک بدن
شمع روشن ہے گلوں کے قبر پہ انبار ہیں

کیا ہوا مرنے کے بعد اے راہی ملک عدم
لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں

منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے
راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر میں بازار ہیں

جس محل میں جا کے تو اترا ہے اے رنگیں ادا
کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں

چھت ہے منقش کہ سادی فرش رنگیں یا سفید
تخت کیسے ہیں منبت یا مرصع کار ہیں

سبز جلتے ہیں کنول یا سرخ روشن ہیں گلاس
باغ ہے سبزہ ہے کچھ اشجار ہیں اثمار ہیں

پھول ہیں کس رنگ کے سبزے ہیں کس انداز کے — مرغ زریں بال ہیں یا عنبریں منقار ہیں
اہل صحبت کون ہیں کیا گفتگو کا ہے طریق — خوش بیاں خوش طبع ہیں یا کج فہم و بدگفتار ہیں
لوگ ہمسایہ میں ہیں کس قسم کے کس وضع کے — کچھ مروت آنکھ میں ہے خلق کے آثار ہیں
دعوتیں بھیجیں فقط یا آپ بھی آئے کبھی — اپنے اپنے شغل میں لپٹے ہیں یا بیکار ہیں
بات کرنے کی صدا اصلاً نہیں آتی کبھی — کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں
ملک کیسا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم — نہریں جاری ہیں چمن میں باغ ہیں گلزار ہیں
قافلے چلتے ہیں لٹنے کا تو اندیشہ نہیں — گرد کم اٹھتی ہے راہیں صاف ہیں ہموار ہیں
کچھ حسیں ان میں پری پیکر بھی نظر آئے کبھی — ان کے قد کیسے ہیں کیسے گیسوئے خمدار ہیں
شکلیں گوری گوری ہیں یا سانولی ہیں صورتیں — ابروئے خم کعبہ کی محراب یا تلوار ہیں
لکھنؤ کی ہیں ادائیں یا بنارس کے ہیں ناز — ہیکلیں سینوں پہ یا طوق کمر زنار ہیں
قبر سے آئی ندا اے دوست بس خاموش رہ — ہم اکیلے ہیں نہ یاں احباب نے اغیار ہیں
باغ کیسا پھول کیسے عقل ہے تیری کہاں — کنج تنہائی ہے اور افعی گلے کا ہار ہیں
وہ بہار پیکر نازک جو تجھ کو یاد ہو — آج خاک قبر سے اس پر منوں انبار ہیں
دو فرشتے آئے ہیں مدفن میں با شکل مہیب — اودے کالے کفنوں میں لئے گرز آتش بار ہیں
شق ہوا ان کا کلیجہ وہ صدائیں قبر کی — جوڑ ٹوٹے جوڑ سے سینہ و پہلو میں کہسار ہیں
قبر سے ہم کو بٹھایا ہے اٹھا کر قبر میں — رعب سے ان کے ہمارے دست و پا بیکار ہیں
لکھ گئے ہیں لاکھوں ہم لیکن نہیں کھلتی زباں — جسم میں رعشہ ہے تیر غم جگر کے پار ہیں

اب زیادہ بات کر سکتے نہیں لے تجھ کو حیا
دل میں اگر درد نہ ہوتا کیا کریں لاچار ہیں

دور سوم کے شعراء میں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے نظمی کامیاب نظمیں لکھی ہیں اور وہ بہت مشہور ہیں انگریزی نظم کا ترجمہ بھی

انہوں نے کیا ہے اور مثنویوں میں نظمیں بھی بہت کہی ہیں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں اس لئے ہم ان کو ترک کرتے ہیں۔

دور چہارم کے شعراء میں سب ہی نے نظمیں کہی ہیں پہلے چکبست کی نظم سنئے۔

سیر دیرہ دون

ہمیں بہار کا پہلے ہی ہوا تھا شگون
عجیب خطۂ دلکش ہے سیر دیرہ دون

نگاہ شوق نے کیا کہئے کیا سماں دیکھا
نئی زمیں نیا رنگ آسماں دیکھا

سنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فضا ہے یہی
اگر بہشت میں جنت تو راستہ ہے یہی

ازل میں تھی جو فضا اس کی یادگار ہے یہ
نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ

کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے
یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے

ہے سیر دابر کے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہے ہریالی

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا
بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں
پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آکے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انہیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں
یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا
یہ بل زمیں کی تیوری پہ آگیا کیسا!

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
نگہ کو دور سے پانی جو ہے نظر آتا!
قریب بیٹھا ہے آخر یہ دور کا عالم
فضائے کوہ میں ایسی ہو سمائی ہے
بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمہ دلگیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر
حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی
نشست سنگ پہ تھی سایہ شجر کے تلے
شریک حال تھی وضع قدیم قدرت کی
شراب حسن حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
درخت، کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے نغمہ کے ہیں
انھیں سے نغمۂ قدرت ہے روح دوستی میں
جدا کسی سے کبھی ہستی کا اپنی راز نہیں
ہے جسم خاک نہاں اس کا جسم پانی ہے
اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار
دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ادا سے

فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر
سفید ناگ چلا آرہا ہے بل کھاتا
نگاہ دیکھتی ہے پھر سر دور کا عالم
بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں سمایا ہے اسکا
ہوس تھی روح کو مل جائے اسمیں سے ہو کر
نگاہ شوق میں اک شان بے حجابی تھی
رواں تھا چشمہ اب خود کی نظر کے تلے
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشت غبار
ظہور کیا نہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں
سب ایک ساز کے پردے ہیں نرم ہستی میں
کچھ اشجار میں اور ہم میں امتیاز نہیں
جو روح ہم میں ہے ان میں وہی روانی ہے
کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اس پہ نثار
کہ اس فضا میں ہو آزاد روح انداں سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

مولانا صفی

دریائے گنگا کے کنارے شیعہ کانفرنس کا اجلاس

صبحِ بنارس

ہے لبِ دریائے گنگ اک بہار آئی ہوئی — کوثر آثار رحمت کی ہر سو چھاؤنی چھائی ہوئی
ہر طبیعت جس کے منظر پر ہے گھبرائی ہوئی — لب پہ اک موجِ تبسم آنکھ شرمائی ہوئی

ڈوب کر کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے گنگا جبہۂ مہ وش کا جو سما تدبیر ہے — خطِ قوسی میں سرِ جدول تما تحریر ہے
پُل ہلالِ عید گنگا صاف جوئے شیر ہے — یا بتوں کے ابروئے پیوستہ کی تصویر ہے

آسماں تھا فتنہ بازی میں جو مشہورِ جہاں
سر زمینِ حسن نے کھینچی ہے غمزہ کی کماں

ہے حصارِ عافیت کی پشتیاں اس پل کی نیو — سینہ تانے یا ہے مستِ خوابِ راحت کوئی دیو
پیکرِ کاشی پہ ہے کیا خوشنما زرّیں جنیو — ہے کہیں سر بر لبِ گنگا کہیں

سنیاسی سا ندر اندیں گھاٹ پر کی چوکیاں
آفتِ جاں دشمنِ جاں دین میں سب الا

ہے ہلالی خط میں آبادی بنارس کی تمام — گھاٹ مندر سب لبِ دریا بحسنِ انتظام
ناؤ پر چڑھ کر انہیں دیکھو جو نامی ہیں مقام — ماہ رویوں کا ملے گا ہر جگہ پر اژدحام

صدقے اپنی گل زمیں پر ہو گلستاں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار

چشمِ بد دور رات بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے — ہر ادا مہوش حسینوں کی بیاں کی قہر ہے
عزتِ کشمیر ہے یہ انتخابِ دہر ہے — ہر گلی کوچے میں جاری حسن کی اک نہر ہے

صاف ہیں، شفاف ہیں کتنے یہاں کے بتکدے
رہتے ہیں ہر دم دلہن کی طرح پھولوں سے لدے

وہ دھندلکا صبح کا وہ رنگ گنگا پاٹ کا   وہ جھمکنا دور سے نمایاں جا بجا پانی کی کاٹ
وہ پری زادوں کے جھمگھٹ سے پرستاں راج گھاٹ   دل بدل جائے جو انساں کی طبیعت ہو اچاٹ

اتریں پانی میں ہر دم صبح کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھ لو آبِ رواں میں حسنِ دلکش کی بہار   صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلفِ تابدار   بال کا باندھا چلا آتا ہے جس میں خود شکار

جھوم کے اٹھی جہاں گنگھور متوالی گھٹا !
دیکھنا برسائے گی موتی سی یہ کالی گھٹا

جس کا شیوہ ہے اسی پردہ میں ٹھنڈی گرمیاں   کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
ضو فشاں سورج ہے لیکن ہٹ گیا بادل جہاں   خود کہے گی طاقتِ نظارہ ہو کیا امتحاں

جامہ زیبی سے دو بالا شان محبوبی ہوئی
ساریاں قوسِ قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

زعفرانی ہے کسی ماتھے پہ ٹیکا صندلی   دل سہی نازک تڑپئے ہاتھوں میں اگر گنگا جلی
لب بلوں موجِ تبسم جیسے کھلتی ہو کلی   دل جہاں پھسلا تو توبہ سے نکلا یا علی

جب لڑیں باہم نگاہیں کافر و دیندار کی
کان میں آئی صدا یا توبس استغفار کی

ہے غدیرِ خم کے متوالوں کا گنگا پر جماؤ   محتسب کا زور جن پر کچھ نہ قاضی کا دباؤ
دھن یہی کوثر سے کاٹو نہر گنگا میں گراؤ   حشر تک آئے نہ ہوش اتنی سو اتنی پلاؤ

جھومتے نکلو بنارس میں جدھر بھی سیر کو
چھیڑ کر کلمہ پڑھاؤ ان بتاں دل کو

لکھنؤ کی ایک برسات

گھر کی رہنے والیوں کو زندگانی تھی عذاب　　　گھر سے جب نکلیں ردائیں اوڑھ کر مثلِ حباب
سر پہ بارش گود میں بچے کمر تک جوئے آب　　　پاؤں بالائے زمیں ورد زباں یا بوتراب
کس قدر پانی کہاں ہے کچھ پتا چلتا نہیں
قسمتوں کا پھیر دیکھو راستہ ملتا نہیں

مولانا صفی نے ایک قومی ترانہ بھی کہا ہے جو بڑا زوردار ہے اس کے بعض اشعار دوسروں کے نام سے مشہور ہیں اس لئے ہم اس نظم کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اسلامی ترانہ

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے　　　مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں　　　بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ　　　شعلے بھڑک اٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن　　　وقت آنے دو وقت آنے پھر تم کو بتا دیں گے
دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی　　　دیکھو جو ہمیں رد کا طوفان اٹھا دیں گے
ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو مٹا دیکھیں　　　کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے　　　اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں　　　یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے
آئے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہوگا　　　یہ نظم صفی پڑھ کر ہم اس کو سنا دیں گے

برسات کی شام !

شوق قدوائی

دن ہے کم دیکھو ہٹا مغرب سے وہ ابر سیاہ !
کھل گئی دنیا میں آنے کیلئے کرنوں کی راہ

بن گیا خورشید ہلکے رنگ کے سونے کا طشت
دھوپ سے کچھ کچھ سنہرے ہو گئے اشجار دشت

وہ شفق کی سرخ رنگت اور فلک کا مرغزار
ساونی پھولی ہوئی گویا دکھاتی ہے بہار

کوہ کے دامن میں یا لالے کا تختہ ہے عیاں
یا جسے کہتے ہیں چرخ اک کوہ ہے آتش فشاں

جلوہ گر ہے چرخ پر سورج کے پرتو سے دھنک
یا اوڑا ہے وہ کھلی محراب ایوانِ فلک

یا کسی کے واسطے کھولے ہے آغوش آسماں
یا لئے ہے دوش پر ترکِ فلک اپنی کماں

دستکاری اپنی کی معمارِ قدرت نے عیاں
سات رنگوں سے رنگا لا ہے طاقِ قصرِ آسماں

فوارہ

عزیز لکھنوی

میرے فوارے عجب دلچسپ ہے تیرا سماں
یہ تری طبع رواں اور یہ ترا جوشِ نہاں

رات دن سانچے میں وہ موتی پہ موتی ڈھالنا
ہو شانِ باغِ رضواں پر وہ دُرّے ڈالنا

گوہر افشانی تری اور ہلکی ہلکی وہ پھوار
وہ شباب بلبل و گل اور وہ تیرا نکھار

وہ اکڑ کر دیکھنا اپنی جوانی کی بہار
وہ ترا انگڑائیاں لینا چمن میں بار بار

مضطرب موجِ ہوا پر تو بہت بیتاب ہے
تیری دھاریں جھومتی ہیں یا کہ نخلِ آب ہے

تو چمن کی لاج ہے اور ہے فضا میں تیرا دور
اک بہار شادمانی ہے ہوا میں تیرا دور

طائر آتے ہیں ترے دامن میں پر کھولے ہوئے
عاشقِ شوریدہ سر بیٹھے ہیں سر کھولے ہوئے

تیرے دستِ گوہر افشاں کی یہ حالت دیکھ کر
جھولیاں گلشن نے پھیلا دیں سخاوت دیکھ کر

گوندھنا موجِ ہوا پر موتیوں کے ہار کا
تیرے سر سہرا رہا ہے رونقِ گلزار کا

تیز ہو ہاں میرے فوارے ذرا پھر تیز ہو
پھر جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز ہو

آتشِ گل کا بیاں کچھ بھی اشارا ہو گیا
اُڑ گیا موجِ ہوا پر یوں کہ پارا ہو گیا

تیرا جو قطرہ گیا گردوں پہ تارا ہو گیا
جب گرا آ کر زمیں پر دل ہمارا ہو گیا

سب غبارِ خاطرِ ناشاد تجھ سے دھل گیا
تیرا منظر اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا

مرزا جعفر علی خاں اثر کی ایک نظم کشمیر پر ہے جس کا یہ ایک شعر مجھے یاد ہے۔ پوری نظم مل نہ سکی اس لیے ایک ہی شعر پر اکتفا کیجیے ؎

اُڑتا ہوا غول تتلیوں کا
یا قوس قزح سے رنگ برسا

آخر میں جوش صاحب کی نظم پر کھاوت ملاحظہ کیجیے دنیا کی کسی زبان میں اس کا جواب نہیں جن ملکوں میں بارش نہیں ہوتی ان سے تو اس کی توقع ہی بیکار ہے ہاں برصغیر برسات کی جولانگاہ خاص طور پر جہاں بحر عرب اور خلیج بنگال دونوں اُڈا اُڈا کے برستے ہیں اور ساری زمین ہری ہو جاتی ہے وہیں برسات پر نظموں کی اُمید کی جا سکتی ہے اور وہی سرزمین علم و فضل اور شعر و سخن کی سرزمین ہے مگر تعجب ہے کہ ہندی اور سنسکرت میں بھی ایسی کوئی نظم نہیں معلوم ہوتی جس کو جوش صاحب کی نظم کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا۔

فارسی کے شعراء جو ہندوستان آئے انھوں نے برسات پر نظمیں کہی ہیں مگر جوش کا سا خروش کہاں، اُردو میں آزاد و حالی کی برکھا رت نے تو شاعری کا منہ چڑھایا ہے بعض بے عقل اور سخن ناشناس جوش صاحب کو الفاظ کا بازی گر کہتے ہیں جی تو یہی چاہتا ہے کہ پہلے اس پر بحث کی جائے کہ الفاظ بازی گر کے کیا معنی ہیں اور جوش کی شاعری

پر یہ قول منطبق ہوتا ہے یا نہیں بہر حال اب جوش صاحب کی نظم سنئے افسوس کہ اس نظم پر جوش صاحب نے نظر ثانی کر کے کچھ کا کچھ کر دیا میں نے کئی دفعہ وہ نظم مانگی مگر وہ تو شاہی مزاج رکھتے ہیں۔ مختصر یہ وہ نظر ثانی شدہ نظم نہ بھیج سکے اس لئے وہ نظم پیش کرتا ہوں۔

آہا آہا برکھا آئی

بدلی آئی بدلی آئی !! بدلی آئی بدلی چھائی
بدلی چھائی اور لہرائی جھر جھر برسی گھڑ گھڑ گائی

آہا آہا برکھا آئی

میلے ریلے تال کنارے بوڑھے بچے لت پت سارے
دھوم دھڑکا نعرہ نعرے چڑھتے دریا بڑھتے دھارے

گرتی بوندیں چھٹتی کائی

بادل کالے نیلے دھانی ساری دھرتی ہے جل رانی
پانی پانی پانی پانی ! گلیاں کوچے کھیت اور گھاٹی

آہا آہا برکھا آئی

پانی آیا چھم چھم چھم چھم ! کالے جھنڈے نیلے پرچم
پریاں اتریں چھم چھم چھم چھم چھم چھم بولی بالم بالم

پانی کا اک شاہ گدا ہے

اڑتے مڑتے بوجھل گالے اودے اودے کالے کالے
ہا ہا کرتے ندی نالے تڑ تڑ تڑ تڑ سب پر نالے

سن سن سن سن سی پروائی

پتے چھوٹے بن لہرائے پربت بولے پنچھی گائے

مچلے بادل ناچ سمائے　　راتیں ڈوبیں دن کجلائے
نالے بھر کے ندی گائی

کریں لچکیں شوخی دمکی　　مدرا چھلکی بوتل چھنکی
طبلہ کھٹکا چھاتی کمکی　　ادہو ادہو بجلی چمکی
جیسے جنگل کی انگڑائی

دل میں کہیں بوٹے کی کونپل　　ندی نالے سارے جل تھل
گھونگھرے جیسے چھل چھل　　تان اڑاتی جنگل جنگل
کیا آئے بھونرے کی بھونرائی

بھرنے نکلی گھر سے چھوری　　گال اچھوتے باہیں گوری
آنکھیں اٹھتیں جیسی چوری　　آگے آگے الھڑ گوری
پیچھے پیچھے جا ترم دانی

بیٹھا کیوں ہے سر کھجلاتا!　　اٹھ اور سر پہ لیکم چھاتا
تان اڑاتا بین بجاتا　　ہنستا گاتا شور مچاتا
مدرا پیئے چل رے بھائی

سینہ ابھارے ندی ندی　　بازو کھولے پنچھی پنچھی
دور تلک ہے پانی پانی　　در در آئی جمنا دیوی
گھر گھر پہنچی گنگا مائی

پانی مرتا دیواروں میں　　گھٹنوں گھٹنوں بازاروں میں
گرجا چکراتا غاروں میں　　اور منہ کے اڑتے تاروں میں
لیا ڈگی پاتا پائی

جوبن ابھرا ہر جیون میں　　ساون گونجا سب کے تن میں

رادھا ناچین اُلھڑ پن میں ! مدرا چھلکی گوکل بن میں !!
شیام نے کیسی بین بجائی

طبلہ سارنگی اکتارا نوبت بین نقارا !
ڈھولک ڈفلی جھانجھ مجیرا گونج دادرو مور پپیہا
دائرہ پر لبطے نے شہنائی

سن کر اپنے پی کی آون بولی بدھی لاڈے مالن
مہندی بیسی زن زن زن چوڑیاں بولیں کھن کھن
اتنی کا نپی لوگ ماتی

سر کی لہریں لے کے دھارے گوری دھری لاج کے مارے
ٹوٹا جیسے ٹوٹیں تارے سا رے گا ما گا ما سا رے
پائل جھنکی مستی چھائی

مدرا پی کر گانا گایا من میں کالا بادل چھایا
ہلکا ہلکا مرجھایا سایہ دیپک دیپک بھایا
تا دھم دھمکا دھن چکرائی

جلدی سکھیو لاؤ جھومر ہلکی چھاگل بھاری چادر
دوڑو آیا پانی سر پہ اے دیکھو وہ ڈولی نیلم
بیت نگر سے آیا نانی

چھلیں من میں لے کی دھاریں اڑی ترچھی آئیں پھواریں
ناچیں چھم چھم گوری ناریں تار پکارے ازیں ازیں
دھرتی بھیلی رت بولائی

رشم رشم پانی ہوں ہوں جھکڑ چھپر ٹپ ٹپ نالے دھر دھر
بدلی گھم گھم بجلی کڑ کڑ چھیم چھیم تر در تر در
دھرتی بولی رام دہائی

ہجو

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ناسخ نے ہجو کی جڑ کاٹ دی اور ان کے تمام مصنفین نے اپنی کتابوں میں یہی لکھا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔

مولانا آزاد سے یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی نظر میں ضاحک و سودا کی ہجویں تھیں جن میں بھڑوے اور دھی کے.... تک موجود ہے۔

اسی طرح کی مصحفی و انشا کی ہجویں ہیں لکھنؤ کی تہذیب اس کو برداشت نہیں کر سکتی وہاں کی ہجو میں شاعرانہ لطافت کے ساتھ تہذیب و شائستگی ہے۔

لکھنؤ میں ہجو میر ضمیر سے شروع ہوئی وہ نو ربیع الاوّل عمر و سودا کی ہجو پڑھتے اور اس کا نام انھوں نے ہرشیہ رکھا۔

افسوس ہے کہ وہ ہجویں مجھے نہیں ملیں۔

ناسخ و آتش کے زمانہ میں بھی ہجو کہی گئی امام بخش ناسخ نے اپنے نام کی مناسبت ایک غزل میں یہ مقطع کہا ہے

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں!

شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں !!

آتش نے وہیں اس کا جواب کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں !
ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں !

ناسخ کے شاگرد خواجہ وزیر نے اس کے جواب میں کہا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

یہ ایک سلسلہ ہے جو اب تک چلا آرہا ہے ہمارے زمانہ میں خوب خوب ہجو بن گئیں ان کا لطف زیادہ ہو جاتا اگر ان اشخاص کے نام لکھدیئے جاتے جن کی ہجو کی گئی مگر یہ بات بہت سے افراد کو ناگوار ہوتی اس لیے بغیر کسی کا نام بتائے ہوئے ہجو بن سنئے اور خود ان اشخاص پہ منطبق کیجئے یہ نظمیں شیعہ کانفرنس سے ارکان سے متعلق ہیں۔

مقبول حسین ظریف

دفتر قومی پریشاں ہو تو اسکی قدر کیا
ہے جو فاضل الیبین نتھی افراد قوم

اس جگہ ہر مداوا جمع ہیں قومی طبیب
جو فقط لیمو لگا کر میں کھجائے داد قوم

قوم کا ہیرو بیا بھی ہے نمائش گاہ میں
باٹ اس کا بہر تفریح دل ناشاد قوم

سر پہ دستار فضیلت پانو میں ڈاسن کا بوٹ
نیچے جنٹلمین اوپر صورت زہاد قوم

دین کا دلال آدھا اہلِ دُنیا کا ایجنٹ — مولوی بھی ماسٹر بھی واہ اے استادِ قوم

کعبہ کالج کی جانب توڑ کر اپنی نکیل — بلبلاتا آرہا ہے اشترِ بغداد قوم

ایک قومی تیندوا بھی اس کٹہرے میں ہے بند — جس کا رمنہ ترائی مزرعِ آبادِ قوم

قومی اک بھالو علی بابا جسے کہتے ہیں لوگ — وہ گرو چالیس قزاقوں کا اور استادِ قوم

قومی اک بندر بھی اس ندوہ عجائب گھر میں ہے — جو کہ ناداں دوست ہے کہتا ہے گو املا قوم

ہے اسی جلسہ میں قومی ایک خرگوش سفید — گھونس بن کر کھودتا رہتا ہے جو بنیادِ قوم

ابنائے وطن

سپوتو! مادرِ ہندوستان کے واہ کیا کہنا
نہ وضع خاندانی ہے نہ مذہب ہے نہ ملّت ہے
سیہ چہرے پہ ہلٹ یا کہ گوبر پہ گلگمتّا
فقط اغیار کی تقلید میں اب تو یہ صورت ہے
تمازت سے سیاہی اور چہرے کی نہ بڑھ جائے
کہیں کالے نہ کہلائیں فقط اس کی حفاظت ہے
یہاں تک رفتہ رفتہ بڑھ گیا ہے خبط فیشن کا
نہ ڈاڑھی کی بزرگی ہے نہ کچھ مونچھوں کی عظمت ہے
جو اک ٹیکا لگائے مونچھ کا ہیں ناک کے نیچے
مرید حضرت ہیوٹ ہیں فیشن سے عقیدت ہے

البعیر

ناقۂ لیلیٰ کے بچے اے بعیر ذی وقار — قوم تیرے استعداد کی دم پہ نثار
تیرے چہرے سے نمایاں اک شرارت کی شبیہ — خود بنائی جس کا شکوہ سرکشی جس کا شعار
تیری آنکھیں بحر عیاری کے گویا دو حباب — کان جن میں کلمۂ حق کی صدائیں ناگوار
ہم صیانی سے زیادہ تیرے کھونٹے کی گرفت — پنجۂ دست قضا کے مثل وقت گیر و دار
دانت تیرے تیز تر ہیں تو ذہن سے بڑھ کر ستمگر — ناک میں تیری دم کھانے کو شریعت کی مہار
کیا دولتی جھاڑتا ہے مظلوموں کو لادکر — فطرتاً تو سرکش ہے تو لیکن بظاہر بردبار
اپنی گردن پیٹھ پر لادے ہوئے قومی حقوق — کتنے اطمینان سے چلتا ہے تو مستانہ وار
زینت گردن ترے کل قوم کی لعنت کا طوق — اس سے ظاہر ہے کہ تو نے کھو دیا سب اعتبار
دیکھنے میں کس قدر سیدھا ہے تو اے نردار — کج روی سیکھا ہے تجھ سے اہل لیل و نہار
قوم کو باہم لڑا ہیں تیری ذات فرد — میرے قومی اونٹ اے جنگ جمل کی یادگار
پیٹ تیرا قوم کی گاڑھی کمائی کے لئے — وقف ہے کھا کر نہیں لیتا کبھی تو اک ڈکار
تو جواہر وہ کاکاٹا بے تکلف چر گیا — قعر معدہ میں چھپا تیرے وہی انجام کار
بلبلاتا ہے شتر خانے میں بیٹھا کیا بیٹھ — گرد تیرے جمع بیسوں ساربان غمگسار
کوئی آیا ہے سہارنپور سے لیکر دوا — تیل رینڈی کا پلانے منہ کے اندر دے کے نار
اور کوئی خاک شفا تجھ کو چٹانے کے لئے — چپکے چپکے پڑھ رہا ہے کچھ دعائیں بار بار
کوئی حاجی نیم کی ٹہنی ہلا کر دور سے — کہہ رہا ہے کچھ ابھی جا ذکر اے بد اشعار
اور کوئی پنجاب سے آیا ہے گھبرایا ہوا — مال حرز اپنا معو ابر کمنے نثار
کوئی کہتا ہے کہ اس کو ذبح کرنا چاہئے — عید قرباں کو حسین آباد میں لیجا کے یار